احوالِ واقعی

پردۂ چشم اٹھا، دیدۂ تحقیق سے دیکھ

مجھی پہ اتنی توجہ، مجھی سے اتنا گریز

شاعران کی دوستی کا اب بھی دم بھرتے ہیں آپ

اس حادثۂ وقت کو کیا نام دیا جائے

مرزا سلیم بیگ

احوال واقعی

مرزا سلیم بیگ

(شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی)

مکتبہ نئی قدریں

حیدر آباد (پاکستان)

اشاعت اول - ۱۹۹۴ء
کمپوزیشن - کمپیکٹ سروسز - ۱۱۴، بمبئی ہوٹل - کراچی
طباعت احمد برادرس کراچی
قیمت

(ناشر)
مکتبہ نئی قدریں
۴۱۴- سی - یونٹ نمبر ۱۰- لطیف آباد
حیدر آباد (سندھ)
فون نمبر (۸۵۹۲۹)

اہل نظر کے نام

خود پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے
آہ کس دن کے لئے ناحق پرستی کیجئے

یگانہ چنگیزی

ترتیب

۱۔ احوال واقعی ---------- مرزا سلیم بیگ	۹
۲۔ شاعر مرحوم کا پیغام (اپنے محسنوں کے نام) حمایت علی شاعر	۲۲
۳۔ ابن مریم کا خط	۲۳
۴۔ ساجد امجد کا وضاحتی خط	۲۶
۵۔ حمایت علی شاعر کا خط	۲۸
۶۔ آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے۔ حمایت علی شاعر	۳۱
۷۔ (باقیات قابل)	۷۶
۸۔ زرد صحافت (تراشے)	۷۷
۹۔ محسن بھوپالی کا پہلا خط	۷۸
۱۰۔ محسن بھوپالی کا دوسرا خط	۸۲
۱۱۔ ریکارڈ درست رکھنے کی خاطر (تاریخی حوالے اور تجزیئے)	۹۷
۱۲۔ ایک مراسلہ۔ محمد فاضل ذکریا	۱۰۰
۱۳۔ یادگار گروپ فوٹو۔ مشاعرہ جام شورو (۱۹۶۱ء)	۱۰۳
۱۴۔ پندرہ روز ''رہنما'' کا ضمیمہ (مشاعرے کی رپورٹ)	۱۰۵
۱۵۔ پردہ چشم اٹھا' دیدہ تحقیق سے دیکھ ---- محمد عالم ذکریا	۱۰۶
۱۶۔ چند یادیں ----- محسن بھوپالی	۱۲۴
۱۷۔ قابل' محسن اور --------- سید کاظم رضا	۱۲۷
۱۸۔ بیگم قابل اجمیری (انٹرویو) توصیف چغتائی	۱۳۱
۱۹۔ کلیات قابل کا ابتدائیہ۔ شہزاد احمد	۱۳۶

۲۰۔ پس منظر (تاریخی حوالے اور تجزیہ) ۱۳۷
۲۱۔ شکست شب (تبصرہ) حمایت علی شاعر ۱۴۰
۲۲۔ ۱۹۶۲ء کا بہترین نغمہ (گفتگو) بشیر نیاز اور حمایت علی شاعر ۱۴۶
۲۳۔ ایک خط۔ ایک بحث۔ سلیم (صدیقی) ۱۵۰
۲۴۔ سلیم کے جواب میں۔ حمایت علی شاعر ۱۵۲
۲۵۔ سیر کے واسطے تھوڑی فضا اور سہی۔ حمایت علی شاعر ۱۵۶
۲۶۔ حمایت علی شاعر کے نام کھلا خط۔ چودھری اقبال احمد ۱۷۲
۲۷۔ کوچہ طفلاں۔ حمایت علی شاعر ۱۷۶
۲۸۔ ایک مراسلہ (ایوارڈ یافتہ نغمے کے بارے میں) محسن بھوپالی ۱۸۳
۲۹۔ پہلا پتھر۔ حمایت علی شاعر ۱۸۷
۳۰۔ واویلا (ایک نظم) حمایت علی شاعر ۱۹۵
۳۱۔ اور بھی غم ہیں (صدارتی ایوارڈ یافتہ فلم کا نغمہ) حمایت علی شاعر ۱۹۷
۳۲۔ شعری ادب میں تجربے (حوالے۔ تراشے) ۱۹۹
۳۳۔ ثلیث۔ اثر فاروقی ۲۰۳
۳۴۔ بنتی گئی کہانی۔ (ڈرامے کی تاریخ میں انوکھا تجربہ) ۲۰۷
۳۵۔ ایک مراسلہ (ثلیث کے بارے میں) محسن بھوپالی ۲۰۸
۳۶۔ ثلیث یا ثلاثی۔ حمایت علی شاعر ۲۱۰
۳۷۔ ثلاثی۔ (اہل قلم کے اقتباسات) نیاز فتح پوری' اثر لکھنوی' ۲۱۳
احمد ندیم قاسمی' ڈاکٹر سید عبداللہ اور مرزا ادیب
۳۸۔ شعور (سرورق کے عکس) ۲۱۶
۳۹۔ آگ میں پھول (تبصرہ) شمیم احمد ۲۱۸
۴۰۔ ایک خط (اختر انصاری کے نام) سلطان جمیل نسیم ۲۲۲
۴۱۔ ایک خط (حمایت علی شاعر کے نام) سلطان جمیل نسیم ۲۲۷
۴۲۔ میرا گلیمر۔ میرا شاعر۔ مشہود انور ۲۲۹
۴۳۔ نذر شاعر (ایک نظم) احمد رئیس (اجمیری) ۲۳۴
۴۴۔ کچھ یادیں۔ کچھ باتیں۔ محسن بھوپالی ۲۳۵
۴۵۔ ہارون کی آواز۔ ڈاکٹر ساجد امجد ۲۴۰

۴۶۔ ارژنگ-(تاریخی حوالے) ۲۴۲

۴۷۔ بنگال سے کوریا تک-(اشاعتی حوالے) ۲۴۳

۴۸۔ برگ گل (کراچی) اور شاہراہ (دہلی) کے عکس ۲۴۵

۴۹۔ پرچھائیاں کا پیش لفظ---- ساحر لدھیانوی ۲۴۷

۵۰۔ حمایت علی شاعر کے نام (ایک خط) ڈاکٹر وزیر آغا ۲۴۸

۵۱۔ چند اقتباسات-(سید سبط حسن-ڈاکٹر مغنی تبسم-ڈاکٹر شکیل الرحمٰن) ۲۵۲

۵۲۔ سرشار صدیقی کے دو کالم (روزنامہ حریت) ۲۵۵

۵۳۔ باتونی-(نکہت بریلوی) کے چار کالم (روزنامہ-کلیم) ۲۵۸

۵۴۔ ایک کھلا خط-(باتونی اور حمایت علی شاعر کے نام) محسن بھوپالی ۲۶۷

۵۵۔ مثلث کا تیسرا زاویہ-حمایت علی شاعر ۲۷۲

۵۶۔ خامہ بگوش (مشفق خواجہ) کے دو کالم-(ہفتہ وار-تکبیر) ۲۷۸

۵۷۔ آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم- (کچھ نایاب تحریریں) ۲۸۹

۵۸۔ رو میں ہے رخش عمر (Bio Data) حمایت علی شاعر ۲۹۵

۵۹۔ کتابیات ۲۹۹

منظور ہے گزارش احوال واقعی

(غالب)

احوالِ واقعی

غالباً ۸۳ء کی بات ہے۔ ہم چند طلباء نے حمایت علی شاعر صاحب سے اصرار کیا تھا کہ وہ اپنے ان تمام جوابی مضامین اور خطوط کو کتابی شکل میں شائع کردیں جو متنازعہ ادبی مسائل اور شخصی اختلافات سے متعلق ہیں اور گزشتہ ۲۵ سال سے مختلف ادبی رسائل اور اخبارات میں بکھرے پڑے ہیں۔

وجہ یہ تھی کہ اسی سال شمیم احمد کی کتاب "برش قلم" شائع ہوئی تھی اور اس میں "باب زرد" کے تحت ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید وغیرہ۔ اور "باب سرخ" کے تحت احمد ندیم قاسمی، پروفیسر ممتاز حسین، سبط حسن، صہبا لکھنوی، شہزاد منظر، انور خواجہ اور پروفیسر عتیق احمد کے ساتھ حمایت علی شاعر کے خلاف بھی ایک ایسا غیر مہذب مضمون شائع ہوا تھا جو بقول ان کے ۶۳ء کا تحریر کردہ تھا اور اس کتاب کا واحد غیر مطبوعہ مضمون تھا۔ انہی دنوں یعنی ۲۰ مئی ۸۳ء کو جب "برش قلم" کے اقتباسات جماعت اسلامی کے ترجمان روزنامہ "جسارت" (کراچی) کے ادبی صفحات پر شائع کیے گئے تو حمایت صاحب نے بھی آواز اٹھائی اور جوابی مضمون کے طور پر "جسارت" ہی میں شمیم احمد کا نفسیاتی تجزیہ کر ڈالا جو ۱۰ جون ۸۳ء کو شائع ہوا۔ شمیم احمد جھلا اٹھے اور مذکورہ اخبار میں ۲۴ جون ۸۳ء کو حمایت علی شاعر کے خلاف ایک طویل خط نما مضمون چھپوایا، جس میں بے شمار "ناشائستہ اور رکیک الفاظ" استعمال کیے گئے تھے۔۔۔

شمیم احمد کے تہذیب سے گرے ہوئے انداز تحریر اور بے بنیاد الزامات کے خلاف چوں

کہ قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی جاچکی تھی اور مشہور ترقی پسند شاعر اور وکیل حسن حمیدی نے متعلقہ حضرات کو غالباً ہتک عزت کا نوٹس بھی بھجوا دیا تھا' اس لیے مدیر "جسارت" نے "مخصوص الفاظ" نکال کر ان کی جگہ نقطے لگا دیئے۔ بقول خامہ بگوش (مشفق خواجہ):

"نظیر اکبر آبادی کے دیوان کی طرح شمیم صاحب کے مراسلے میں متعدد مقامات پر آپ کو نقطے نظر آئیں گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ بعض الفاظ یا اسمائے صفات ہم سے "پڑھے" نہیں جاسکے' مجبوراً انہیں حذف کرنا پڑا اور نکتہ سنجی سے کام لینا پڑا۔" ("جسارت" ۲۴ر جون ۸۳ء)

شمیم احمد کی ان تحریروں کو ادبی حلقوں میں کس نگاہ سے دیکھا جاتا تھا! اس کا ذکر اس لیے مناسب نہیں ہے کہ اب ان کا انتقال ہوچکا ہے۔ (خدا ان کی مغفرت کرے) اس دوران قمر جمیل نے بھی بقول ان کے "برش قلم" سے "گمراہ ہو کر" اور بعض افراد کے اکسانے پر "نوائے وقت" (کراچی) میں حمایت علی شاعر کے خلاف اپنے "ادبی کالم" میں کچھ پیراگراف لکھ دیئے تھے (مطبوعہ ۲۲ر اپریل ۸۳ء) مگر جب اسی اخبار میں ۲۴ر جون ۸۳ء کو حمایت صاحب کا جوابی مضمون (اپنے مطبوعہ کلام کے تاریخی حوالوں کے ساتھ) شائع ہوا تو نہ صرف قمر جمیل صاحب نے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا بلکہ حمایت صاحب سے معافی بھی مانگ لی۔ شمیم احمد بھی خاموش ہو کر بیٹھ گئے اور سلیم احمد کی خاطر' حمایت علی شاعر نے شمیم احمد کو معاف بھی کردیا۔ (بحوالہ روزنامہ "حریت" ۱۹ر اگست ۸۳ء اور روزنامہ "کلیم" سکھر' ۲۶ر اگست ۸۳ء)

ابھی یہ غبار بیٹھا ہی تھا کہ ایک دن یکایک محسن بھوپالی صاحب نے (بقول ان کے) "ڈنکے کی چوٹ" پر یہ اعلان کیا کہ حمایت علی شاعر کے خلاف سب سے پہلے لکھنے کا اعزاز انہیں حاصل ہے۔ اور یہ کہ شمیم احمد اور قمر جمیل نے جو الزامات عائد کیے وہ سب سے پہلے محسن صاحب نے لگائے تھے وغیرہ وغیرہ (بحوالہ روزنامہ "جسارت" ۲۶ر اگست ۸۳ء' روزنامہ "کلیم" سکھر ۲ر ستمبر ۸۳ء اور روزنامہ "حریت" ۲۳ر ستمبر ۸۳ء)

شمیم احمد کے مضامین میں محسن بھوپالی کے حوالوں اور بعض اخبارات مثلاً "حریت"

اور ''مشرق'' کے ادبی کالموں کے بین السطور اشاروں سے یہ گمان تو ہو رہا تھا کہ ۔

کون معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

مگر چوں کہ شمیم احمد، سلیم احمد اور قمر جمیل۔ تینوں عموماً ترقی پسند ادب کے خلاف لکھتے رہتے تھے، اور محسن صاحب کا شمار ترقی پسند شعراء میں ہوتا تھا، اس لیے لوگوں کا ذہن ان کی طرف نہیں گیا۔ مگر اس انکشاف کے بعد سوچنا پڑا کہ ''ڈنکے کی چوٹ'' پر وہ حمایت صاحب کے مخالف اور در پردہ شمیم احمد کے دوست کیوں بن گئے؟

ظاہر ہے کہ اس مخالفت کا سبب وہی ایک مختصر سا مضمون تھا جو محسن صاحب کے پہلے مجموعہ کلام ''شکست شب'' کی تقریب رونمائی (نومبر ۶۱ء) کے لیے حمایت صاحب نے لکھا تھا، اور جس میں زبان کی دو تین غلطیوں کی نشاندہی بھی کر دی تھی۔

اس کے بعد محسن صاحب نے حمایت صاحب کی مخالفت پر کمر باندھ لی ـــــ مگر تحریری طور پر پہلی بار ان کا ایک مراسلہ فلمی ہفتہ وار ''کردار'' بابت ۱۲ر ستمبر ۶۳ء کو شائع ہوا جو حمایت صاحب کے ایوارڈ یافتہ نغمے ''کسی چمن میں رہو تم، بہار بن کے رہو'' کے خلاف تھا۔ (حمایت صاحب نے اس وقت اس کا کوئی جواب نہیں دیا تھا)

فلمی ہفتہ وار ''نگار'' اور ''کردار'' میں تقریباً تین ماہ تک (اگست تا اکتوبر ۶۳ء) حمایت صاحب کی مخالفت اور موافقت میں مراسلے چھپتے رہے۔ محسن صاحب نے ماہنامہ ''الشجاع'' (کراچی) میں ''ثلاثی'' کے خلاف بھی ایک خط لکھا اور وقفے وقفے سے کسی نہ کسی بہانے اور طریقے سے ان کی مخالفت میں مصروف رہے۔ مجبوراً حمایت صاحب نے بھی چند ایک خطوط کے جوابات دیئے۔ اصلی اور فرضی ناموں سے لکھے ہوئے کچھ متنازعہ خطوط اور ان کے جوابات اس کتاب میں شامل کر دیئے گئے ہیں تاکہ لکھنے والوں کے مزاج اور طرز تحریر کا اندازہ ہو جائے۔

شمیم احمد اور قمر جمیل ہوں کہ محسن بھوپالی ـــــ حمایت صاحب کی مخالفت میں تینوں کی تحریروں میں ایک خاص بات مشترک نظر آتی ہے۔

''ایک جھوٹ کو اتنی بار دہراؤ کہ اس پر سچ کا گمان ہونے لگے۔''

ایسا لگتا ہے کہ ان حضرات نے اس مقولے پر ایک منصوبے کے تحت عمل کیا تھا۔

فلمی دنیا کو خیرباد کہنے کے بعد حمایت صاحب جب سندھ یونیورسٹی میں پڑھانے لگے (غالباً ۷۷ء کے اواخر میں) تو حیدر آباد (سندھ) کی ادبی فضا میں پھر ایک لہر آگئی۔ تدریس کے ساتھ ساتھ انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ شعبہ اردو کا مجلّہ "صریر نامہ" کا "اقبال نمبر" مرتب کیا جو اپنی بعض خصوصیات کی بناء پر انفرادی اہمیت رکھتا ہے۔ پھر ۷۸ء میں انہوں نے اسی مجلّہ کا "نعت نمبر" مرتب کیا جس میں ان کا مقالہ "اردو نعتیہ شاعری کے سات سو سال" کے ساتھ، ان ہی کی منتخب کردہ سات سو برس کی نعتوں کا انتخاب بھی شعراء کی مختصر سوانح حیات کے ساتھ شامل ہے۔ ۷۹ء میں انہوں نے ایک اور بڑا کام کیا۔ اور وہ یہ کہ جدید سندھی ادب کے منفرد شاعر شیخ ایاز کے منتخب کلام کے منظوم اردو ترجمے "حلقہ مری زنجیر کا" (مترجمہ فہمیدہ ریاض) پر ایک طویل مقدمہ لکھا جو ایاز صاحب کی شخصیت اور شاعری کا تجزیہ بھی ہے اور محاکمہ بھی۔ (مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی، جام شورو) پھر اسی سال یہ مقدمہ شیخ ایاز کے منتخب اردو کلام اور مختلف اہل قلم کے منتخب تراجم کے ساتھ ایک الگ کتاب کی صورت میں "شیخ ایاز (شخص اور شاعر)" کے نام سے پروفیسر آفاق صدیقی کے دیباچے کے ساتھ شائع ہوا۔ ۸۰ء میں حمایت صاحب نے اپنے پہلے مجموعہ کلام "آگ میں پھول" (طبع اول ۵۶ء) کا دوسرا ایڈیشن کچھ اضافوں کے ساتھ شائع کیا اور ۸۱ء میں اپنی چار طویل افسانوی اور تمثیلی نظموں کا مجموعہ "تشنگی کا سفر" کے نام سے اہل ادب کے سامنے پیش کردیا۔

ان کتابوں کے بعد حمایت صاحب اپنے منظوم اور منثور ریڈیائی ڈراموں "فاصلے" سندھی لوک کہانیوں کا تمثیلی روپ "مہران موج" قومی نغمات "اپنے پرچم تلے" اور اپنی ثلاثیوں کا مجموعہ مرتب کرنے میں مصروف تھے کہ ۸۳ء میں شمیم احمد کی کتاب "برش قلم" آگئی اور پھر کچھ "دوستوں" نے وہ "فرض دوستی" انجام دیا کہ حمایت صاحب کو بھی ادھر متوجہ ہونا پڑا اور جوابی مضامین لکھ کر اپنی پوزیشن صاف کرنا پڑی۔ یہ سبھی "کرم فرما" کراچی کے کسی نہ کسی اخبار کے "کالم نگار" تھے، چنانچہ حمایت صاحب کو جوابی مضامین کی اشاعت

میں دشواریاں بھی پیش آئیں۔ ایسے عالم میں روزنامہ "کلیم" سکھر کے مالک و مدیر مہر الٰہی شمسی اور نکہت بریلوی صاحبان نے حمایت علی شاعر کا ساتھ دیا۔ حمایت صاحب کی ہر جوابی تحریر تاریخی حوالوں کے ساتھ روزنامہ "کلیم" کے شماروں میں محفوظ ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس اخبار کی رسائی محدود تھی۔ مخصوص ادیبوں اور شاعروں تک تو اسے ضرور پہنچا دیا جاتا مگر "جسارت" "نوائے وقت" "حریت" اور "مشرق" جیسے اخبار پڑھنے والوں کی نظر سے حمایت صاحب کی تحریریں نہیں گزرتیں۔ وہ حمایت صاحب کے "محسنوں" ہی کی تحریروں سے متاثر ہوتے۔

ہم طالب علم جو نئی نسل کے نمائندے تھے اور جو ادبی دنیا میں تازہ وارد تھے۔ جن کے ذہن مختلف سنے سنائے واقعات سے پراگندہ تھے۔ جو اپنے عہد کی ادبی شخصیات کے بارے میں واضح طور پر جاننا چاہتے تھے --- سخت الجھن میں مبتلا تھے۔

ہم نے حمایت صاحب سے اصرار کیا کہ وہ بھی اپنی تمام جوابی تحریریں کتابی صورت میں شائع کردیں تاکہ ہم جیسے طالب علم بھی حقیقت سے واقف ہوسکیں اور ہمیں تجزیہ کرنے میں دقت پیش نہ آئے۔ حمایت صاحب نے وقت کے تقاضے کو سمجھتے ہوئے نہ صرف متنازعہ تحریریں بلکہ اپنے وہ تمام مضامین بھی جو اکتوبر ۵۳ء سے اپریل ۸۴ء تک ہندوستان اور پاکستان کے مختلف رسائل اور اخبارات میں بکھرے پڑے تھے، "شخص و عکس" کے نام سے (اشاعتی حوالوں اور متعلقہ مطبوعہ کلام کے عکس کے ساتھ) کتابی صورت میں شائع کردیئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مخالفین کے مضامین، خطوط اور ہر اس کلام کی فوٹو کاپی بھی جس پر سرقے یا چربے کا الزام لگایا گیا تھا (متعلقہ شعراء کی پوری نظموں کی فوٹو کاپیوں کے ساتھ) "چراغ بکف" کے نام سے مرتب کر کے مختلف لائبریریوں میں رکھوا دیں تاکہ اہل نظر خود فیصلہ کرسکیں کہ "حقیقت" کیا ہے اور "افسانہ" کیا؟

"شخص و عکس" کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا:

۱۔ تجزیہ (۱۲) تنقیدی اور تاثراتی مضامین

۲۔ تبصرہ (۳۰) کتابوں پر تبصرے

۳۔ تزکیہ (۳۰) سے زیادہ جوابی مضامین اور خطوط

(۳۷۶) صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۸۴ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ نئی نسل کو بہت سی حقیقتوں سے آگاہی ہوئی اور بیشتر غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ انہیں حمایت صاحب کی علمیت اور تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوا' اور اس قوت برداشت اور عالی ظرفی کا بھی' جو ان کے مضامین سے جھلکتی ہے۔ انہوں نے اپنی کسی تحریر میں "جواب آں غزل" کا انداز اختیار نہیں کیا۔ ان کے مزاج کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ جب یہ کتاب زیر طبع تھی تو سلیم احمد کا انتقال ہو گیا۔ (یکم ستمبر ۸۳ء)

حمایت صاحب پر جو گزری' اس کا اندازہ اس مضمون سے ہو سکتا ہے جو "شخص و عکس" میں شامل ہے۔ انہوں نے سارے اختلافات بھلا کر نہ صرف مضمون لکھا (مطبوعہ روزنامہ "کلیم" سکھر' مورخہ ۲۳ر ستمبر ۸۳ء) بلکہ اپنی ایک "ثلاثی" کے ساتھ کتاب کا انتساب بھی سلیم احمد کے نام کر دیا۔

وہ ایک شخص کہ سایہ بھی تھا اجالا بھی
ہر اختلاف کا مرکز رہا مگر اب تک
رقابتوں میں محبت کا تھا حوالہ بھی

"شخص و عکس" کو شائع ہوئے ابھی دس سال بھی نہ گزرے تھے کہ محسن بھوپالی صاحب نے حمایت صاحب کے خلاف ایک اور مہم شروع کر دی۔

قابل اجمیری کے بارے میں ڈاکٹر ساجد احمد سے ایک سوانحی ناول لکھوایا گیا جو پہلے "سرگزشت" ڈائجسٹ (کراچی) میں اکتوبر ۹۲ء کو شائع ہوا۔ پھر "قومی اخبار" (کراچی) کے ہفتہ وار میگزین میں ۵ر مارچ سے ۹ر اپریل ۹۳ء تک مسلسل چھ اقساط میں چھاپا گیا۔

اس ناول میں حمایت صاحب کا نام لیے بغیر ایسے واقعات بیان کیے گئے تھے جو نہ صرف ان کی توہین کے مترادف تھے بلکہ انہیں "قابل دشمن" حتیٰ کہ قابل صاحب کا "قاتل" تک لکھ دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ادبی اخلاقیات ہی نہیں' سماجی اخلاقیات کے بھی منافی تھی۔ چنانچہ حمایت صاحب نے اپنے نام کی بجائے جب قلمی نام ابن مریم کو "وسیلہ تحقیق" بنایا (مکتوب بنام ایڈیٹر "قومی اخبار" مطبوعہ ۹ر اپریل ۹۳ء) تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس ناول کے پیچھے بھی جناب محسن بھوپالی کا ہاتھ تھا۔ ساجد امجد نے اپنے وضاحتی مکتوب (مطبوعہ

"قومی اخبار" ۳۰؍اپریل ۹۳ء) میں موصوف کا "ذکرِ خیر" ان الفاظ کے کے ساتھ کیا ہے:

"..... قابل اجمیری کے ایک ہم عصر جناب محسن بھوپالی کے مشورے خاص طور سے شریک تحریر رہے۔ وہ کئی ایسی باتوں کے عینی شاہد ہیں جو کہیں شائع نہیں ہوئیں۔"

اس کے علاوہ ساجد امجد نے "تحقیقی وسائل" کے طور پر جن تین رسالوں کی نشاندہی کی' وہ یہ تھے:

۱۔ پندرہ روزہ "رہنما" کے دو شمارے (۱۰؍اگست اور ۱۷؍اگست ۶۲ء)

۲۔ "طالب علم" ڈائجسٹ (قابل نمبر) فروری ۷۰ء

۳۔ ہفتہ وار "فکر و عمل" (قابل نمبر) اگست ۷۷ء

آخری دونوں رسائل اس دور میں شائع ہوئے جب حمایت صاحب کا قیام حیدر آباد میں نہیں تھا۔ وہ اپنی فلمی مصروفیات کے سبب لاہور میں رہتے تھے۔

ان رسائل میں بھی محسن بھوپالی اور ان کے "رفیق خاص" حسن ظہیر کے مضامین میں حمایت صاحب کا نام لیے بغیر اسی تنقیدی نشست اور اسی مشاعرے کا حوالہ تھا جس کی رپورٹ پندرہ روزہ "رہنما" میں (قابل صاحب کی زندگی ہی میں) شائع ہو چکی تھی۔

اب یہ سوچنا ضروری ہو گیا کہ مذکورہ ناول میں بیان کردہ دیگر واقعات ساجد امجد کو کیسے معلوم ہوئے جبکہ انہوں نے اپنے وضاحتی مکتوب میں واضح طور پر یہ لکھ دیا تھا کہ:

"وہ کبھی قابل صاحب سے نہیں ملے اور کبھی حیدر آباد میں نہیں رہے" (ساجد امجد ۴۸ء میں رامپور میں پیدا ہوئے' خدا جانے پاکستان کب آئے' قابل صاحب کے انتقال کے وقت ان کی عمر ۱۳ یا ۱۴ سال تھی۔)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ محسن صاحب نے ساجد امجد کو ساری معلومات' اپنے انداز میں "زبانی" فراہم کی تھیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جس سال یہ ناول شائع ہوا یعنی ۱۹۹۲ء میں ---- اسی سال محسن صاحب کا سفرنامہ امریکہ (حیرتوں کی سرزمین) بھی چھپ کر بازار میں

یہ حسن ظہیر وہ نہیں جن کی کتاب "The seperation of east Pakistan" ہے جو "بنگلہ دیش" میں بڑے عہدوں پر رہے' ۴۷ء میں پاکستان آئے اور کیبنٹ سیکریٹری کی حیثیت میں ریٹائر ہوئے ---- یہ موصوف کسی دفتر میں کلرک تھے۔ (مرتب)

آگیا۔ اس میں تو محسن صاحب، حمایت صاحب کے بہت "ممنون" نظر آتے ہیں مگر ساجد امجد کو جو "مواد" فراہم کیا وہ ان کے کسی اور ہی جذبے کی نمائندگی کرتا ہے۔ ۸۶ء میں سندھ یونیورسٹی سے ریٹائر ہو کر جب حمایت صاحب کراچی چلے گئے تو مختلف اخبارات سے ایسی خبریں بھی ملتی رہیں --- جن سے اندازہ ہوا کہ اب محسن صاحب اپنی "پچھلی حرکات" سے باز آ چکے ہیں۔ انہوں نے خود دس سال پہلے لکھے ہوئے اپنے ایک مضمون (مطبوعہ "کلیم" سکھر ۳۰ مارچ ۸۴ء) اور حالیہ انٹرویوز (مطبوعہ "نوائے وقت" ۱۹ نومبر ۹۲ء اور "فیملی میگزین" ۲۵ جنوری ۹۳ء) میں بھی یہ اعتراف کیا کہ وہ "جوانی کی غلطیاں تھیں" اور اب وہ اس دور سے آگے نکل آئے ہیں۔

مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا "وہ دور" ساجد امجد کے سپرد کر دیا اور خود حمایت صاحب کے "حلقہ ارادت" میں آگئے --- کیوں نہ ہو، آخر وہ (بقول خود) حمایت صاحب سے "دو سال" چھوٹے ہیں اور اس بنا پر اب انہیں "اپنا بزرگ دوست اور سربراہ" ماننے لگے ہیں (بحوالہ "حیرتوں کی سرزمین" مطبوعہ ۹۲ء۔ صفحات نمبر ۱۰۔ ۱۳ اور ۲۰) خیر --- ہم نے حمایت صاحب کو پھر مجبور کیا کہ وہ اس "ناول" کا محاسبہ کریں اور حقیقت پس پردہ سے نئے لکھنے والوں کو بھی آگاہ کریں۔ ظاہر ہے قابل صاحب کے انتقال کے (۳۰) سال بعد ایک بالکل ہی غیر متعلق اور ناواقف شخص کا --- ایسے چشم دید واقعات لکھنا --- آخر کیا معنی رکھتا ہے۔ ایسی تحریر سراسر کردار کشی کی تعریف میں آتی ہے۔ یہ کس قسم کا ادب ہے جو ہمارے پیش رو ہمیں ورثے میں دے رہے ہیں!

ہمارے اصرار پر حمایت صاحب پھر آمادہ ہو گئے۔ ہم نے مطلوبہ رسائل اور بعض مضامین کی فوٹو کاپیاں انہیں فراہم کر دیں اور انہوں نے تاریخی حوالوں کے ساتھ ایک تفصیلی مضمون لکھ کر "قومی اخبار" کو بھیج دیا جو اس کے ہفتہ وار میگزین میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ (۴ جون تا ۹ جولائی ۹۳ء --- جملہ چھ اقساط)

ہمارا خیال تھا کہ حقیقت نمایاں ہونے پر قمر جمیل کی طرح، محسن بھوپالی بھی (جو موجودہ حالات میں حمایت صاحب کے "بہت ممنون" رہنے لگے ہیں) اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے

ہوئے ان سے معذرت چاہ لیں گے' اور یہ تکلیف دہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔۔۔ مگر انہوں نے اخباری کالم نگاروں سے اپنے تعلقات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے (پھر حمایت صاحب کے خلاف جلی سرخیاں لگوا کر) "جواب آں غزل" کی روایت کے مطابق نہ صرف جوابی مضامین لکھنے شروع کر دیئے (مطبوعہ "قومی اخبار" ۹؍جولائی' ۱۶؍جولائی اور ۲۳؍جولائی ۹۳ء) بلکہ حسب سابق "فرضی ناموں" سے مراسلے بھی چھپوائے (مطبوعہ "قومی اخبار" ۲۰؍اگست ۹۳ء)

جن دنوں یہ مضامین چھپ رہے تھے' حمایت صاحب ملک سے باہر تھے' پہلے مختلف مشاعروں کی دعوت پر انگلینڈ' ناروے اور سویڈن وغیرہ گئے تھے۔ پھر تقریباً تین ماہ امریکہ اور کینیڈا میں مختلف سیمینار اور مشاعروں میں مصروف رہے۔ جنوری ۹۴ء میں واپس آئے تو جدہ سے بلاوا آ گیا۔۔۔ اپنی بیگم کے ہمراہ عمرہ کر کے واپس آئے تو میں مبارک باد دینے کراچی پہنچا اور اپنے ساتھ وہ تمام رسائل لیتا گیا جن میں ان کے خلاف تحریریں چھپتی رہیں۔ "قومی اخبار" کے علاوہ ایک غیر معروف ہفتہ وار "پنچ لوک" میں بھی (۱۴؍اگست ۹۳ء اور ۲۰؍ستمبر ۹۳ء کے شماروں میں) حمایت صاحب کے خلاف شمیم احمد (مرحوم) کا وہ مضمون جو انہوں نے ۶۳ء میں لکھا تھا اور پہلی بار اپنی کتاب "برش قلم" (مطبوعہ ۸۳ء) میں شائع کیا گیا تھا۔۔۔ حسب روایت جلی سرخیوں کے ساتھ دو قسطوں میں چھاپا گیا (یہ وہی مضمون ہے جس سے "گمراہ ہو کر" قمر جمیل نے "نوائے وقت" میں دو ایک کالم لکھے تھے اور بعد میں شرمندہ ہو کر حمایت صاحب سے معافی مانگ لی تھی اور پھر سلیم احمد کی خاطر۔۔۔ حمایت علی شاعر نے شمیم احمد کے خلاف دائر کیا جانے والا ہتک عزت کا مقدمہ بھی واپس لے لیا تھا (ان تمام واقعات کی تفصیل تاریخی حوالوں کے ساتھ "شخص و عکس" میں موجود ہے) اس سلسلے کی چند ضروری تحریریں "احوال واقعی" میں بھی شامل کر دی گئی ہیں تاکہ بقول محسن صاحب "ریکارڈ درست رہے" لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ (۳۰) سال بعد شمیم احمد (مرحوم) کے اس "مطعون اور رکیک" مضمون کی دوبارہ اشاعت آخر کس مقصد سے عمل میں آئی؟

یہی نہیں۔۔۔ حال ہی میں حیدر آباد (سندھ) سے ایک نیا رسالہ "ذوقی" کے نام سے

شائع ہوا ہے۔ اس کے مارچ/ مئی ۹۴ء کے شمارے میں (۲۴) سال پہلے کے "طالب علم ڈائجسٹ" (قابل نمبر) فروری ۷۰ء میں شائع شدہ ایک "تقابلی" مضمون "وادی مہران کی تین آوازیں" (شاعر- محسن- قابل) دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ مصنف کی لاعلمی سے قطع نظر--- اس مضمون میں حمایت صاحب کو، محسن بھوپالی سے بھی کمتر درجے کا شاعر دکھانا مقصود تھا۔ جگہ جگہ ان کے ترنم کا حوالہ ہے' بقول مصنف وہ "صف اول" کے شاعر شمار ہوتے ہیں تو صرف اپنی "مسحور کن آواز" کے سبب--- یہ مضمون مصنف کا پہلا اور آخری مضمون ہے۔ اس کے بعد ان کی کوئی تحریر کہیں نظر نہیں آئی۔ مضمون میں چونکہ محسن صاحب کے عہدے "محکمہ تعمیرات میں انجینئر*" ہونے کی اطلاع کے علاوہ ان کی شاعری کی متعدد خصوصیات کا بھی ذکر ہے۔ اس لیے گمان ہوتا ہے کہ یہ مضمون بھی انہیں کی "رہنمائی" میں لکھا گیا ہوگا۔ اور اب اس کی اشاعت کی ضرورت یوں پیش آئی کہ "ایک خاص مقصد" کے تحت شمیم احمد (مرحوم) کا مضمون بھی کراچی کے ایک ہفت روزہ میں چھپوایا جا چکا تھا۔

حمایت صاحب نے قابل صاحب کے بارے میں اپنے تفصیلی مضمون "آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے" (مطبوعہ "قومی اخبار" مورخہ ۴/جون ۹۳ء) کی پہلی ہی قسط میں ایک "خاص منصوبے" کی طرف اشارہ کر دیا تھا اور ماہ بہ ماہ چھپنے والی مخالفانہ تحریروں کی فہرست بھی تاریخ وار دیدی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ (۲۵) اور (۳۰) سال پہلے کے مطبوعہ مضامین کی دوبارہ اشاعت اسی منصوبے کی کڑیاں ہیں--- کہ نئی نسل کو حمایت صاحب کی طرف سے بدگمان کیا جائے۔ سیدھے اور صاف ذہنوں میں ایسی غلط فہمیاں پیدا کی جائیں کہ ادب اور معاشرے میں ان کا کردار "مسخ" ہو کر رہ جائے--- کاش محسن صاحب اور حمایت صاحب کے مخالفین جانتے کہ وقت "نابینا" نہیں ہوتا۔ "طالب علم ڈائجسٹ" کے "قابل نمبر" میں بھی اس قسم کے مضامین کی شمولیت' محسن صاحب کی مرضی سے عمل میں آئی تھی "اظہار تشکر" کے طور پر رسالے کے ایڈیٹر نے خود اعتراف کیا تھا کہ:

"قابل نمبر کے لیے مضامین نظم و نثر کے حصول اور ترتیب و تدوین کے سلسلے میں..... سرفہرست محسن بھوپالی کا نام آتا ہے..... انہوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی

---

* محسن صاحب نے کراچی پولی ٹیکنیک سے میکانیکل میں تین سالہ ڈپلوما کیا تھا۔ (مرتب)

ہے۔" (صفحہ ۱۴)

حمایت صاحب سے جب میں نے اس "تازہ واردات" کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے زیرلب مسکرا کر پروفیسر منظور حسین شور کی ایک رباعی پڑھ دی۔

ادھا ہو کوئی شخص کہ پونا ہو کوئی
ہاتھوں میں ادب کے نہ کھلونا ہو کوئی
قصر قدوقامت میں کوئی عیب نہیں
فکری قدوقامت کا نہ بونا ہو کوئی

پھر انہوں نے اپنی میز کی دراز سے ایک ایسا مضمون نکالا جو کہیں شائع نہیں ہوا تھا۔ یہ مضمون کسی عالم صاحب نے محسن صاحب کے "جوابی مضامین کے جواب میں" لکھا تھا اور بذریعہ رجسٹری ۲۶ راگست ۹۳ء کو ایڈیٹر "قومی اخبار" (الیاس شاکر) کے نام پوسٹ کردیا تھا۔ جب اسے شائع نہیں کیا گیا تو انہوں نے اس کی ایک کاپی (مع رجسٹری کی رسید) اس خواہش کے ساتھ حمایت صاحب کو بھیج دی کہ وہ اسے کہیں اور چھپوا دیں ـــــ مگر ـــــ حمایت صاحب ٹال گئے۔ یہ مضمون چونکہ تحقیقی اہمیت بھی رکھتا ہے اور تاریخی بھی ـــــ اس لیے اس (تحقیقی) کتاب میں اس کی اشاعت ضروری سمجھتے ہوئے میں نے اسے بہ اصرار حمایت صاحب سے لے لیا اور اب ان کی اجازت سے کتاب میں شامل کر رہا ہوں۔ عنوان ہے

پردۂ چشم اٹھا' دیدۂ تحقیق سے دیکھ

محسن صاحب واقعی عجیب و غریب آدمی ہیں۔ حمایت صاحب نے ان کی شاعری کے ابتدائی مجموعے میں ایک دو غلطیوں کی نشاندہی کیا کردی کہ ساری زندگی ان کے پیچھے پڑ گئے۔ ایک محاذ پر پسپا ہوئے تو دوسرا محاذ کھول دیا۔ قابل اجمیری مرحوم کے حوالے سے ایک تنقیدی نشست کی گفتگو کو ان کی جان کا عذاب بنا دیا۔ اس بہانے انہیں کیا کچھ نہیں کہا گیا۔ کیسے کیسے الزام نہ ان کے سر نہ رکھ دیئے گئے۔ حتیٰ کہ ان کے خلاف ایک جھوٹا ناول تک لکھوا دیا گیا ـــــ اس کے برعکس حمایت صاحب نے جوابی مضامین لکھ کر صرف اپنی پوزیشن صاف کی۔ ان کے کسی دوست تک نے کبھی کسی پر کوئی الزام رکھا نہ کوئی بدزبانی کی۔ سمجھ

میں نہیں آتا محسن صاحب کی اس روش کو کیا نام دیا جائے۔ فی الحال انہیں کا ایک قطعہ یاد آرہا ہے۔

جاہل کو اگر جہل کا انعام دیا جائے
اس حادثۂ وقت کو کیا نام دیا جائے
میخانے کی توہین ہے رندوں کی ہتک ہے
کم ظرف کے ہاتھوں میں اگر جام دیا جائے

میں نے "احوالِ واقعی" میں (تاریخی حوالوں کے ساتھ) وہ تمام تحریریں یکجا کر دی ہیں جو بالخصوص حیدر آباد کے "ادبی مثلث" قابل اجمیری، حمایت علی شاعر اور محسن بھوپالی ـــــ ان کے باہمی تعلقات، اختلافات اور اس شہر کی ادبی فضا کا مختلف زاویوں سے جائزہ پیش کرتی ہیں اور ان محرکات کا بھی سراغ دیتی ہیں، جن کے سبب حمایت صاحب نے اپنی کتاب "شخص و عکس" مرتب کی اور نسبتاً وسیع پس منظر میں ایک خاص دور کے ادبی ماحول کا محاسبہ کیا لیکن اس کتاب میں چونکہ حمایت صاحب نے صرف اپنے "جوابی مضامین" شائع کیے تھے اس لیے محسن صاحب کو یہ کہنے کی ضرورت پیش آئی کہ:

"یہ گوشہ (شخص و عکس کا ایک باب "تزکیہ") چونکہ یکطرفہ تحریروں اور اپنی من پسند تاویلات پر مشتمل ہے اس لیے ایک اور گوشے کا متقاضی ہے۔" (مطبوعہ "قومی اخبار" ۱۶ر جولائی ۹۳ء)

(یہ اعتراض غور طلب ہوتا اگر حمایت صاحب "چراغ بکف" ایسا مجموعہ مرتب نہ کر دیتے) خیر "احوالِ واقعی" مرتب کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ کسی بدگمانی کا جواز پیدا نہ ہو سکے، میں نے تاریخ وار محسن بھوپالی کی تحریریں بھی جمع کر دی ہیں اور حمایت صاحب کے جوابات اور تصریحات بھی اور گرد و پیش کے ان لکھنے والوں کے رشحاتِ قلم بھی، جو ان مسائل پر اپنے اپنے انداز سے روشنی ڈالتے ہیں تاکہ غیر جانبدار اہلِ ادب و دانش، ٹھنڈے دل سے سوچ سکیں کہ حیدر آباد اور کراچی کے (گزشتہ ۳۰-۳۵ سالہ ادبی

ماحول میں) ان مخصوص اہل قلم نے کیا کردار ادا کیا اور کیسے "کارہائے نمایاں" انجام دیئے۔

مکتبہ "نئی قدریں" نے حمایت علی شاعر صاحب سے "چراغ بکف" کی اشاعت کی اجازت بھی حاصل کرلی ہے۔ انشاء اللہ جلد اسے بھی کتابی صورت میں شائع کردیا جائے گا۔

مرزا سلیم بیگ

لیکچرار شعبہ اردو

سندھ یونیورسٹی۔ جام شورو

شاعر مرحوم کا پیغام

(اپنے "محسنوں" کے نام)

کیوں بناتے ہیں میرا افسانہ
بات کرنا ہے تو کھری کیجئے

اپنی شہرت کے واسطے' رسوا
یوں نہ میری سخن وری کیجئے

آدمی اپنے بل پہ جیتا ہے
کس لئے فکر ہم سری کیجئے

میرے کردار میں نہ یوں شامل
اپنا احساس کمتری کیجئے

زندگی میں تو کچھ بھی کر نہ سکے
آیئے' اب مجاوری کیجئے

حمایت علی شاعر

حمایت علی شاعر کی طویل تمثیلی نظم "سایہ شاخ گل" سے اقتباس۔ یہ نظم غالب کے اس مصرے کی معرفت' ہمارے معاشرے کی منافقانہ اور خود غرضانہ روش کا آئینہ دکھاتی ہے۔ (مرتب)

"سایہ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے"

''ابن مریم'' کا خط

ایڈیٹر ''قومی اخبار'' کے نام

(مطبوعہ ہفتہ وار میگزین ۹ر اپریل ۱۹۹۴ء)

گزشتہ کچھ ہفتوں سے آپ کے روزنامہ ''قومی اخبار'' کے ویکلی ایڈیشن میں ہمارے محترم اور مقبول شاعر قابل اجمیری مرحوم کی سوانح حیات' افسانوی انداز میں قسط وار شائع کی جارہی ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے ہر واقعہ اس انداز میں لکھا ہے گویا قابل صاحب کی زندگی کا ہر لمحہ انہوں نے بہ چشم خود دیکھا ہو۔ فن افسانہ کے ناقدین اس انداز نگارش کو کیا کہیں گے' میں نہیں جانتا۔ جہاں تک واقعہ نگاری کا تعلق ہے' ایک عام قاری' معروف لکھنے والوں کی تحریروں کو درست ہی سمجھتا ہے۔

ڈاکٹر ساجد امجد نہ صرف معروف شاعر ہیں بلکہ پریمیئر کالج کراچی میں ادبیات کے استاد بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہیں اپنی دونوں حیثیتوں کا پاس ہوگا۔

حیدر آباد کے واقعات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے قابل صاحب کی زندگی کے آخری چھ سات برسوں کی تفصیلات (قسط نمبر ۴ اور نمبر ۵) جس انداز میں رقم کی ہیں وہ بڑی دردناک ہیں۔ انہیں پڑھ کر نہ صرف دکھ ہوتا ہے بلکہ غصہ بھی آتا ہے۔

اس سوانح کو پڑھتے ہوئے یہ بھی خیال آیا کہ ممکن ہے ڈاکٹر صاحب کا تعلق اجمیر سے ہو یا وہ قابل صاحب کے قریب ترین دوستوں میں سے ہوں۔ لیکن جب ان کا مجموعہ کلام دیکھا تو میرے دونوں اندازے غلط نکلے۔ کتاب پر ان کی تاریخ پیدائش ۱۹۴۸ء لکھی ہے اور مقام پیدائش..... رامپور..... وہ کب پاکستان آئے اور کہاں کہاں تعلیم پائی..... کچھ درج نہیں۔

سب جانتے ہیں کہ حیدر آباد سندھ میں ریڈیو پاکستان ۵۵ء میں قائم ہوا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب کی عمر سات برس کی تھی۔ گویا قابل صاحب کی زندگی میں وہ بمشکل چودہ سال کے ہوں گے۔ اس عمر میں وہ کتنے برس حیدر آباد میں رہے' رہے بھی یا نہیں.... کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اگر کچھ عرصہ قیام کیا بھی ہو تو بقول ان کے ادبی اور غیرادبی مناقشات' ہوٹلوں' مشاعروں' تنقیدی نشستوں' ریڈیو کے لوگوں کی گٹھ جوڑ' سازشوں اور قابل صاحب کو راستے سے ہٹا دینے کی مجرمانہ بلکہ قاتلانہ کوششوں' اور ان کے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں سے منسوب اسی طرح کی تمام رکیک' غیر شریفانہ اور کمینی حرکتوں کا نہ انہیں علم ہوسکتا ہے اور نہ ایسے لوگوں میں وہ بیٹھے ہوں گے.... عمر ہی ایسی تھی۔

قابل صاحب کے انتقال کے تیس سال بعد (تاریخ وفات ہے.... ۳ اکتوبر ۱۹۶۲ء) انہوں نے جو یہ ناول نما سوانح حیات لکھی ہے تو یقیناً بہت چھان پھٹک کے بعد لکھا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب پی ایچ ڈی ہیں۔ جانتے ہیں کہ ایسی تحریریں تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں یقیناً انہوں نے مختلف رسائل میں چھپے ہوئے مضامین' کتابوں اور قابل صاحب کے ان ہم عصروں سے معلومات حاصل کی ہوں گی جو آج بھی بقید حیات ہیں۔

کیا ڈاکٹر صاحب یہ بتانا پسند کریں گے کہ انہیں "قابل دشمنی" کا یہ مواد کن ذرائع سے حاصل ہوا؟ وہ کون "خیر خواہان قابل" ہیں جنہوں نے ۳۵' ۳۷ سال تک ان دردناک سچائیوں کو اپنے سینے میں دبائے رکھا اور اب آپ کے واسطے سے انہیں طشت از بام کر رہے ہیں۔ یعنی ایک ایسے شخص کے ذریعے سے جس نے نہ قابل صاحب کو کبھی دیکھا نہ حیدر آباد میں باضابطہ قیام کیا۔ جو کراچی کے ادبی حلقوں میں بھی ایک خاموش طبع' گوشہ گیر اور پڑھنے لکھنے والا شاعر سمجھا جاتا ہے' جو اپنے پیشروؤں کی عقیدت اور محبت میں ایسے سوانحی خاکے لکھ رہا ہے جو بیک وقت افسانہ بھی ہے اور حقیقت بھی۔ یہ ویسا ہی سلسلہ ہے جو ہندوستان میں ڈاکٹر محمد حسن نے شروع کر رکھا ہے۔ (مجاز کی زندگی.... ناول کے انداز میں) دنیا کی دوسری زبانوں میں

بھی ایسی مثالیں موجود ہیں جیسے عظیم ڈچ مصور وان گاگ کے بارے میں ارونگ اسٹون کا ناول LUST FOR LIFE وغیرہ لیکن ایسی تحریریں مصنف پر دوہری ذمہ داری عائد کرتی ہیں۔ ایک حقیقت کا مطالعہ (پوری تحقیق و تفتیش کے ساتھ' مستند حوالوں کی روشنی میں)۔ دوسرے' اپنا غیر جانبدارانہ تجزیہ.... ورنہ تمام غلطیوں اور غلط بیانیوں کا الزام مصنف کے سر آجاتا ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سارے واقعات من گھڑت ہوں اور چھوٹے موٹے ادبی اختلافات کو' کچھ حاسدوں اور مفسدوں نے بڑھا چڑھا کر پیش کردیا ہو! ہمارے معاشرے میں منافقوں اور شتر کینہ رکھنے والوں کی کمی نہیں۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد جب کہ اس دور کے اکثر بزرگ اور ساتھی اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں' یہ افسانہ چھیڑنا.... اور بعض اہل قلم کا نام لیے بغیر ان پر کیچڑ اچھالنا اور شرمناک الزامات عائد کرکے ان کے چہروں کو مسخ کرنا.... اسی نفسیاتی بیماری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بہرحال' ایسی تحریریں اگر ایک طرف کردار سازی کا نیک فریضہ انجام دیتی ہیں تو دوسری طرف' اپنی لاعلمی کی بنا پر کردار کشی کی بھی گناہ گار بن جاتی ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر ساجد امجد جو اس شخصی ناول کی معرفت ایک مخصوص دور کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔ بحیثیت محقق اور بحیثیت استاد' اپنی ذمہ داری محسوس کریں گے اور بغیر کسی مصلحت کے' ہر سچائی اہل نظر کے سامنے رکھ دیں گے۔ ہر اس شخص کا حوالہ دے دیں گے جس نے ان پر یہ "انکشافات" کیے۔ ہر اس مضمون کی نشاندہی کر دیں گے جو کہیں شائع ہوا ہو اور جو قابل صاحب کے "حریفوں" کی خود غرضیوں' افسران بالا سے تعلقات کی بنا پر ناجائز مراعات حاصل کرنے اور قابل صاحب کی روزی کے وسیلے چھیننے کی ناپاک کوششوں کا ثبوت فراہم کرسکے۔

خدا کرے' وہ ہم عصر ادیبوں اور شاعروں میں کسی بھی "رقیب روسیاہ" کا آلہ کار نہ بنے ہوں۔ شاید وہ ایک زندہ ضمیر شاعر ہوں اور ضمیر کی عدالت سب سے بڑی عدالت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر ساجد امجد کا وضاحتی خط

(مطبوعہ "قومی اخبار" ہفتہ وار میگزین ۳۰؍اپریل ۹۳ء)

قومی اخبار' ہفتہ وار ایڈیشن (۹ اپریل تا ۱۵ اپریل) کے ادبی صفحے میں ابن مریم کے نام سے ایک تحریر شائع ہوئی ہے۔ میں ان صاحب سے واقف نہیں اس لیے ممکن ہے جواب دینے سے گریز کرتا لیکن ان صاحب نے اس خلوص سے میری پیشہ ورانہ ذمے داریوں کا احساس دلایا کہ میں شکرگزاری کے جذبے کے تحت چند سطریں لکھنے پر مجبور ہو گیا۔

ابن مریم کا خیال درست ہے۔ بے شک! میری عمر اتنی نہیں کہ مجھ پر قابل کا دوست ہونے کا گمان کیا جائے۔ میں کبھی ان سے نہیں ملا' میں نے کبھی ان کو نہیں دیکھا لیکن چشم دید انداز میں لکھ تو سکتا ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے تاریخی ناولوں کی روایت اردو میں موجود ہے۔ صلاح الدین ایوبی پر ناول لکھا جا سکتا ہے' اس سے ملنے کی شرط ضروری نہیں۔ پھر کیسے لکھا جائے؟ مختلف تحریروں اور اطلاعات سے معلومات جمع کرنے کے بعد۔

میں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور قابل کی کہانی وجود میں آ گئی۔ میں ابن مریم کی خواہش کے مطابق وہ تمام حوالے یہاں نقل کر رہا ہوں جن کی مدد سے یہ کہانی شروع ہوئی اور تدریجی مراحل طے کرتی ہوئی تکمیل تک پہنچی۔

اجمیر کی تاریخ اور ادبی ماحول' قابل کے بچپن وغیرہ کی معلومات کے ماخذات یہ

ہیں۔

خادمی اجمیری، کچھ یادیں، مطبوعہ قابل نمبر، فروری ۱۹۷۰ء

احمد رئیس، مضمون مطبوعہ پندرہ روزہ "فکرو عمل" ۳۰ اگست ۱۹۷۷ء

پیکر اجمیری، قابل کا ذہنی ارتقاء مطبوعہ پندرہ روزہ "فکر و عمل" ۳۰ اگست ۱۹۷۷ء

اس کے علاوہ ہم نے ایک بزرگ شاعر برق اجمیری سے بھی اجمیر سے متعلق معلومات جمع کیں۔

حیدر آباد کے ادبی ماحول اور ادبی سیاست سے شناسائی کے لیے مندرجہ ذیل تحریریں اور مشورے ہمارے پیش نظر تھے۔

توصیف چغتائی، بیگم قابل اجمیری مطبوعہ قابل نمبر ۱۹۷۰ء

انوار احمد زئی، جوہر قابل کا نوحہ مطبوعہ پندرہ روزہ "فکرو عمل" ۳۰ ستمبر ۱۹۷۷ء

محسن بھوپالی، چند یادیں مطبوعہ قابل نمبر ۱۹۷۰ء

تنقیدی نشست کی رپورٹ مطبوعہ ہفت روزہ "رہنما" ۱۰ اگست ۱۹۶۲ء ایڈیٹوریل ہفت روزہ "رہنما" ۱۷ اگست ۱۹۶۲ء

اس کے علاوہ قابل اجمیری کے ایک ہم عصر جناب محسن بھوپالی کے مشورے خاص طور پر شریک تحریر رہے۔ وہ کئی ایسی باتوں کے عینی شاہد ہیں جو کہیں شائع نہیں ہوئیں۔

ادبی تحریروں میں یہ خطرہ ہمیشہ رہتا ہے کہ کون سی بات کب غلط ثابت ہو جائے۔ اس لیے میں ان واقعات کی مکمل درستی کا حلف اٹھانے کا اہل نہیں۔

اگر اتنی احتیاط کے بعد بھی کوئی واقعہ غلط ثابت ہوتا ہے تو اسے اپنی کوتاہی تحریر کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں۔

ڈاکٹر ساجد امجد

حمایت علی شاعر کا خط

ایڈیٹر "قومی اخبار" کے نام

(مطبوعہ ہفتہ وار میگزین ۴ جون ۹۲ء)

برادر عزیز الیاس شاکر صاحب

سلام مسنون

قابل اجمیری مرحوم کے بارے میں "قومی اخبار" کے ویکلی ایڈیشن میں جو ناول نما سوانح عمری شائع ہوتی رہی۔۔ اس کے پس منظر کے بارے میں "ابن مریم" نے آپ کو خط لکھا تھا اور مصنف سے کچھ سوالات کیے تھے' (مطبوعہ ۹ر اپریل ۹۳ء) ڈاکٹر ساجد امجد نے اپنے جوابی خط' (مطبوعہ ۳۰ر اپریل ۹۳ء) میں جو حوالے دیئے' میرے خیال میں وہ یک طرفہ ہیں۔ اس ناول میں کئی اہل قلم کی کردار کشی کی گئی ہے۔ میں تاریخی حوالوں کے ساتھ ایک مضمون بھیج رہا ہوں۔۔۔ قدرے طویل ہے (آخر چالیس سال کا محاسبہ ہے) مگر مجھے امید ہے کہ حقایق جاننے کی خاطر آپ اسے بھی قسط وار شائع کردیں گے۔

ممکن ہے آپ سوچ رہے ہوں کہ "ابن مریم" سے میرا کیا تعلق ہے۔ شاعرانہ الفاظ میں تو یوں کہہ سکتا ہوں کہ۔

ہم ہیں وہ دوست کہ ہر بعد کے باوصف ہمیں
ایک ہی نام سے دنیا نے پکارا ۔۔۔۔ برسوں
ہم ہیں وہ ثابت و سیار ۔۔ خلاؤں میں جنہیں
وقت کی گردش پیہم نے سہارا برسوں

ہم ہیں ایک شاخ کے وہ پھول' وہ گلہائے دو رنگ
اپنے ہی ذوق تماشا نے نکھارا ہے جنہیں
ہم ہیں اک بحر کی موجیں' وہ سبک رو موجیں
عیش ساحل نے' تلاطم پہ ابھارا ہے جنہیں

"ابن مریم" میرا ہی قلمی نام ہے جو ایک استعارے کے طور پر میں نے اپنا رکھا ہے' ماہنامہ "افکار" (کراچی) اور ہفتہ وار "لیل و نہار" (لاہور) میں ۵۵ء سے ۵۸ء تک' میری کچھ نظمیں بھی اس نام سے چھپتی رہی ہیں۔ ویسے "آگ میں پھول" کے ایڈیشن (مطبوعہ ۸۰ء) میں' ان نظموں کو شامل کرتے ہوئے' میں نے وضاحت بھی کر دی تھی۔

فی الوقت یہ نام اختیار کرنے کا مقصد یہ تھا کہ جب کسی تحریر میں میرا نام لیا ہی نہیں گیا تو میں کیوں یہ کہہ کر مخاطب ہو جاؤں کہ یہ اشارہ میری ہی طرف ہے۔ مگر اب چونکہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے۔ اس لیے نام بہ نام صداقت نمایاں ہو تو بہتر ہو گا۔

تاریخی حوالوں کے سبب حیدر آباد کی ادبی زندگی کا ایک دور بھی محفوظ ہو گیا ہے۔
امید کہ آپ اسے شائع کر کے برسوں کی غلط فہمیاں دور کر دیں گے۔ شکریہ

حمایت علی شاعر

۱۵/۵/۹۳ء

نوٹ :- آپ چاہیں تو اس خط کو بھی شائع کر سکتے ہیں۔

یہ شہر رفیقاں ہے' دل زار سنبھل کے
ملتے ہیں یہاں لوگ بہت روپ بدل کے

(حمایت علی شاعر)

حمایت علی شاعر

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

(مطبوعہ "قومی اخبار" ہفتہ وار میگزین ۴ر جون تا ۹ر جولائی ۹۳ء۔ چھ اقساط)

خدا کا شکر ہے کہ میری گزارش پر ڈاکٹر ساجد امجد نے اپنے خط مورخہ ۳۰ر اپریل ۹۳ء' (مطبوعہ ' قومی اخبار۔ ویکلی ایڈیشن) میں اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کو محسوس کرتے ہوئے ان ذرائع کا حوالہ دے دیا جن کی روشنی میں انہوں نے قابل اجمیری مرحوم کی زندگی کے حالات افسانوی انداز میں لکھے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ

"بے شک میری عمر اتنی نہیں کہ مجھ پر قابل صاحب کے دوست ہونے کا گمان کیا جائے' میں کبھی ان سے نہیں ملا' کبھی ان کو نہیں دیکھا۔"

ناول نما سوانح عمری کے سلسلے میں انہوں نے اردو کے تاریخی ناولوں کی روایت کا سہارا لیا اور لکھتے ہیں کہ

"صلاح الدین ایوبی پر ناول لکھا جا سکتا ہے۔ اس سے ملنے کی شرط ضروری نہیں' پھر کیسے لکھا جائے؟ مختلف تحریروں اور اطلاعات سے معلومات حاصل کرنے کے بعد۔۔۔۔ میں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔"

جناب ساجد نے مثال بھی دی اور پھر خود ہی سوال اٹھا کر جواب بھی دے دیا۔ میں نے بھی اپنے خط مورخہ ۹ر اپریل ۹۳ء میں یہی عرض کیا تھا۔ انہوں نے آٹھ سو سال پہلے کے ایک سلطان (۱۱۳۸ء تا ۱۱۹۳ء) پر لکھے گئے ناول کا حوالہ دیا ہے۔ جب کہ

اس دور کا کوئی شخص زندہ نہیں کہ غلط بیانی پر مصنف کا گریبان پکڑ سکے۔ مصنف صرف اپنے ضمیر کے آگے جوابدہ ہے۔

تاریخی ناول نگاری میں اکثر اہل قلم عدم توازن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کبھی ناکافی اور یک طرفہ معلومات کی بنا پر اور کبھی دانستہ یا نادانستہ کسی لابی کے آلہ کار بن جانے کے سبب--- ایسی صورت میں کرداروں کے روپ وہ نہیں رہتے جو قدرت نے بنائے ہیں' واقعات کا تانا بانا ایسا بنا جاتا ہے کہ تاریخ مسخ ہو کر رہ جاتی ہے اور پس پردہ اگر کوئی "دشمن حق" لابی کام کر رہی ہو تو یہی تاریخی ناول دروغ گوئی' دریدہ دہنی اور گستاخ کلامی کی بدترین مثال بن جاتے ہیں۔ یہودی لابی کے آلہ کار سلمان رشدی کی کتاب "شیطانی آیات" ہمارے سامنے ہے۔ صلاح الدین ایوبی کا ناول نگار اگر عیسائی مشنری کا آلہ کار بن جائے تو سوچئے کہ اس ناول کا ہیرو سلطان ہو گا کہ رچرڈ---؟

خیر' عظیم اور مقدس شخصیتوں کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے مگر ہم آپ جیسے لوگ اگر اس روایت کی زد میں آجائیں تو شاید ساری عمر کے لیے داغدار ہو جائیں۔ مانا کہ ادبی دنیا کے "اہل نظر" ہر افسانے کو حقیقت نہیں مانتے مگر لکھنے والا اگر "استاد" ہو تو "شاگرد" کسی حد تک اس کی بات کو سچ ہی مان لے گا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ تاریخی ناول نگاری تلوار کی دھار پر چلنے کا نام ہے۔ ذرا سی لغزش خود مصنف کے حق میں عذاب بن جاتی ہے۔ سنا ہے کہ جس ڈائجسٹ کے لیے ساجد امجد ایسے ناول لکھتے ہیں وہ خاصی رقم ادا کرتا ہے' واللہ علم۔ خدا کرے وہ اس رقم کی خاطر یا کسی مخصوص لابی کی خاطر دانستہ یا نادانستہ کسی کے آلہ کار نہ بنے ہوں۔ انہوں نے چونکہ ایک بیمار شاعر کی محبت اور عقیدت میں یہ ناول لکھا ہے' اس لیے میں اب بھی ان سے خوش گمان ہوں--- میرا عقیدہ ہے کہ محبت انسان کی روح کو روشن کر دیتی ہے۔ کاش وہ اس ناول کے سلسلے میں ادھوری' ناکافی اور یک طرفہ اطلاعات پر آنکھ بند کر کے یقین نہ کر لیتے۔ جن اہل قلم کے چہرے انہوں نے مسخ کیے ہیں' ان سے رابطہ قائم

کر لیتے۔۔۔۔کم از کم مجھ ہی سے مل لیتے' ہیں۔۔۔۔جس کے لیے ان کے دل میں شاید اب بھی تھوڑی سی جگہ باقی ہو۔

انہیں یاد ہو گا اپنی کتاب ''قافیہ پیمائی'' پیش کرتے ہوئے ۸۷ء میں انہوں نے مجھے کیا لکھ کر دیا تھا۔۔۔رسمی الفاظ سے قطع نظر انہوں نے مجھے ''مہربان دوست'' بھی لکھا تھا۔۔۔تو یہ ''مہربان دوست'' انہیں کچھ ایسی تحریریں بھی فراہم کرویتا جو تصویر کا دوسرا رخ نمایاں کر دیتیں۔ اس طرح قابل صاحب کی ''زندگی'' میں لکھے ہوئے کچھ مضامین بھی ان کے مطالعے میں آجاتے' جنہیں پڑھ کر نہ صرف قابل صاحب کی شخصیت کے کچھ اور پہلو نمایاں ہوتے بلکہ وہ یہ بھی جان لیتے کہ ان کے ''سچے دوست'' کون تھے۔ پھر ان کی نظر سے وہ جوابی مضامین بھی گزر جاتے جو قابل صاحب کے انتقال کے بعد مسلسل پھیلائے ہوئے جھوٹ کی تردید میں لکھے گئے۔

ان تمام تحریروں کی روشنی میں ڈاکٹر ساجد امجد کو اندازہ ہو جاتا کہ ان کے اس سوانحی ناول کے ''مثبت کردار'' دراصل کتنے نمائشی' ظاہردار اور موقع پرست ہیں۔ انہوں نے اپنی مفسدانہ فطرت' حسد' ذاتی منفعت اور شہرت کی خاطر دوسروں کی کردار کشی کی اور وقتی طور پر سرخرو ہو گئے۔ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو دوسروں کی قبروں پر اپنا مکان بنا لیتے ہیں۔۔۔۔دولت اور شہرت کی ہوس' ایک کم ظرف انسان سے سب کچھ کروا سکتی ہے۔

اگر ڈاکٹر ساجد امجد کی نظر میں یہ تمام امکانات اور اندیشے ہوتے تو آج انہیں یہ نہ لکھنا پڑتا کہ

''ادبی تحریروں میں یہ خطرہ ہمیشہ رہتا ہے کہ کون سی بات کب غلط ثابت ہو جائے' اس لیے میں ان واقعات کی مکمل درستی کا حلف اٹھانے کا اہل نہیں۔ اگر اتنی احتیاط کے بعد بھی کوئی واقعہ غلط ثابت ہوتا ہے تو اسے اپنی کوتاہی تحریر کے علاوہ کیا کہہ سکتا ہوں۔''

یہ کوتاہی تحریر نہیں' کوتاہی علم ہے۔ اگر واقعی وہ احتیاط سے کام لیتے تو آج

حلف اٹھانے کے بھی قابل رہتے۔

خیر --- اب چونکہ ڈاکٹر صاحب نے جرات سے کام لے کر سارے حوالے فراہم کر دیئے' اگرچہ ہفتہ وار "رہنما" کے دو عام شماروں (۱۰ اگست اور ۱۷ اگست ۶۲ء) جس میں ایک تنقیدی نشست کی رپورٹ شائع ہوئی تھی --- اور ہفتہ وار "فکر و عمل" کے قابل نمبر (۳۰ ستمبر ۷۷ء) کے علاوہ' انہوں نے کسی رسالے کا نام نہیں دیا' صرف "قابل نمبر ۷۷ء" لکھ کر رہ گئے۔

لیکن ایک جو سب سے اہم انکشاف کیا ہے' اسے جان کر حیرت تو نہیں ہوئی' البتہ دکھ ضرور ہوا۔ ڈاکٹر ساجد امجد لکھتے ہیں۔

"اس کے علاوہ قابل اجمیری کے ایک ہم عصر جناب محسن بھوپالی کے مشورے خاص طور پر شریک تحریر رہے۔ وہ کئی ایسی باتوں کے عینی شاہد ہیں جو کہیں شائع نہیں ہوئیں۔"

محسن بھوپالی میرے بہت پرانے "کرم فرما" ہیں' انہوں نے گزشتہ دس سال پہلے تک جو کچھ میرے ساتھ کیا --- میری کتاب "شخص و عکس (مطبوعہ ۸۴ء) کا ایک گوشہ اس کا آئینہ دار ہے۔ مگر اس کے بعد شاید انہیں بھی اپنی "نادانیوں" کا احساس ہو گیا تھا اس لیے تحریراً تائب ہو گئے۔"

وہ اختلافات چونکہ "ادبی" تھے اس لیے میں نے بھی انہیں ایک "چھوٹے بھائی کی چھوٹی باتیں" سمجھ کر نظر انداز کر دیا (وہ اکثر لکھتے ہیں کہ حمایت صاحب مجھ سے دو سال بڑے ہیں۔ پھر جب مجھے معلوم ہوا کہ انہیں گلے کا ایک خطرناک عارضہ[1] ہو گیا ہے تو میں گلہ گزار رہنے کی بجائے ان کے حق میں دعا گو رہنے لگا اور انہیں معاف کر بیٹھا۔ اس کے بعد میرا ان کے ساتھ جو برتاؤ رہا ہے وہ اہل ادب جانتے ہیں اور وہ خود بھی اس کے معترف ہیں۔ ملاحظہ ہو ان کا سفرنامہ امریکہ (حیرتوں کی سرزمین --- مطبوعہ فروری ۹۲ء)

لیکن چھ سات مہینے ہی گزرے تھے کہ ان کا یہ "کارنامہ" سامنے آ گیا۔ اس ناول

[1] گلے کے کینسر کے سبب محسن صاحب اپنی آواز سے محروم ہو گئے (مرتب)

نما سوانح عمری میں میرا نام کہیں نہیں لیا گیا مگر کوائف صاف بتاتے ہیں کہ مصنف کا اشارہ کس کی طرف ہے۔ یہ ناول جن صاحب نے لکھا ہے ان کی عمر قابل صاحب کی زندگی میں سات سے چودہ سال کے درمیان ہوگی (تاریخ پیدائش بحوالہ ''قافیہ پیمائی'' ۱۹۴۸ء) اور جیسا کہ انہوں نے خود اقرار کیا۔۔۔ نہ انہوں نے کبھی قابل صاحب کو دیکھا نہ حیدر آباد میں کبھی رہے۔

قابل صاحب کے انتقال (۳ر اکتوبر ۶۲ء) کے پانچ سال بعد ''گہوارہ'' (قابل نمبر ۶۷ء) میں محسن صاحب نے جو نہایت مختصر سا دو صفحاتی مضمون ''چند یادیں'' کے عنوان سے میرے خلاف لکھا تھا (صفحہ ۲۱، ۲۲) اس میں بھی میرا نام لکھنے کی جرات نہیں کی تھی جب کہ اس میں صرف ایک مشاعرے اور ایک تنقیدی نشست کا ذکر تھا۔ پھر یہی مضمون قابل صاحب کے انتقال کے آٹھ سال بعد ''طالب علم'' ڈائجسٹ کے قابل نمبر (فروری ۷۰ء) میں شائع ہوا (صفحہ نمبر ۱۰۲۔ ۱۰۳)، پھر یہی مضمون قابل صاحب کے انتقال کے ۲۳ سال بعد ۵ر نومبر ۸۵ء کو روزنامہ ''پاسبان'' حیدر آباد میں میری تصویر کے ساتھ چھپوایا گیا (صفحہ ۳) جس پر ۱۲ر نومبر ۸۵ء کو سید کاظم رضا نے اسی اخبار میں ایک جوابی مضمون لکھا (اس کا ذکر آگے آئے گا) پھر قابل صاحب کے انتقال کے ۳۰ سال بعد یہی مضمون، اقتباسات کی صورت ''کلیات قابل'' (مطبوعہ ۱۹۹۲ء) میں شہزاد احمد کی معرفت شامل کیا گیا (صفحہ ۱۰)۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مختصر سا مضمون اتنی بار کیوں چھپوایا گیا اور پھر کلیات قابل کا ابتدائیہ لاہور کے اس شاعر سے کیوں لکھوایا گیا، جس نے کبھی قابل کو دیکھا نہ کبھی ان سے ملا، جو کبھی حیدر آباد میں رہا ہی نہیں۔ مقصد صاف ظاہر ہے۔ جس طرح ڈاکٹر ساجد امجد نے محسن بھوپالی کی باتوں پر اعتبار کر کے یہ ناول لکھ دیا، شہزاد احمد بھی ان کے مضمون کو معتبر سمجھ لیں اور اس کے اقتباسات اپنے ''ابتدائیہ'' میں شامل کر دیں۔ اس طرح قابل مرحوم کی آخری کتاب کو بھی محسن بھوپالی نے اپنی تشہیر کا ذریعہ بنایا اور میرے خلاف ایک ''جھوٹ'' کو ''سچ'' بنانے کی ایک اور کوشش کی۔

یہ ناول اور اس کے متعلقات بھی ماہ بہ ماہ جس ترتیب سے شائع ہوتے ہیں، وہ بھی ایک خاص منصوبے کا سراغ دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

(۱)۔ اکتوبر ۹۲ء میں "سرگزشت" ڈائجسٹ میں پورا ناول شائع کیا گیا۔

(۲)۔ نومبر ۹۲ء کی ۱۹ تاریخ کو محسن بھوپالی کا ایک انٹرویو روزنامہ "نوائے وقت" کے ادبی صفحات میں شائع ہوا جس میں بطور خاص اب سے تینتیس سال پہلے کے اس مشاعرے کے بارے میں سوال اٹھایا گیا جس میں منتظمین مشاعرہ کی بدعہدی کے خلاف میں نے احتجاج کیا تھا اور جس کا ذکر ۲۵ سال پہلے محسن بھوپالی نے پہلی بار اپنے مضمون میں ایک "خاص انداز" میں کیا تھا مگر تین چار بار چھپوانے کے باوجود میرا نام لینے کی جرات نہیں کی تھی --- اب ایک سوال کے جواب میں نہ صرف "میرا[1] نام" لیا بلکہ اپنے ذاتی تعلقات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ادبی صفحے کے انچارج سے مذکورہ اخبار میں میرے نام کی "جلی سرخی" بھی لگوائی۔

(۳)۔ دسمبر ۹۲ء میں سید ارتضاء عزمی کا --- قابل صاحب کے بارے میں ایک مضمون "کچھ یادیں، کچھ باتیں" کے عنوان سے ایک کتاب کی معرفت سامنے آیا جس میں ایک تنقیدی نشست کے حوالے سے (جس کا ذکر محسن بھوپالی نے اپنے اسی مضمون میں کیا تھا) میرا بھی "ذکر خیر" ہے۔ (اس کا جائزہ بھی آگے آئے گا)

(۴)۔ جنوری ۹۳ء کی ۲۵ تاریخ کے "فیملی میگزین" میں محسن بھوپالی کا ایک اور انٹرویو چھپا جس میں تینتیس سال پہلے کے میرے اس مضمون کا ذکر ہے جس میں ان کی شاعری میں زبان کی کچھ غلطیوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ محسن نے اسی کتاب کے دوسرے ایڈیشن ۸۹ء میں میری بتائی ہوئی کچھ غلطیاں درست بھی کردیں۔ (یہ بحث بھی آگے آئے گی)

(۵)۔ اب ۵، مارچ تا ۹، اپریل ۹۳ء "قومی اخبار" کے ویکلی ایڈیشن میں یہ ناول چھ اقساط میں دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ اتفاق سے "قومی اخبار" کی وساطت سے میں اسے

---

[1] ۳۰ سال بعد پہلی بار محسن صاحب نے حمایت صاحب کا نام لے کر ایک الزام عائد کیا (مرتب)

پہلی بار پڑھ سکا ہوں۔

یہ ناول قابل صاحب کے المیے کی آڑ میں محسن بھوپالی کا قصیدہ ہے۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا اگر اس میں "تحقیق" کے ساتھ واقعات لکھے جاتے۔ جاننے والوں کو اندازہ تو ہو گیا تھا کہ مصنف نے محسن صاحب کے مضمون سے بھی استفادہ کیا ہے مگر یہ گمان نہیں تھا کہ ساری کہانی ہی انہیں کی بنائی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر ساجد امجد کے انکشاف کے بعد میں دو ہفتے منتظر رہا۔۔۔ کہ ممکن ہے محسن صاحب کی طرف سے کوئی تردید آجائے۔۔۔ مگر اب میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ مصنف نے جو حوالہ دیا ہے' وہ درست ہے۔

یہ ناول پڑھ کر ایک دوست نے میرا ہی ایک شعر سناتے ہوئے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔

یہ سنگ زنی میرے لیے بارش گل ہے
تھک جاؤ تو کچھ سنگ' بدست دگراں اور

اس نے کہا۔۔۔ تم اسے "بارش گل" ہی سمجھتے رہو' محسن نے عمل کر کے دکھا دیا۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

الزامات اتنے سنگین ہیں کہ خاموش رہوں تو ساری زندگی داغدار ہو جاتی ہے' جواب دوں تو محسن کی بیماری کا خیال آجاتا ہے۔

اس ناول کے کچھ کردار تو دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں' کل کو میں بھی نہیں رہوں گا' اور مستقبل کا ادبی مورخ جب قابل صاحب پر کوئی تحقیقی کام کرے گا تو یہ ناول بھی زیر غور آئے گا۔۔۔ پھر کوئی گواہی دینے والا بھی نہ رہے گا چنانچہ بادل نخواستہ' بڑے دکھ کے ساتھ۔۔۔ میں یہ مضمون لکھنے بیٹھا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ تاریخی حوالوں کے ساتھ ہر سچائی سامنے لے آؤں۔

ظاہر ہے کہ کسی کی منافقانہ دروغ گفتاری اور کسی کے شوق افسانہ نگاری پر' کسی

کی زندگی بھر کی محنت، عزت اور شہرت کو قربان نہیں کیا جاسکتا۔ محسن بھوپالی کے حق میں یہی دعا کر سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں مکمل صحت عطا کرے --- جسمانی بھی اور ذہنی بھی ---

غالباً یہ محسن بھوپالی ہی کی عطا کی ہوئی معلومات ہیں جن کی بنا پر ڈاکٹر ساجد امجد نے ۵۵ء میں مجھے ادبی دنیا میں ایک "نووارد" سمجھا۔ ایک ایسا شاعر جو مشاعروں کے ذریعے خود کو روشناس کرانے میں سرگرداں رہتا ہو۔ قابل صاحب کی مخالفت کا جواز بھی ان کی سمجھ میں یہی آیا تھا۔ چنانچہ میرا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"کراچی سے ایک شاعر ریڈیو پاکستان حیدر آباد میں اسٹاف آرٹسٹ بھرتی ہو کر آیا۔ اس کا تخلص سن کر بعض لوگ مزاحاً" کہا کرتے تھے کہ یہ تخلص اس لیے رکھا گیا ہے کہ لوگوں کو یقین دلایا جاسکے کہ یہ شاعر ہے۔"

ہاں صاحب، وہ لوگ تو آغا شاعر قزلباش اور شاعر لکھنوی کے بارے میں بھی یہی کہتے ہوں گے۔ اور پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، مرزا ادیب، ادیب سہارنپوری اور ادیب رائے پوری وغیرہ کو بھی "برائے نام ادیب" سمجھتے ہوں گے --- ایسی باتوں پر تو فارسی کا ایک مشہور مصرعہ پڑھ کر خاموش ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔

ڈاکٹر ساجد امجد نے یہ جانے بغیر کہ یہ "نام نہاد شاعر" جو محسن بھوپالی سے، ممکن ہے "دو ہی سال" بڑا ہو، قابل اجمیری سے عمر میں پانچ سال بڑا تھا (جو سندھ یونیورسٹی سے ۸۶ء میں ریٹائر ہوا) جس کی تحریریں ۴۵ء سے ہندوستان اور پاکستان کے مقتدر ادبی رسائل میں چھپ رہی ہیں، جس کا ریڈیو سے بھی تعلق پرانا ہے --- ایسی حرکات اور ایسے واقعات اس سے متعلق کر دیئے گئے جو عموماً خود محسن بھوپالی کیا کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو، سید کاظم رضا کے ایک مضمون سے اقتباس (مورخہ ۱۲/ نومبر ۸۵ء مطبوعہ روزنامہ "پاسبان" حیدر آباد)

"میں نے اکثر اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا ہے کہ محسن صاحب مشاعرہ گاہ میں پہنچنے کے باوجود اس وقت تک پنڈال سے باہر ٹہلتے رہتے تھے جب تک ان کے ممدوح

کا نام نہ پکار لیا جائے۔ مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ انہیں اپنے ممدوح کے بعد کلام سنانے کا موقع میسر آجائے۔"

ڈاکٹر ساجد نے چونکہ ہر بات کا مطالعہ یک طرفہ کیا ہے اور جو باتیں ان کے "مشیر خاص" نے انہیں سمجھا دیں، انہیں کو درست مان لیا ہے اس لیے انہوں نے اپنے طور پر کچھ سوچنے اور فیصلہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ لکھتے ہیں۔

"اس شاعر کو ازخود یہ زعم تھا کہ وہ قابل سے اچھا شاعر ہے.... اس شاعر نے اپنے قلم سے اپنے حق میں یہ فیصلہ تحریر کردیا مگر مشکل یہ تھی کہ اس فیصلے کو کوئی ماننے کو تیار نہیں تھا۔"

پھر مختلف الزامات عاید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"شاعر اصرار کرتے --- اپنے منہ سے کہتے کہ وہ قابل سے اچھے شاعر ہیں...."

پھر ایک مشاعرے میں تقدیم و تاخیر کا احوال لکھتے ہوئے فیصلہ دے دیتے ہیں کہ

"شاعر کو دونوں محاذوں پر ناکامی ہوئی، نہ وہ اپنے ترنم کا جادو چلا سکا، نہ خود کو قابل سے اچھا یا سینئر شاعر ثابت کرسکا --- لیکن یہ کامیابی ضرور ہوئی کہ "قابل دشمنی" میں اس کا نام سرفہرست ہوگیا۔"

اب ڈاکٹر ساجد امجد سے کوئی سوال کرے کہ جناب آپ نے ایسی "تقابلی تحریر" کہاں پڑھی؟ جن مضامین کے آپ نے حوالے دیئے ان میں تو نہیں ہے۔ کیا اسے بھی محسن بھوپالی کے کھاتے میں ڈال دیا جائے کہ وہ بہت سی ایسی باتوں کے "عینی شاہد" ہیں جو کہیں شائع نہیں ہوئیں۔

چونکہ یہ ناول قابل صاحب کے انتقال کے ۳۰ سال بعد لکھا گیا جب کہ دو نسلیں جوان ہوچکی ہیں --- اس لیے اپنے بارے میں خود کچھ کہنے کا ناخوشگوار فریضہ بھی انجام دے رہا ہوں (ممکن ہے اسے بھی خودستائی سے تعبیر کیا جائے) نئے لوگوں کو شاید نہ معلوم ہو کہ میرا تعلق ۴۷ء سے ریڈیو سے ہے۔ ۵۰ء میں جب آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد دکن سے میری ملازمت "ہندو مسلم تعصبات" کی بنا پر ختم ہوگئی اور میری

بیوی کو بھی اسکول سے ہٹا دیا گیا تو احتجاجاً" میں نے "اخبار فروشی" شروع کردی۔ ریڈیو' اخبارات' رسائل اور مشاعروں کی وجہ سے اس وقت تک مجھے اتنی شہرت حاصل ہوچکی تھی کہ میرے اس اقدام پر ہندوستان کی بے شمار ادبی انجمنوں نے آواز اٹھائی' قراردادیں پاس ہوئیں۔ حیدر آباد میں قمر ساحری اور وہاب حیدر نے روزنامہ "عوام" میں' خواجہ احمد عباس نے ہفتہ وار "بلٹز" (بمبئی) میں' ساحر لدھیانوی نے ماہنامہ "شاہراہ" (دہلی) میں' فکر تونسوی اور نریش کمار شاد نے "نقوش" (جالندھر) میں اور مرزا ادیب نے "ادب لطیف" (لاہور) میں احتجاجی کالم اور نوٹس لکھے۔ حیدر آباد اور بمبئی کے مختلف اخبارات اور رسائل میں ریڈیو کی اس روش کے خلاف خوب خوب لکھا گیا۔۔۔ پھر یوں ہوا کہ ان تمام احتجاجی بیانات کو جمع کرکے حیدر آباد دکن کے ایک ہفتہ وار "پرواز" نے ۹ر نومبر ۵۰ء کو ایک "خصوصی شمارہ" شائع کردیا۔ (ڈاکٹر ساجد امجد میری لائبریری میں وہ شمارہ دیکھ چکے ہیں)

۵۱ء میں جب میں پاکستان آیا تو سابقہ تجربے کی بنا پر مجھے ریڈیو پاکستان کراچی میں بحیثیت اسٹاف آرٹسٹ لے لیا گیا۔ ۵۱ء سے ۵۵ء تک کراچی میں (اور پھر ۵۵ء سے ۶۲ء تک حیدر آباد میں) میں ریڈیو سے مسلسل وابستہ رہا ہوں۔ حیدر آباد سندھ آنے سے پہلے جن رسائل میں میرا کلام چھپتا رہا ہے' اس کی ایک طویل فہرست ہے۔ میں جن مشاعروں اور ادبی کانفرنسوں میں شریک ہوا ہوں' ان کی روداد ماہنامہ "افکار" (کراچی)' میری کتاب "شیخ ایاز" اور آفاق صدیقی کی کتاب "تاثرات" میں دیکھی جاسکتی ہے مثلاً ۴۹ء میں آل انڈیا ترقی پسند مصنفین کانفرنس (بھیمڑی۔ بمبئی) ۵۲ء میں کل پاکستان ترقی پسند مصنفین کانفرنس (کراچی) اور ۵۳ء میں کل پاکستان سندھی اردو ادبی کانفرنس (سکھر) وغیرہ' اللہ تعالیٰ نے چونکہ آواز بھی اچھی دی ہے اور ترنم بھی۔۔۔ اس لیے یہ "نام نہاد شاعر" خدا کے فضل سے تحت اللفظ بھی پڑھنا جانتا ہے اور ترنم سے بھی۔۔۔ اس لیے یہ کہنا کہ اسے مشاعروں میں سنا نہیں جاتا تھا۔۔۔ غور طلب ہے۔

حیدر آباد سندھ آنے سے پہلے تک میری مختصر ترین نظمیں "ایک مصرعہ۔۔ ایک نظم" (مطبوعہ "ادب لطیف" فروری ۵۲ء اور اس کے بعد) اور طویل ترین نظمیں "شعلہ بے دود" (ادب لطیف جولائی ۵۲ء) اور "بنگال[1] سے کوریا تک" جو تقریباً تین سو اشعار پر مشتمل ہے' مختلف پاکستانی رسائل میں بالاقساط شائع ہونے کے بعد "شاہراہ" (دہلی) کے سالنامے مارچ ۵۴ء میں بھی شائع ہو چکی تھی (اب یہ نظم انگریزی' ہندی اور سندھی وغیرہ میں بھی ترجمہ ہو چکی ہے) اس کے علاوہ ۵۲ء سے ۵۵ء تک ماہنامہ "افکار" اور "مشرب" کراچی میں مختلف ادبی کتب پر میری تنقیدیں' تبصرے اور مباحث بھی چھپتے رہے (جو میری کتاب "شخص و عکس" میں شامل ہیں) مزید برآں ۵۱ء سے ۵۵ء تک مرزا ادیب کے مرتب کیے ہوئے سال بہ سال "بہترین ادب" کے سلسلے بھی گواہی دیں گے کہ اس "نام نہاد شاعر" کا کلام ادبی دنیا میں کس نگاہ سے دیکھا جاتا تھا (پھر ۶۲ء تک اس نے جو کچھ لکھا' ان تخلیقات سے بھی اس کی شہرت اور عزت میں اضافہ ہی ہوا۔ کبھی توفیق ہو تو ڈاکٹر ساجد امجد پاکستان ہی کے ادبی رسائل اٹھا کر دیکھ لیں۔ اور بہترین شاعری کے وہ انتخاب بھی جو ڈاکٹر وزیر آغا اور دوسرے اہل نظر نے مرتب کیے۔ اطلاعاً" عرض ہے ۵۹ء کو اس کی کتاب "آگ میں پھول" پر صدارتی ایوارڈ بھی دیا گیا) اس شاعر کو "نووارد" سمجھنا' ڈاکٹر ساجد امجد کی ادبی معلومات کی "بہترین مثال" ہے۔ لیکن اس سے ایسی بیچ حرکات منسوب کرنا کہ اس نے قابل اجمیری پر ریڈیو کے دروازے بند کروا دیئے اور اس طرح ان کی روزی کا وسیلہ چھین لیا' مشاعروں سے نام کٹوا کر ان کی شہرت کی راہ میں روڑے اٹکائے حتیٰ کہ انہیں راستے سے ہٹا دینے کے منصوبے بنائے اور بالآخر انہیں مار دیا۔۔۔ (اس ناول کی آخری سطور میں قابل صاحب کے جنازے میں شریک ہونے پر ڈاکٹر صاحب نے اسے اور چند دوسرے اہل قلم کو "قاتل" بھی لکھ دیا ہے۔ یہ ایسے شرمناک الزامات اور ایسے غیر قانونی نفرت انگیز اور قابل گرفت الفاظ ہیں کہ ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ منزل آتی' ڈاکٹر ساجد

---

[1] "بنگال سے کوریا تک" کے اشاعتی حوالے اس کتاب میں بھی دے دیئے گئے ہیں (مرتب)

امجد اپنے ایک دوست الیاس شاداں کے ہمراہ میرے گھر تشریف لے آئے۔ اسوقت نکہت بریلوی اور قمر ساحری بھی موجود تھے۔ تفصیلی باتیں ہوئیں اور مجھے اندازہ ہوا کہ وہ سادگی میں (TRAP) ہوئے ہیں۔ محض قابل صاحب کی محبت اور عقیدت میں ان سے یہ سب کچھ سرزد ہوگیا۔ محاورہ ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے اور عقیدت تو اس سے بھی آگے کی منزل ہے۔ میں نے ان کی آنکھوں میں ایک معصوم بیچارگی دیکھی اور جب ایک ان کہی معذرت ان کے ہونٹوں پر لرزتی نظر آئی اور وہ مجھ سے گلے ملنے آگے بڑھے تو میں نے بھی اپنا سینہ کشادہ کردیا---- میں اس احساس کو سمجھ سکتا ہوں جب انسان سے انجانے میں کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے

لیکن تیر تو کمان سے نکل چکا تھا--- اس سے پہلے کہ کسی کا سینہ چھلنی ہو جائے' میں مستقبل کے مورخ کے سامنے "حقیقت پس پردہ" رکھ دینا چاہتا ہوں--- اس لیے بھی--- کہ ادبی صحافت کے نام پر بے ادبی کے مظاہرے اور اپنے احساس کمتری کے سبب' کسی بڑی شخصیت کے سہارے' دوسروں کی کردار کشی' ایسے نفسیاتی امراض ہیں جن کا سدباب نہ کیا جائے تو پورا ادبی معاشرہ پراگندہ ہو کر رہ جائے گا۔

ڈاکٹر ساجد امجد "اپنی معلومات" کی روشنی میں لکھتے ہیں۔

"وہ گروپ جو قابل کے خلاف تھا لیکن کمزور تھا' اپنے طاقتور حریف' قابل کو شہر میں دیکھ کر "شاعر دوستی" میں نہیں بلکہ "قابل دشمنی" میں اس کے ساتھ ہولیا۔"

اس سلسلے میں انہوں نے غالباً "حسب ہدایت" کچھ ادھورے نام لیے۔ چونکہ یہ بات سرے سے غلط ہے' اس لیے میں پورے نام کے ساتھ ان حضرات کا تعارف بھی کرائے دیتا ہوں۔

عثمان عرفانی (افسانہ نگار' نقاد اور صحافی) لاہور میں روزنامہ "مغربی پاکستان" سے وابستہ رہے۔ آج کل روزنامہ "مساوات" کراچی سے متعلق ہیں' قدیر غوثی (افسانہ نگار)' رضوان صدیقی (افسانہ نگار)' قاصد عزیز (شاعر)' سلطان جمیل نسیم (افسانہ نگار)' نعمت اللہ شیخ (شعر و ادب کے دلدادہ' نہایت مہذب دوست) اور اختر انصاری

اکبر آبادی (مرحوم)

افسوس ہے کہ ڈاکٹر ساجد امجد یا محسن بھوپالی نے "مرحوم" کو بھی نہ بخشا۔ اس کا بھی مذاق اڑایا۔ حالانکہ یہ وہ شخص ہے جس کے رسالے "نئی قدریں" کی وساطت سے کتنے ہی نئے لکھنے والے دنیائے ادب میں روشناس ہوئے۔ کتنے ہی بزرگوں کا کلام محفوظ ہوا اور دوسروں تک پہنچا۔ جو سندھی اور اردو ادیبوں کے درمیان زندگی بھر ایک پل بنا رہا۔ "نئی قدریں" پاکستان میں اردو کا پہلا رسالہ ہے جس نے "سندھی ادب نمبر" شائع کیا۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ قابل اجمیری پر ان کی زندگی میں پہلا مضمون بھی "شاعر سندھ" کے عنوان سے اختر مرحوم کے رسالے "مشرب" (کراچی) میں شائع ہوا تھا۔ مئی ۵۵ء کے شمارے میں پروفیسر فرمان فتح پوری کا یہ مقالہ اب بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ ("طالب علم ڈائجسٹ" کے قابل نمبر میں ان کا دوسرا مضمون ہے جو قابل صاحب کے انتقال کے بعد لکھا گیا)۔ اسی طرح "قابل کے سو شعر" کے پہلے ایڈیشن (مطبوعہ ۵۵ء) پر "روح انتخاب" کے عنوان سے خود اختر انصاری مرحوم کا مضمون "مشرب" ہی میں ستمبر ۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔

ان مضامین میں قابل صاحب کی شاعری کے محاسن بتاتے ہوئے، حکومت سندھ سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ ان کے علاج کے سلسلے میں کیے گئے وعدوں کو پورا کیا جائے۔

قابل صاحب کا کلام "مشرب" میں بھی چھپتا تھا اور "نئی قدریں" میں بھی۔ "مرکز اردو ادب" کی تنقیدی نشستوں میں بھی قابل صاحب شریک ہوتے تھے جس کے روح رواں اختر انصاری اکبر آبادی اور سلطان جمیل نسیم تھے۔ "نئی قدریں" کے متعدد شماروں میں ان نشستوں کے حوالے موجود ہیں۔

اور جب قابل صاحب کا انتقال ہوا تو اختر مرحوم نے "نئی قدریں" (دسمبر ۶۲ء) میں جو اداریہ لکھا وہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس "دشمن قابل" کو قابل اجمیری سے کتنی محبت تھی۔ (اقتباس ملاحظہ کیجئے)

"..... قابل' وادیِ مہران کے غزل گو شعراء کی آبرو تھے۔ ان کی وفات نے ایک خلا پیدا کردیا ہے۔۔ کاش ان کا مجموعہ کلام "دیدۂ بیدار" کی اشاعت کا کوئی معقول انتظام ہو سکے۔۔۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے ریجنل سیکریٹری قتیل شفائی صاحب نے قابل مرحوم کے متعلقین کی امداد کے لیے ایک ہزار روپے کی سفارش مرکزی گلڈ سے کی تھی جسے سیکریٹری جنرل اور سینٹرل سیکریٹری جمیل الدین عالی نے منظور کرلیا ہے' گلڈ کے اس اقدام کو وادیِ مہران کے ادیبوں اور شاعروں نے بہت سراہا اور وہ اس بروقت توجہ کے شکر گزار ہیں۔"

اس کے بعد قابل صاحب پر پہلا مضمون بھی اختر انصاری مرحوم ہی نے لکھا (نئی قدریں فروری ۶۳ء) جب کہ "بعد از مرگ واویلا" کرنے والوں سے یہ بھی نہ ہو سکا۔

قابل نمبروں کی تاریخیں شاہد ہیں کہ "محبت کے کس دعویدار" نے کب ان کے بارے میں کیا لکھا۔ حتیٰ کہ "زاویے" جو ۶۵ء سے ۶۷ء تک محسن کے دست راست حسن ظہیر کی ادارت میں نکلتا رہا اور جس کی مجلس مشاورت میں خود محسن بھوپالی بھی شامل تھے۔۔۔ قابل صاحب پر کوئی "گوشہ" تو کجا ان پر کوئی مضمون بھی شائع نہیں ہوا۔ البتہ خود محسن بھوپالی کا "گوشہ باتصویر"۔ "زاویے" (جنوری فروری ۶۶ء) میں قابل دید ہے۔

ذرا سوچیے۔۔۔ کون قابل کے واقعی قدرداں اور دوست تھے اور کون نمائشی۔۔؟ ان صداقتوں کی روشنی میں ان حضرات کو شہرت کی خاطر "قابل دشمن" قرار دینا کہاں تک درست ہے جن کے پاس خود اپنے ذرائع ابلاغ موجود تھے۔ میں بھی ۵۶ء اور ۵۷ء کے درمیان دوماہی "شعور" نکالتا رہا۔ پہلے عبدالعزیز خالد کی رفاقت میں' پھر شیخ ایاز کے ساتھ مگر اس کے صرف تین ہی شمارے شائع ہو سکے۔ اسی طرح کوکب جمیل بھی کچھ عرصے ہی ہفتہ وار "نئی دنیا" نکال سکے۔ اس میدان میں صرف اختر انصاری مرحوم کے قدم جمے رہے اور وہ تادمِ مرگ (۸۵ء) "نئی قدریں"

اختر انصاری اکبر آبادی کا انتقال ۱۸؍ اگست ۸۵ء کو ہوا (مرتب)

شائع کرتے رہے۔

جہاں تک دیگر اہل قلم کا تعلق ہے، ان میں بیشتر افسانہ نگار تھے، انہیں "قابل دشمنی" سے کیا مل جاتا؟ ان کا مسئلہ مشاعرہ تھا نہ قابل صاحب سے شاعرانہ مسابقت۔

دراصل یہ مسئلہ محسن بھوپالی کا تھا۔ اختر مرحوم سے ان کی مخاصمت رائٹرز گلڈ کے سبب تھی۔ اختر صاحب چونکہ ایک سینئر ادیب و شاعر تھے اور پھر ایک رسالے کے ایڈیٹر بھی، اس لیے گلڈ میں بھی ان کی اہمیت زیادہ تھی۔ اکثر لکھنے والے انہیں "بابائے اردو سندھ" کہنے لگے تھے اور محسن صاحب کو یہ بات گوارا نہیں تھی۔

دوسرا مسئلہ "میں" تھا جس کے بظاہر وہ بہت "دوست" تھے۔ سلطان ہوٹل میں بھی ہمارے ساتھ بیٹھتے تھے اور پھر جب ہم نے "ارژنگ" بنائی تب بھی وہ ہمارے ساتھ تھے۔ اور جب "ارژنگ" کے زیر اہتمام (۲۹ر نومبر ۵۹ء کو) ارشاد علی کی کہانی پر میرے لکھے ہوئے ڈرامے "اندھیرے اجالے" میں، جہاں، محمد علی (فلم اسٹار)، مصطفیٰ قریشی (فلم اسٹار)، ارشاد علی، عثمان عرفانی، طاہر رضوی اور خود میں نے مختلف کردار ادا کیے تھے--- وہاں محسن بھوپالی نے ایک "مکار مولوی" کا کردار نہایت عمدگی سے ادا کیا تھا۔

اسی زمانے میں سندھ یونیورسٹی میں پاک امریکن کلچرل فیسٹیول منایا گیا۔ اس کے میوزیکل پروگرام میں شعبہ اردو کی پروفیسر مسز خان کی نگرانی میں قیوم عارف کے زیر ہدایت قابل اجمیری کی غزلیں ٹیبلو کے انداز میں پیش کی گئیں، منتخب غزلوں کو ٹیبلو کا روپ میں نے دیا تھا۔ میرے اناؤنسمنٹ کے ساتھ اس میوزیکل ٹیبلو کے آڈیو کیسٹ عرصے تک مسز خان کے پاس محفوظ رہے، شاید اب بھی ہوں۔ "قابل کے سو شعر" کا دوسرا ایڈیشن بھی انہیں دنوں شائع ہوا تھا۔ وہ نسخہ اب بھی میرے پاس موجود ہے، جو قابل صاحب نے نہایت محبت کے ساتھ ۸ر مئی ۵۹ء کو مجھے دیا تھا۔

ریڈیو پاکستان حیدر آباد کے آل پاکستان مشاعروں میں بھی قابل صاحب حصہ لیتے

تھے۔ غالباً ۵۶ء یا ۵۷ء میں ایک کل پاکستان طرحی مشاعرہ ہوا تھا۔ اس میں حضرت صوفی تبسم، پروفیسر عابد علی عابد، قیوم نظر، ناصر کاظمی اور چند دوسرے بیرونی شعرا کے علاوہ مقامی شعرا میں پروفیسر عظیم عباسی، قابل اجمیری اور پروفیسر اے۔کے۔ضیاء نے بھی حصہ لیا تھا۔ غالب کی زمین میں قابل صاحب کا یہ شعر مجھے اب تک یاد ہے۔

مقامات فکر و نظر کون سمجھے
یہاں لوگ نقش قدم دیکھتے ہیں

پروفیسر عابد علی عابد اور ناصر کاظمی کے اشعار بھی سنا دوں، شاید میری بھی ترجمانی ہو جائے۔

انہیں کے جگر میں اترتا ہے تیشہ
دل سنگ میں جو صنم دیکھتے ہیں (عابد)

نہ سمجھیں گے وہ نغمہ گر میری لے کو
جو آواز کا زیر و بم دیکھتے ہیں (ناصر)

ہمارے دوست پروفیسر اے۔کے۔ضیاء کا مقطع بھی خوب ہے۔

ضیاء اپنی فطرت ہے باریک بینی
جو کوئی نہ دیکھے، وہ ہم دیکھتے ہیں

ان دنوں حمید نسیم یا حفیظ ہوشیارپوری اسٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ لیکن ریڈیو کا کوئی ملازم شاعر شریک مشاعرہ نہیں تھا۔ نظامت کے فرائض میں نے انجام دیے تھے۔

۵۹ء سے "یادگار" مشاعروں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا۔ یہ "کل پاک و ہند مشاعرے" واقعی حیدرآباد کی تاریخ کے ہمیشہ یاد رہنے والے مشاعرے ہیں۔ ان مشاعروں میں بھی قابل صاحب نے برابر حصہ لیا۔ پہلا مشاعرہ ۲ر مئی ۵۹ء کو ہوا۔ اس کا انتخاب "دود چراغ محفل" کے نام سے، میں نے اور مرزا عابد عباس صاحب (پرنسپل سٹی کالج) نے کیا تھا جو مکتبہ شعور کے زیراہتمام شائع ہوا۔ مشاعروں کے

بارے میں میری کیا رائے ہے۔ اس کتاب کے "حرف آغاز" میں پڑھی جاسکتی ہے۔ قابل صاحب کی دو غزلیں اس انتخاب میں شامل ہیں۔

دوسرا مشاعرہ ۹؍اپریل ۶۰ء کو ہوا۔ اس کا انتخاب "بوئے گل نالۂ دل" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس میں قابل صاحب کی تین غزلیں شامل ہیں۔

تیسرا مشاعرہ غالباً ۶۱ء میں ہوا تھا۔ ان دنوں چونکہ میں کسی مشاعرے کے لیے ہندوستان گیا ہوا تھا۔ اس لیے یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ایسے مشاعرے آمدنی کا وسیلہ بھی ہوتے تھے۔ قابل صاحب سبھی میں شریک رہے اور محسن بھوپالی بھی۔

محسن صاحب اور میرے درمیان کشیدگی اسوقت پیدا ہوئی جب ان کے پہلے مجموعہ کلام "شکست شب" کی تقریب رونمائی (نومبر ۶۱ء) منعقد ہوئی اور ان کی فرمائش پر میں نے بھی مضمون لکھا۔۔۔ بعض اشعار میں چونکہ زبان کی فاش غلطیاں تھیں' اس لیے میں نے دو تین کی نشاندہی بھی کردی۔ مگر رونمائی کی تقریب کو مدنظر رکھتے ہوئے' محفل میں صرف توصیفی حصہ سنایا۔ البتہ ریڈیو کے ادبی پروگرام میں پورا مضمون پڑھا۔ اس بات پر محسن صاحب ناراض ہوگئے۔ میں انہیں سمجھاتا رہا کہ جب کتاب چھپ جاتی ہے تو غلطی کتاب کا مقدر بن جاتی ہے' میں اگر اشارہ نہ کرتا تو لوگ اسے میری لاعلمی سمجھتے۔ ان غلطیوں کی وجہ سے مصرعے وزن سے گر گئے ہیں' گرفت میں ضرور آئیں گے۔ مگر انہوں نے کتاب میں غلطیاں درست کرنے کی بجائے ریڈیو سے میرا مضمون حاصل کیا اور آخری پیراگراف نکال کر اپنی طرف سے کچھ جملے بڑھا دیئے اور اسے کراچی کے ماہنامہ "سات رنگ" کو بھیج دیا۔ نومبر ۶۲ء کے شمارے میں جب میں نے اپنا ادھورا مضمون دیکھا تو مجھے غصہ آگیا' ان کی یہ حرکت ادبی اخلاقیات کے خلاف تھی' میں نے ان کی سرزنش کی۔۔۔ وہ میرے خلاف ہوگئے۔[1]

دلچسپ بات یہ ہے کہ ۸۹ء میں جب "شکست شب" کا دوسرا ایڈیشن چھپا تو "اپنی سمجھ" کے مطابق انہوں نے تین میں سے ایک غلطی درست کردی۔ باقی دو اب

---

[1] (اس وقت قابل صاحب کا انتقال ہوئے ایک ماہ گزر چکا تھا)

بھی موجود ہیں۔ میں آج بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔ غلطیاں نوٹ کیے دیتا ہوں' اہل نظر خود فیصلہ کرلیں۔

۱۔ بے وجہ مسکرانا کیا معنی (پہلا ایڈیشن۔ صفحہ۴۸)
بے سبب مسکرانا کیا معنی (دوسرا ایڈیشن۔ صفحہ۴۸)

۲۔ ان حقائق کو سامنے رکھ کر
اپنا ہر لائحہ عمل بدلو

خط کشیدہ ترکیب کی غلطی اب بھی ان کی سمجھ میں نہیں آئی' جس کی وجہ سے مصرعہ وزن سے گر گیا ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں بھی یوں ہی رہنے دیا گیا۔ پہلے ایڈیشن میں یہ شعر صفحہ ۲۴ پر تھا' دوسرے ایڈیشن میں صفحہ ۲۵ پر ہے۔

۳۔ دیدۂ شوق غزالوں کی طرح آوارہ (صفحہ ۸۳)

میں نے مشورہ دیا تھا کہ دیدہ بھٹکنا محاورہ نہیں ہے۔۔ "غزال" کی رعایت سے "نگہ شوق" ہونا چاہیے۔ یہ نازک بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ چنانچہ دوسرے ایڈیشن میں بھی تبدیلی نہیں کی۔ (یہ مضمون میری کتاب "شخص و عکس" میں موجود ہے۔ اب بھی پڑھا جاسکتا ہے۔) صفحہ

ڈاکٹر ساجد امجد نے کتاب کی تقریب رونمائی اور میرے مضمون کا ذکر اپنے ناول میں بھی کیا ہے مگر محسن بھوپالی کے وکیل بن کر۔۔۔۔ اگر وہ میرا مضمون پڑھ لیتے تو شاید لہجہ کچھ اور ہوتا۔ انہوں نے محسن کی ہر بات کو "الہامی آیت" کی طرح قبول کرلیا اور اسے بھی محسن کی تاویل کے مطابق قابل صاحب کی مخالفت کا شاخسانہ سمجھ لیا۔ لکھتے ہیں۔۔۔

"محسن نے جس دبی دبی آواز میں اب تک قابل کی حمایت جاری رکھی ہوئی تھی' حریفان قابل کو اس کی یہ ادا گوارا نہ تھی۔ چنانچہ جب تک اس کی کتاب "شکست شب" منظر عام پر آئی تو ریڈیو پاکستان حیدر آباد سے اس کتاب پر "اختلافی

مضمون" پڑھا گیا۔ اس مضمون میں اپنے طور پر بعض مصرعوں پر اصلاح بھی فرمائی گئی تھی۔ مضمون نشر ہوا تو کھل کر اختلاف پیدا ہو گیا۔"

پھر لکھتے ہیں....

"محسن قابل نہیں تھے کہ کھانستے اور چپ چاپ ہو جاتے۔ انہوں نے کھل کر شاعر کی خبر لی، دونوں جانب سے ایک دوسرے کے خلاف مضامین، اخبارات اور رسائل میں شائع ہونے لگے، محسن ایک مضبوط شاعر تھے اور حیدر آباد کے ادبی حلقوں میں ایک مخصوص اثر رکھتے تھے--- سیاسی چالوں سے واقف تھے اور ہر مہرہ مناسب گھر میں چل سکتے تھے--- اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے قابل--- محسن کے قریب آ گئے۔"

یہ بالکل جھوٹ ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

دروغ گو را حافظہ نہ باشد

قابل صاحب کا انتقال ۳؍ اکتوبر ۶۲ء کو ہو چکا تھا جبکہ میرا "اختلافی مضمون" "سات رنگ" (نومبر ۶۲ء) میں شائع ہوا۔

محسن بھوپالی نے میرے خلاف سب سے پہلے جو مراسلہ لکھا تھا وہ فلمی ہفتہ وار "کردار" (کراچی) میں ۲۱؍ ستمبر ۶۳ء کو چھپا تھا اور اس کا تعلق بھی میرے "اختلافی مضمون" سے نہیں تھا بلکہ میرے ایوارڈ یافتہ نغمے---

کسی چمن میں رہو تم، بہار بن کے رہو

سے تھا۔ دراصل ۶۲ء میں فلم "آنچل" کے اس نغمے پر جب مجھے "بہترین نغمہ نگار" کا ایوارڈ ملا تو لاہور کے کچھ فلمی شاعر میرے خلاف ہو گئے۔ فلمی رسالوں میں مراسلہ بازی چلی۔ محسن بھوپالی نے موقع غنیمت جانا اور خود بھی مخالفت کرنے والوں میں شامل ہو گئے۔ یہ سارے واقعات قابل صاحب کے انتقال کے تقریباً ایک سال بعد کے ہیں۔

میرے خلاف ان کا دوسرا مراسلہ ستمبر ۶۳ء ہی میں، ماہنامہ "الشجاع" (کراچی)

میں شائع ہوا تھا جو شاعری میں ہیئت کے تجربے ''تثلیث'' (ثلاثی) کے موضوع پر ہندوستانی نقاد اثر فاروقی کے مضمون (مطبوعہ الشجاع جون ۶۳ء) کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

میں نے ان کے اشعار پر جو اعتراضات کیے تھے' انہیں تو وہ آج تک غلط ثابت نہ کر سکے البتہ اپنے دل کی بھڑاس یوں نکالی کہ دوسروں کو مجھ سے بدگمان کرنے کی درپردہ کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ کراچی میں سلیم احمد اور قمر جمیل سے' میری جو ادبی نوک جھونک رہتی تھی (ہم لوگ ریڈیو کے ساتھی بھی تھے) اس کا بھی انہوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور ترقی پسندی کے دعوے کے باوجود شمیم احمد سے بھی سازباز کر لی (یہ پوری داستان ''شخص و عکس'' میں موجود ہے)۔ ادھر حیدر آباد میں ایک تنقیدی نشست کا سہارا لے کر قابل صاحب کو بھی میری طرف سے بدگمان کرنے لگے حالانکہ ادبی مباحث میں اختلاف رائے ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس کو ذاتی مخالفت کا رنگ دینا' کوتاہ نظری ہی نہیں' ادبی سیاست کی بدترین مثال ہے۔

ایک طرف تو محسن صاحب میرے خلاف یہ حرکتیں کر رہے تھے' دوسری طرف ''شہرت پسندی'' کا یہ عالم تھا کہ میرا ''اختلافی مضمون'' جو ''سات رنگ'' میں ادھورا شائع کیا گیا تھا' جب احمد ندیم قاسمی صاحب کے رسالے ''فنون'' (اکتوبر/ نومبر ۶۴ء) میں پورا شائع ہو گیا تو اس سے کچھ تعریفی جملے نکال کر اپنے قطعات کے مجموعے ''جستہ جستہ'' (مطبوعہ ۶۹ء) کے آخری صفحات میں چھپوا دیئے مگر ''فنون'' کے حوالے سے' (ملاحظہ ہو صفحہ ۴۷) میرے جملوں پر میرا نام نہیں دیا۔ یہ ان کی دوسری ادبی بد اخلاقی تھی۔

جو شخص شہرت کا اتنا دلدادہ ہو—— وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔

آیئے اب ان مضامین کی طرف جن کی روشنی میں ڈاکٹر ساجد امجد نے قابل اجمیری کی زندگی کا مطالعہ کیا اور حیدر آباد کے ادبی ماحول اور ادبی سیاست سے شناسائی حاصل کی۔ جہاں تک اجمیر کے اہل قلم کا تعلق ہے ان کے کسی مضمون سے حیدر آباد

میں ''قابل دشمنی'' کا کوئی سراغ نہیں ملتا حالانکہ ان حضرات میں حضرت برق اجمیری جیسے بزرگ، خادمی اجمیری جیسے قابل کے بچپن کے ساتھی، پیکر واسطی جیسے قابل کے ہم عصر اور مخلص دوست اور احمد رئیس جیسے نوجوان اور قابل کے پرستار شامل ہیں۔ محترمہ بیگم قابل نے بھی اپنے انٹرویو میں کوئی ایسا اشارہ نہیں کیا جس سے قابل صاحب کے دشمنوں کی طرف ذہن منتقل ہوتا۔ توصیف چغتائی بھی قابل صاحب سے کبھی نہیں ملے۔ انہوں نے محض اپنی محبت اور عقیدت کی بنا پر (قابل صاحب کے انتقال کے بعد) ان کی بیگم سے انٹرویو لیا اور ایک مضمون کی صورت میں لکھ کر روزنامہ ''جنگ'' میں چھپوا دیا۔ بعد ازاں یہ مضمون ''طالب علم'' ڈائجسٹ کے قابل نمبر (فروری ۷۰ء) میں شائع کیا گیا۔ اس مضمون میں کوئٹہ سینی ٹوریم میں ان کے علاج، شادی، بیٹے کی پیدائش اور انتقال کے لمحات کی تفصیل دی گئی ہے اور بس۔۔۔ اس کے بعد صرف دو مضامین ایسے رہ جاتے ہیں، جن سے ڈاکٹر ساجد امجد نے حیدر آباد کے ''ادبی ماحول اور ادبی سیاست'' کو سمجھا ہوگا۔

ایک محسن بھوپالی کا مضمون ''چند یادیں'' (اس کی اشاعتوں کی تفصیلات میں دے چکا ہوں)۔ دوسرا انوار احمد زئی کا مضمون ''جوہر قابل کا نوحہ'' جو ''فکر و عمل'' کے قابل نمبر (۳۰ر ستمبر ۷۷ء) میں شائع ہوا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں ان مضامین کے بارے میں کچھ عرض کروں، یہ بتا دینا ضروری ہے اس ناول نما سوانح حیات میں ''قابل دشمنی'' کی جو من گھڑت اور شرمناک داستان پیش کی گئی ہے وہ قابل صاحب کی زندگی کے آخری سات سال سے متعلق ہے، یعنی ۵۵ء سے ۶۲ء تک، جس کے دوران وہ کچھ عرصہ کوئٹہ سینی ٹوریم میں بھی رہے (مکتوب قابل اجمیری، مورخہ ۱۰ر اگست ۵۶ء مطبوعہ ''نئی قدریں'' اکتوبر ۵۶ء) اور ۶۰ء اور ۶۱ء کے درمیان کچھ عرصہ (بحوالہ بیگم قابل)

۵۵ء میں جب ریڈیو پاکستان حیدر آباد قائم ہوا تو انوار احمد زئی (ڈائریکٹر اسکولز۔ کراچی) کی عمر گیارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ (تاریخ پیدائش، ۱۸ر ستمبر ۴۴ء۔ بحوالہ

"درد کا رشتہ" مطبوعہ ۶۸ء)

ڈاکٹر ساجد امجد تو سات سال کے تھے جنہوں نے یہ پورا ناول "چشم دید واقعات" کے انداز میں لکھ دیا اور انوار احمد زائی جو قابل صاحب کی زندگی میں پندرہ سولہ سال کے ہوں گے ایسے انداز میں "نوحہ" لکھ گئے گویا ہر منظر کا پس منظر جانتے ہوں۔

میں تو ۶۰ء ہی سے فلم انڈسٹری کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ ۶۲ء میں جب مجھے "بہترین نغمہ نگار" کا ایوارڈ ملا اور کئی فلموں کے کانٹریکٹ بھی۔ تو میں نے ریڈیو کی ملازمت چھوڑ دی اور زیادہ تر لاہور میں رہنے لگا۔ ۶۳ء میں مجھے فلم "دامن" پر اور ۶۴ء میں فلم "کنیز" پر ایوارڈ ملے۔ اسی دوران میں نے بحیثیت فلمساز اپنی فلم "لوری" شروع کر دی۔ ۶۶ء میں جب یہ فلم ریلیز کے مراحل میں داخل ہوئی تو میں حیدر آباد ہی چھوڑ چکا تھا۔

قابل صاحب کے انتقال کے بعد انوار احمد زئی خدا جانے کس کس تجربے سے گزرے کہ ان کے مضمون میں حیدر آباد کا ماحول انتہائی گھناؤنا دکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ محسن بھوپالی اور ان کے رفقاء وہیں تھے "مجلس یادگار قابل" بھی قائم ہو چکی تھی۔ ۶۳ء میں "دیدۂ بیدار" اور ۶۶ء میں "خون رگ جاں" بھی شائع ہو گیا تھا۔ ۶۷ء میں کچھ نوجوانوں نے "گہوارہ" کا چھوٹا سا (ضخامت ۵۰ صفحات) "قابل نمبر" بھی نکال لیا تھا مگر انوار احمد زئی نے "جوہر قابل کا نوحہ" نہ اس میں لکھا اور نہ ۷۰ء میں طالب علم ڈائجسٹ کے "قابل نمبر" میں بلکہ قابل صاحب کے انتقال کے پندرہ سال بعد "فکر و عمل" (۳۰ر دسمبر ۷۷ء) میں لکھا۔ پھر ۸۶ء میں جب کسی اور ادارے (ثانی کمیونی کیشنز) نے "دیدہ بیدار" کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مقالے کی بجائے انہوں نے اپنا "دو صفحاتی" مضمون اس میں شامل کر دیا اور یوں اپنی محبت کا ثبوت دے دیا۔

قابل غور بات یہ ہے کہ اس ایڈیشن میں قابل صاحب کی صرف (۶۵) غزلیں ہیں پہلے ایڈیشن کی چھ نظمیں اور (۱۷) قطعات نکال دیئے گئے۔ اس کے علاوہ پہلا ایڈیشن "قابل اجمیری کی روح مطمئنہ کے نام" معنون تھا (ظاہر ہے کہ یہ بیگم قابل کی خواہش ہوگی)

دوسرے ایڈیشن میں اس انتساب کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔۔۔کیوں؟ شاید انوار احمد زئی ہی بتا سکیں۔

اس مضمون میں انہوں نے کسی "گلے باز شاعر' نام نہاد استاد' اشتہار باز مدیر اور اپنے سر پر سفید بالوں کی کلغی سجانے والے کسی دانشور" کو بھی قابل صاحب کے قاتلوں میں شمار کیا ہے (محسن بھوپالی کے فراہم کردہ' رفیق ریواڑوی کے انٹرویو میں بھی قابل کے چند مخالفین کے نام ہیں' ممکن ہے' انوار احمد زئی کا اشارہ ان کی طرف ہو) خیر ان کا ایک جملہ اور بھی دعوت فکر دیتا ہے "ریڈیو کا جلوہ دکھا کر تازہ غنچوں کو چوسنے' کا عمل آج بھی جاری ہے" میں ان دنوں چونکہ لاہور میں تھا اس لئے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا۔

قابل صاحب کے بارے میں نکلنے والے یہ سارے رسائل اور مضامین میری غیر موجودگی میں شائع ہوئے' جہاں تک انوار احمد زئی کا تعلق ہے' انہوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ قابل صاحب کی زندگی میں وہ ہائی اسکول پاس کر کے نئے نئے کالج میں داخل ہوئے تھے۔ پھر لڑکپن کی شرارتوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ ہوٹل بازی کے شوق میں وہ کسی تنومند' خوش لباس اور خوش خوراک شخص کے ہتھے چڑھ گئے۔ وہ انہیں کھلاتا پلاتا اور یہ اس کے کام آتے' رات گئے تک اس کے ساتھ رہتے اور ادبی محفلوں اور مشاعروں میں ہلڑ مچاتے۔۔۔ سارے مضمون میں انہوں نے اپنی ان ہی ہلڑ بازیوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ جس شخص کے زیر اثر تھے' اسے ہر جگہ اپنا "قائد" لکھا ہے مگر اس کا یا اپنے کسی ساتھی کا۔۔۔ حتیٰ کہ کسی شاعر کا تخلص بھی نہیں لکھا۔

غالباً محسن بھوپالی (مشیر خاص) نے ڈاکٹر ساجد امجد کو کچھ اور باور کرایا اور انہوں نے اپنے ناول میں اس کا نام "شیخ" لکھ دیا اور اسے بھی قابل صاحب کے مخالفین یا "قابل دشمنوں" میں شامل کر لیا۔

انوار احمد زئی نے اپنے لڑکپن کی یادیں کہاں تک درست لکھیں' اس کا اندازہ اسی مضمون میں اس مشاعرے کے تذکرے سے ہو جاتا ہے جس کا ذکر محسن بھوپالی نے بھی کیا ہے۔ اسے اپنے اعمال کا تضاد کہیئے کہ قدرت کی کرشمہ سازی' ساری افسانہ

طرازیوں کے باوجود حقیقت نمایاں ہو گئی۔ انوار احمد زئی لکھتے ہیں۔

"اس بار جام شورو کا رخ تھا۔ وہاں بھی صدارت اسی مغنی' سیدھے سادھے' مگر باوقار اور بااوصاف شاعر کو کرنا تھی۔۔۔ ہمارا کام ہلڑبازی تھا۔ وہ اودھم دھاڑ مچائی' وہ ہنگامہ کیا کہ صدر مجلس رو پڑے۔۔۔ یہ الگ بات کہ دوسرے سامعین کے اصرار پر صدر کو دوبارہ بلوا لیا گیا۔"

اب محسن بھوپالی کے مضمون کا اقتباس ملاحظہ کیجئے۔ اس میں کسی "قائد" کا ذکر ہے نہ کسی "شیخ" کا۔۔۔ ہلڑبازی کا بھی حوالہ نہیں۔۔۔ مضمون شروع ہی اس طرح ہوتا ہے۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ مشاعرہ شباب پر تھا کہ اچانک صدر مشاعرہ نے مائیک سنبھالا اور ایک رندھی ہوئی آواز نے فضا میں سوگواری کی سی کیفیت پیدا کردی۔ "حضرات! میری صدارت پر میرے ایک ہم عصر شاعر کو اعتراض ہے' اس لیے منتظمین کے کہنے پر صدارت سے دست بردار ہوتا ہوں اور۔۔۔ اور میں گھر جا رہا ہوں۔"

اور اس سے پہلے کہ قابل صاحب گھر جاتے' محسن بھوپالی نے آگے بڑھ کر مائیک سنبھالا اور ایک تقریر کر ڈالی۔۔۔ اور مشاعرہ دوبارہ قابل صاحب کی صدارت میں جاری ہو گیا۔

محسن صاحب کا یہ مضمون جب تیسری بار (میری تصویر کے ساتھ) ۵ر نومبر ۸۵ء کو روزنامہ "پاسبان" (حیدر آباد) میں چھپا تو سید کاظم رضا (ایڈیٹر "فکر و عمل" مرتب۔ "قابل نمبر" ۳۰ر ستمبر ۷۷ء) نے دوسرے ہی ہفتے یعنی ۱۲ر نومبر ۸۵ء کو اسی اخبار میں ایک جوابی مضمون لکھا۔۔۔ تھوڑا سا اقتباس اس کا بھی پڑھ لیجیے۔

"محسن صاحب نے اپنے مضمون میں (جام شورو کے) جس مشاعرے کا ذکر کیا ہے' اس مشاعرے کے منتظمین نے محسن کے ممدوح (چونکہ محسن صاحب نے میرا نام نہیں لیا تھا اس لیے کاظم رضا نے بھی نام کی بجائے "ممدوح" لکھا ہے) سے رابطہ

پیدا کر کے انہیں بہ اصرار اس امر پر آمادہ کیا تھا کہ وہ مذکورہ مشاعرے کی صدارت قبول کر لیں۔ مگر محسن کو یہ بات گوارا نہ ہوئی۔ انہوں نے اندر ہی اندر ساز باز کر کے صدارت کی مسند پر قابل اجمیری مرحوم کو بٹھا دیا۔ جب محسن کے ممدوح مشاعرہ گاہ پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جس مشاعرے کی صدارت کے لیے انہیں مجبور کیا گیا تھا' وہاں کسی چال کے تحت قابل اجمیری مرحوم کو صدر بنا دیا گیا۔ محسن بھوپالی کے ممدوح نے اس طرز عمل کے خلاف احتجاج کیا تھا مگر احتجاج کا رخ ہرگز قابل اجمیری مرحوم کی طرف نہیں تھا بلکہ وہ اس غلط روش کا منتظمین کو احساس دلانا چاہتے تھے۔ محسن صاحب کے ممدوح نے احتجاج بھی کیا اور پھر بعد میں قابل اجمیری مرحوم کی صدارت میں کلام بھی سنایا۔ گویا انہوں نے منتظمین کی بد عہدی اور ادبی توڑ جوڑ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنے رفیق اور ہم عصر شاعر کی عزت و توقیر بھی کی۔ محسن بھوپالی چونکہ اس زمانے میں اپنے ممدوح کے خلاف اپنے دل میں نفرت و اختلاف کا ایک سمندر رکھتے تھے' انہوں نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے اپنے ممدوح کے احتجاج کا رخ قابل اجمیری کی ذات کی طرف موڑ کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں قابل اجمیری مرحوم کی ذات سے کوئی ہمدردی یا محبت نہیں تھی۔"

کاش ناول لکھنے سے پہلے ڈاکٹر ساجد امجد یہ مضمون بھی پڑھ لیتے اور پھر کوئی تاثر قائم کرتے۔ کاظم رضا صاحب' نہ صرف اس مشاعرے کے بلکہ اس تنقیدی نشست کے بھی عینی شاہد ہیں جس کا ذکر محسن صاحب نے بھی کیا۔ مگر محسن صاحب اس کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

"مجھے وہ تنقیدی نشست بھی یاد ہے جہاں شہر کے منتخب شعراء اور ادیب جمع تھے۔ قابل صاحب نے اپنی غزل تنقید کے لیے پیش کی اور ایک شاعر اور ان کے چند ساتھیوں نے تابڑتوڑ حملے کر دیے' جوش تنقید میں نہیں بلکہ جوش تنقیص میں شاعر صاحب' قابل کے ایک شعر کو "جوں کا توں" باقی صدیقی کا شعر بتا گئے اور اس طرح قابل صاحب کا دل توڑ کر رکھ دیا۔"

اس تنقیدی نشست کی رپورٹ بہت ہی تفصیل کے ساتھ ہفتہ وار ''رہنما'' میں ۱۰راگست ۶۲ء کو شائع ہوئی تھی' ساجد امجد صاحب نے اپنے ''مشیر خاص'' کی ''رہنمائی'' میں اسے بھی توڑ مروڑ دیا۔ سب سے پہلی تحریف انہوں نے یہ کی کہ ایک مطبوعہ رپورٹ کی گفتگو بھی ''ادھورے ناموں'' سے دی جب کہ محسن صاحب اور ان کے بعض ساتھیوں کے نام پورے دیئے گئے ہیں۔ اس ''پردہ پوشی'' کی مصلحت سمجھ میں نہیں آئی۔ دوسری بات یہ کہ رپورٹ کے مرتب کرنے والے ادیب قدیر غوثی پر ترمیم و اضافہ کا الزام لگایا۔ سبھی جانتے ہیں کہ گفتگو یا زبانی بحث' جو ٹیپ بھی نہ کی گئی ہو' لفظ بہ لفظ نوٹ نہیں کی جا سکتی ـــــ اس پر ''بدگمانی'' آدمی کے مزاج کا پتہ دیتی ہے۔ تیسری بات جو بہت زیادہ قابل اعتراض ہے' یہ کہ انہوں نے قابل صاحب کی زبان سے ایسے کلمات منسوب کیے' جو ان کے مزاج کے بالکل خلاف تھے ـــــ پورا مکالمہ ہی پڑھ لیجے۔

''محسن بھوپالی نے ایک روز قابل سے کہا کہ اس کا جواب آئندہ پرچے میں وہ لکھیں گے ـــــ قابل نے ہنس کر کہا ـــــ آپ کو یا مجھے شاعر کو جواب دینا چاہیے۔ یہ قدیر غوثی وغیرہ چھُٹ بھیے ہیں' اس کے لیے ضیا اکبر آبادی یا منذر حسین سے کہہ دیں گے۔''

اس طرح انہوں نے اپنے ساتھیوں کو بھی ''چھُٹ بھیا'' وغیرہ کہہ دیا ـــ کیا قابل صاحب کا یہ لہجہ ہو سکتا ہے؟

اس تنقیدی نشست کا ذکر سید ارتضاء عزمی نے بھی اپنے مضمون ''کچھ باتیں ـ کچھ یادیں'' میں کیا ہے۔ یہ مضمون ساجد امجد کے ماخذات میں شامل نہیں ہے۔ اس کا حوالہ میں دے رہا ہوں تاکہ مزید تضادات اور لکھنے والوں کی ذہنیت کا پتہ چل سکے۔ (اس مضمون کو دسمبر ۹۲ء میں شائع ہونے والی کتاب ''ایک محقق' تین ادیب'' میں دوسرے حضرات کے مضامین کے ساتھ شامل کیا گیا ہے) ارتضاء عزمی نے بڑے ''فلسفیانہ انداز'' میں قابل صاحب کے ایک مطلع کا' علامہ اقبال کے ایک

مطلع سے ناتا جوڑا ہے۔ قابل صاحب کا مطلع تھا۔

تم نہ مانو، مگر حقیقت ہے
عشق انسان کی ضرورت ہے

سید ارتضاء عزمی لکھتے ہیں۔

"مطلع سن کر اس کو نامربوط، دولخت اور فارمولا شاعری سے تعبیر کیا گیا اور یہ عمل ایک طرف سے نہیں، بلکہ ہر طرف سے دہرایا گیا۔ یہ رنگ محفل دیکھ کر مجھے بھی لب کشائی کی اجازت طلب کرنا پڑی۔"

بات چونکہ بہت طویل ہے اس لیے اصل نکتے کی طرف آتا ہوں۔۔ لکھتے ہیں۔

"علامہ اقبال نے اس موضوع پر دوسرے انداز میں، زیادہ وسیع تناظر میں مطلع کہا ہے۔

نے مہرہ باقی، نے مہرہ بازی
جیتا ہے رومی، ہارا ہے رازی

حضرت علامہ نے مولانا رومی کو مکتبہ عشق کا اور حضرت رازی کو مکتبہ عقل و فلسفہ کا نمائندہ قرار دیا ہے اور فلسفہ و عقل پر عشق و محبت کو ترجیح دی ہے۔ کچھ ایسا ہی حال قابل کے زیر بحث مطلع کا ہے۔"

اب سوچیے، ڈاکٹر ساجد امجد کے ناول میں اس مطلع پر کیا گفتگو ہوئی، ارتضاء عزمی کی اس "نکتہ آفرینی" کا کہیں ذکر ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے تو ایک ایک ادیب اور شاعر کے ایک ایک جملے کو نوٹ کرتے ہوئے "قابل دشمنی" کے پہلو نکالے ہیں۔ خدا جانے محسن بھوپالی صاحب، سید ارتضاء عزمی کو "قابل دشمنوں" میں شمار کرتے ہیں کہ "قابل دوستوں" میں۔ کیونکہ انہوں نے بھی نام لیے بغیر کہیں کہیں محسن صاحب پر بھی چوٹ کی ہے۔ ایک جملہ پڑھ لیجے۔

"انہیں لوگوں نے، اس کے انتقال کے بعد، "مجلس یادگار قابل" کی داغ بیل ڈال کر مرحوم کے مرتب کردہ مجموعہ کلام "دیدۂ بیدار" کی اشاعت کا اہتمام کر کے

اپنے سینوں پر نیک نامی کے تمغے سجالیے۔"

مضمون نگاری کا یہ انداز جس میں کسی کا نام نہیں لیا جاتا خود مصنف کے مزاج کا پتہ دیتا ہے۔

قابل صاحب سے مراسم کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"ایک دن قابل اجمیری میرے دفتر تشریف لائے اور مجھے اس تنقیدی نشست میں شرکت کی بطور خاص دعوت دی جو اسی شام کو اورینٹل کالج حیدرآباد میں سجاد حیدر صاحب اسٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان حیدر آباد کی صدارت میں منعقد ہونے والی تھی --- قابل مرحوم سے میرے کوئی خصوصی مراسم بھی نہیں تھے --- بہرحال میں بحیثیت شاعر ان کو حیدر آباد کے تمام شاعروں (بشمول حمایت علی شاعر و محسن بھوپالی) اچھا شاعر سمجھتا تھا بنابریں اپنے وعدے کے ایفا کے خیال سے اس تنقیدی نشست میں شرکت کرنے پہنچ گیا۔"

لیکن اس محبت اور قدردانی کے باوجود یہ بات بھی غور طلب ہے کہ --- (انہیں کے الفاظ میں)

"میں نے ارادہ کیا تھا کہ ناصر کاظمی کا "برگ نے" اور قابل اجمیری کا "دیدۂ بیدار" کہیں سے حاصل کرکے ان تینوں شاعروں یعنی ناصر کاظمی، قابل اجمیری اور فرید جاوید کا ایک تقابلی مطالعہ پیش کیا جائے۔ اس سلسلے میں جناب حبیب ارشد اور سید کاظم رضا سے "برگ نے" اور "دیدۂ بیدار" فراہم کرنے کی درخواست بھی کی لیکن دونوں حضرات نے اپنی معذوری کا اظہار کردیا۔ اس لیے بات آئی گئی ہو گئی۔"

پھر اہل ادب کو یہ "اطلاع" دیتے ہیں کہ

"دیدۂ بیدار" کی اشاعت بھی قابل اجمیری کے انتقال کے بہت بعد عمل میں آئی۔"

اب انہیں کون بتائے کہ "دیدۂ بیدار" قابل صاحب کے انتقال کے کچھ ہی ماہ بعد شائع ہوگیا تھا یعنی ۶۳ء میں اور دوسرا ایڈیشن جس پر انوار احمد زئی نے "دو

صفحاتی" ابتدائیہ لکھا ہے ۱۹۸۶ء میں چھپا--- سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ حضرات کیسے دوست اور قدرداں ہیں جنہیں حیدر آباد میں قابل کی کتابیں نہیں ملتیں۔ ان سے تو ہم "دشمنان قابل" اچھے جن کے پاس قابل صاحب کے بارے میں اتنا مواد ہے کہ اگر کوئی شخص قابل صاحب پر واقعی کوئی تحقیقی کام کرنا چاہے تو فراہم کیا جاسکتا ہے۔

دراصل جب کوئی بڑا آدمی دنیا سے چلا جاتا ہے تو اس کے ایسے چاہنے والے بہت پیدا ہوجاتے ہیں جو اس کی موت کو اپنے نام و نمود کا وسیلہ بنا لیتے ہیں۔ ان میں سے کسی نے قابل کی زندگی میں کچھ نہیں لکھا اور جنہوں نے لکھا' نہ صرف یہ کہ ان کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا بلکہ انہیں بھی "دشمنان قابل" باور کرایا گیا مثلاً اختر انصاری اکبر آبادی مرحوم اور یہ "گنہ گار" تو ہے ہی لایق دار' کاش کوئی صاحب قابل صاحب کے بارے میں میرے بھی تاثرات جان لیتے-- کچھ اور نہ سہی تو احمد رئیس کا وہ "انٹرویو نما" مضمون ہی پڑھ لیتے جو "حیدر آباد-- تین شاعروں کا شہر" کے عنوان سے روزنامہ "جسارت" میں شائع ہوا تھا۔ مگر میرے لایق دوست تو مجھے محسن بھوپالی کی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے' میرے بارے میں انہیں کے دماغ سے سوچ رہے تھے۔ اب مجھے یہ بھی بتانا پڑے گا کہ وہ "تنقیدی نشست" جس کا اتنا شہرہ ہے--- رائٹرز گلڈ کی طرف سے منعقد کی گئی تھی جس کے جوائنٹ سکریٹری خود محسن بھوپالی تھے--- اگر قابل صاحب بیمار تھے تو بحیثیت دوست ان کا فرض تھا کہ انہیں نشست میں نہ لاتے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ تنقیدی نشست میں تنقید ہی ہوتی ہے' قصیدہ نہیں پڑھا جاتا۔ مگر بحوالہ سید ارتضاء عزمی' قابل صاحب تو خود انہیں مدعو کرنے' عزمی صاحب کے دفتر گئے تھے!

اس تنقیدی نشست میں' میں نے چند اصولی باتیں کی تھیں۔

ہر وہ شعر جو صداقت کا اظہار کرے' بڑا شعر نہیں ہوتا۔ اسی لئے میں نے قابل صاحب کے مطلع کے جواب میں سالک کے اس شعر کی مثال دی تھی۔

تنگ دستی اگر نہیں سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے

دوسری بات جس کا بہت چرچا کیا گیا اور جس کا ذکر ارتضاء عزمی نے بھی کیا ہے۔ قابل صاحب کا یہ مصرعہ ہے۔

زندگی کتنی خوبصورت ہے

ان حضرات کے بقول میں نے اس مصرعے پر "چوری" کا الزام لگایا تھا۔۔ میرے نقطہ نظر سے کوئی مثال کوٹ کرنا چوری نہیں ہوتا۔ میں نے کہا تھا کہ یہ مصرعہ باقی صدیقی کے مجموعے میں بھی نظر سے گزرا ہے۔ اور اب محسن بھوپالی بھی گواہی دیں گے کہ انہیں دنوں شکیل بدایونی کی غزل میں بھی یہ مصرعہ آگیا تھا۔۔۔ ہندوستان کے کسی فلمی نغمے میں ہے۔ اسوقت رسالہ "شمع" (دہلی) میں کوئی مراسلہ بھی شائع ہوا تھا۔۔۔ اور اب سحر انصاری نے بتایا ہے کہ انجم اعظمی کی نظم "روشنی" میں بھی یہی مصرعہ ایک نہیں دو جگہ ہے جو ان کے مجموعہ کلام "چہرہ" میں شامل ہے۔ میں نے بھی تصدیق کرلی۔ ان کے صفحات نمبر(۵۳) اور (۵۵) پر دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ مصرعہ یا ایسے مصرعے۔۔۔ جیسے سردار جعفری کی نظم "نیند" جو سنٹرل جیل ناسک میں، اپریل ۵۰ء میں لکھی گئی تھی اور ان کے مجموعہ کلام "پتھر کی دیوار" (مطبوعہ اگست ۵۳ء) میں شامل ہے۔

رات خوبصورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

کہیں سے لیے یا چرائے نہیں جاتے۔ بلکہ یہ اتنے سامنے کے مصرعے ہوتے ہیں کہ کسی کو بھی سوجھ سکتے ہیں۔ ان میں کوئی تخلیقی کاوش نہیں ہوتی۔ اگر ایسے مصرعے کسی اور کے پاس مل جائیں تو بعض شعراء انہیں اپنے کلام سے نکال دیتے ہیں۔ خاص طور پر غزلوں میں، جس کا ہر شعر مفرد ہوتا ہے۔ نظم میں البتہ مربوط اشعار ہوتے ہیں اس لیے تبدیلی مشکل ہو سکتی ہے۔

زندگی کتنی خوبصورت ہے آیئے آپ کی ضرورت ہے (فلم۔ بن بادل برسات)

محسن صاحب اور چند لوگوں نے اسے "چوری" کے معنی دے دیئے اور ڈاکٹر ساجد امجد نے بھی انہیں کی بات دہرا دی۔ ہفتہ وار "رہنما" کا وہ شمارہ بھی میرے سامنے ہے جس میں اس نشست کی روداد چھپی ہے۔ (۱۰ راگست ۶۲ء کا شمارہ ہے۔ صفحہ ٦ دیکھیے) میں لفظ بہ لفظ نقل کرتا ہوں ––– کہیں "چوری" کا لفظ نہیں۔

"قابل اجمیری –––

اس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو
زندگی کتنی خوبصورت ہے

(واہ وا کا شور)

حمایت علی شاعر ––– مجھے اس شعر کی خوبی سے انکار نہیں ہے، لیکن اس میں خیال کا توارد ہو گیا ہے۔ اس خیال کا ایک شعر میں نے باقی صدیقی کی غزل میں بھی پڑھا ہے، غالباً یہ ہے۔

اس کی محفل میں آئے تو جانا
زندگی کتنی خوبصورت ہے

قابل صاحب نے اس میں "دیکھو" کہہ کر ایک التزام ضرور پیدا کر دیا ہے مگر ––– میں سوچ رہا ہوں، داد کیسے دی جانی چاہیے۔"

قابل اجمیری۔ میں نے یہ غزل پندرہ سال پہلے کہی تھی۔

اختر انصاری۔ باقی کی غزل بھی ان کے پہلے مجموعے میں شائع ہوئی تھی جو شاید اس سے بھی پہلے شائع ہوا تھا۔

قابل اجمیری۔ میری نظر سے ان کا مجموعہ نہیں گزرا۔

حمایت علی شاعر۔ اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، مختصر بحروں میں ایسا توارد ہو جاتا ہے۔

صدر۔ تیسرا شعر پڑھیے قابل صاحب –––"

اب کوئی بتائے کہ اس بحث میں "قابل دشمنی" کا پہلو کہاں سے آ گیا۔

اب ملاحظہ کیجئے ارتضاء عزمی کی "باتیں" ---ان ہی کے الفاظ میں۔

اسکی محفل میں بیٹھ کر جانا
زندگی کتنی خوبصورت ہے

اس شعر کو باقی صدیقی کے نام سے منسوب کیا گیا۔ اور یہ دیدہ دلیری ہمارے حمایت علی شاعر کا کارنامہ تھی۔ مشہود انور نے کہا بھی کہ باقی صدیقی کے مجموعے میں یہ شعر نہیں ہے اور میری نظر سے کہیں نہیں گزرا--- تو کہا گیا کہ ان کے دوسرے مجموعے میں ہے---" (حالانکہ یہ نہیں کہا گیا)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مشہود انور کو ان کے فرشتوں نے بتا دیا تھا کہ قابل کے شعر پر یہ اعتراض ہوگا کیا وہ پہلے سے باقی صدیقی کا دیوان پڑھ کر آئے تھے؟ یہ حضرات تو باقی صدیقی کے مجموعوں کے نام سے بھی واقف نہیں تھے۔ پھر لکھتے ہیں۔

"شاید اس محفل میں میرے اور مشہود انور کے علاوہ کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو غیر جانبداری سے بولا ہو۔"

محسن بھوپالی کے بارے میں کیا خیال ہے جو ڈاکٹر ساجد امجد کے الفاظ میں (بحوالہ ناول) "اب دونوں نے مل کر (محسن اور قابل) ادبی محفلوں' تنقیدی نشستوں میں قابل کے خلاف زیادتیوں کا سختی سے نوٹس لیا۔ ادبی فضا میں دھماکا ہو گیا۔ شاعر کا گروپ بوکھلا گیا کہ اب قابل کی طرف سے کوئی جواب دینے والا آگیا ہے۔"

اس تنقیدی نشست کے حوالے سے ناول میں تو ارتضاء عزمی اور مشہود انور کا ذکر ہی برائے نام ہے۔ ایک جگہ تو مشہود انور بھی قابل صاحب کے شعر پر طنز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں--- (بحوالہ ناول)

"قابل اجمیری اس کے وعدے پہ ناز تھے کیا کیا
اب در و بام سے ندامت ہے

واہ وا--- حفیظ ہوشیار پوری کا شعر یاد آگیا۔ مشہود انور نے کہا۔

مجھے غالب کا شعر یاد آگیا۔ پروفیسر حضور احمد سلیم بولے۔"

ان فقروں کو کیا کہیں گے محترم ارتضاء عزمی -- غیر جانبدارانہ یا جانب دارانہ؟ کیا ان کا گناہ گار بھی مجھ ہی کو ٹھہرایا جائے گا؟ میں --- جس کے بارے میں خود مشہود انور کا مضمون "میرا شاعر- میرا کلیم" مطبوعہ "-فیضان" (۶۶-۶۵ء) حیدر آباد۔ ارتضاء عزمی پڑھ لیتے تو ۹۲ء میں ایسا مضمون شاید نہ لکھتے۔ مگر بقول پروفیسر عبد القوی ضیاء۔

دعویٰ تو اپنے علم کا سب کو ہے اے ضیاء
کیا چیز ہے کتاب' کوئی جانتا نہیں

اس تنقیدی نشست سے بہت پہلے میرے ساتھ ایک اور بھی دلچسپ واقعہ پیش آیا تھا۔ شاید ادب کے "باخبر لوگوں" کو یاد ہو کہ ۵۶ء میں جب میرا پہلا مجموعہ کلام "آگ میں پھول" شائع ہوا تو کچھ "بے خبروں" نے میری تین سو اشعار کی نظم "بنگال سے کوریا تک" کو ساحر لدھیانوی کی نظم "پرچھائیاں" کا چربہ مشہور کردیا۔ فرضی ناموں سے دو ایک مضامین بھی لکھ دیئے گئے۔ ساحر صاحب کی نظم ۵۵ء میں شائع ہوئی تھی (ساحر کے پیش لفظ پر ۲۱ر نومبر ۵۵ء اور سردار جعفری کے دیباچے پر ۲۳ر نومبر ۵۵ء کی تاریخ درج ہے) چونکہ دونوں نظمیں "امن عالم" کے موضوع پر ایک ہی تیکنک میں لکھی گئی تھیں' اس لیے یار لوگوں کو موقع مل گیا۔ مگر جب میں نے ۵۲ء سے ۵۴ء تک کے مختلف پاکستانی اور ہندوستانی رسائل کے اشاعتی حوالے دیکر یہ بتایا کہ یہ نظم پہلی بار مکمل طور پر ہندوستان ہی کے رسالے "شاہراہ" (دہلی) کے سالنامے مارچ ۵۴ء میں شائع ہوئی تھی --- تو سب اپنا سا منہ لیکر رہ گئے۔ ساحر تو خیر مجھ سے بڑے اور سینئر شاعر تھے' نہ انہوں نے اس سلسلے میں کوئی بات کہی اور نہ میں نے۔ بلکہ ۵۸ء میں جب دہلی کے ایک مشاعرے میں' میں نے انہیں اپنی کتاب دی تو خوش ہوئے اور جواباً اپنی کتاب بھی مجھے عنایت کردی جو اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔ اس کے بہت عرصے بعد "برادر عزیز" محسن بھوپالی کو بھی اپنے ایک مضمون "کچھ یادیں-- کچھ باتیں" (مطبوعہ روزنامہ "جنگ" راولپنڈی مورخہ ۱۵ر دسمبر ۷۲ء)

میں اقرار کرنا پڑا کہ

"چند کوتاہ نظر شاعروں نے جو برنائے حسد تاک لگائے بیٹھے تھے' اس مسئلے کو رسائل اور نجی محفلوں میں خوب اچھالا اور شاعر پر سرقے تک کا الزام لگایا گیا مگر قابل ذکر نقاد اور ادیب خاموش رہے۔"

حالانکہ ان "کوتاہ نظر" شاعروں میں وہ خود شامل تھے۔ ملاحظہ ہو' مراسلہ مطبوعہ فلمی ہفتہ وار "کردار" مورخہ ۲۱ ستمبر ۶۳ء۔ یہ ساری تفصیل میری کتاب "شخص و عکس" مطبوعہ ۸۴ء میں تاریخی حوالوں کے ساتھ موجود ہے۔

قابل صاحب کے تو ایک ہی شعر کے بارے میں "توارد" کی بات کہی گئی تھی جس پر وہ تو نہیں البتہ ان کی دوستی کے دم بھرنے والوں کو بہت تکلیف پہنچی اور وہ بھی ــــ ان کے انتقال کے برسوں بعد

اس تنقیدی نشست میں سبھی نے اپنے اپنے انداز میں کچھ نہ کچھ کہا تھا' مگر الزام میرے سر آیا۔ نشست کے بعد ارتضاء عزمی صاحب لکھتے ہیں۔

"شام کے دھندلکے میں جب لوگ اورینٹل کالج حیدرآباد سے باہر سڑک پر آئے تو میں نے دوسرا عجیب و غریب منظر دیکھا۔ ہمارے حمایت علی شاعر' قابل اجمیری (مرحوم) کے کاندھے پر ہاتھ رکھے ان کے ساتھ چل رہے ہیں اور قابل اجمیری سے اپنی سخت تنقید پر معذرت خواہ تھے....."

میرے اس عمل پر ارتضاء عزمی نے "اپنے مزاج اور اپنی سمجھ" کے مطابق جو سوچا اور نتیجہ اخذ کیا وہ جانیں ــ لیکن یہی بات ہمارے تعلقات کے ثبوت میں بھی پیش کی جاسکتی ہے۔ تنقیدی نشستوں کی بحثیں چونکہ علمی اور دوٹوک ہوا کرتی ہیں اور اکثر جوش تنقید میں بلند آہنگ بھی ہوجاتی ہیں ــــ اس لیے معذرت بھی اسی مقصد سے چاہی جاتی ہے کہ کوئی بات "صاحب تخلیق" پر گراں نہ گزری ہو اور دل میں کوئی بات رہ نہ جائے۔ جو لوگ علمی بحثوں کے عادی نہیں ہوتے وہ اسے "ذاتی مخالفت" سے تعبیر کرلیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کم علمی اور تنگ نظری کی دلیل ہے۔

سید ارتضا عزمی کے مزاج اور ذہنیت کا اندازہ تو اسی واقعے کے ذکر سے ہو جاتا ہے جو انہوں نے میرے ایک طالب علم کے حوالے سے کیا ہے۔

"کئی سال پہلے اردو ام۔اے کے ایک طالب علم وثیق الرحمٰن صابر نے "حیدر آباد کی ادبی انجمن اور ان کی خدمات یا ادبی سرگرمیاں" کے عنوان سے ام۔اے (فائنل) کا (THESIS) مقالہ لکھا تھا۔ اس سلسلے میں وہ عزیز مجھ سے بھی ملے کیونکہ ایک ادبی انجمن جس کا نام "بزم غزل" رکھا گیا تھا' اس کے بانیوں اور عہدہ داروں میں میرا نام بھی شامل تھا۔۔۔ اس عزیز نے ایک مشہور تنقیدی نشست کے بارے میں بھی مجھ سے کچھ حقائق معلوم کرنا چاہے مگر چونکہ مجھے اس عزیز کے مقالے کے "نگراں" کا علم تھا کہ کون صاحب ہیں' اس لیے میں نے اس کو حقایق بتانے سے گریز کیا کہ جو کچھ آپ کو اخبار و رسائل کے ذریعے سے ملے اس کو شریک مقالہ کرلیں۔ کیونکہ حقایق سے آگاہی کے بعد آپ ان کو اپنے مقالے میں شامل نہیں کرسکیں گے اور ان تفصیلات کا تذکرہ نہ کرسکیں گے جو میں بتاؤں گا۔۔۔ اس لیے یہی بہتر ہے کہ آپ میرے مشورے پر عمل کریں اور حقایق معلوم کرنے پر ضد نہ کریں۔ اس صورت میں آپ کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔۔۔"

جو شخص بغیر کسی مشاہدے اور تجربے کے ایسے اندیشوں میں گرفتار ہو اس کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس کی فطرت کا خمیر ہی "بدگمانی" سے اٹھا ہے۔ خیر۔۔۔ پھر موصوف لکھتے ہیں۔

"اب چونکہ ایسی کوئی مجبوری نہیں یا کسی کو کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں (میں سندھ یونیورسٹی سے ریٹائر ہوچکا تھا۔۔۔ ۱۳ر جولائی ۸۶ء) اس لیے اس تنقیدی نشست کی داستان سیاسی زبان میں محض ریکارڈ درست کرنے کی خاطر مختصر لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔۔۔ چونکہ میرے استاد' اختر انصاری اکبر آبادی سے آگرے سے مراسم و تعلقات تھے..... اس نشست سے ایک روز پہلے پریم پارک میں حیدر آباد کے جغادری قسم کے شاعروں اور ادیبوں کی ایک میٹنگ ہوچکی تھی جس میں

پہلے ہی سے یہ طے کرلیا گیا تھا کہ کل کی تنقیدی نشست میں قابل (مرحوم) کی غزل کی پرخچے اڑائے جائیں گے--- یہ بات مجھے استاد اختر انصاری اکبر آبادی نے پہلے ہی بتادی تھی---"

تعجب ہے کہ اس کے بعد بھی سید ارتضا عزمی خاموش رہے۔ قابل صاحب سے کہا نہ محسن بھوپالی سے--- ممکن ہے کسی "اور مصلحت" نے پردہ پوشی پر مجبور کیا ہو۔ خیر قابل صاحب کی زندگی میں نہ سہی' اپنے استاد' اختر انصاری اکبر آبادی کی زندگی میں ہی اس "سازش" کا انکشاف کردیتے کیونکہ ۷۸ء کے پہلے تو میں سندھ یونیورسٹی میں بھی نہیں تھا (بلکہ حیدر آباد ہی میں نہیں تھا)

سمجھ میں نہیں آتا یہ "محبان قابل" اپنی محبت کے اظہار کے لیے "موت" کا کیوں انتظار کرتے ہیں۔ زندگی میں ان کی جرات اظہار' مہر بہ لب کیوں ہوجاتی ہے؟ محسن بھوپالی نے قابل صاحب کے انتقال کے پانچ سال بعد ایک "دو صفحاتی" مضمون میں اپنی محبت کا اظہار کیا تھا اور پھر اسی مضمون کو بار بار "اب تک" چھپواتے رہے۔ انوار احمد زئی نے پندرہ سال بعد اور ارتضا عزمی نے قابل کے انتقال کے تیس سال بعد پہلی مرتبہ اس "سازش" کا انکشاف کیا جب کہ اس "راز" کے واحد آشنا ان کے دیرینہ دوست اور استاد' اختر انصاری اکبر آبادی تھے جن کے انتقال (۸۵ء) کو بھی سات سال ہوچکے ہیں' قابل صاحب کے بیشتر احباب' تراب گوالیاری' انجم اجمیری' رفیق ریواڑوی' بینش سلیمی' شہیر نجمی' جبریل صدیقی اور بسمل آغائی وغیرہ سبھی دنیا سے چلے گئے--- تھوڑا اور انتظار کرلیتے' میں بھی رخصت ہوجاتا--- پھر خوب جی کھول کے لکھتے--- ہر "راز" فاش کرتے' کوئی تصدیق کرنے والا ہوتا نہ تردید کرنے والا' ارتضا عزمی نے "عجلت" سے کام لیا' مجھے افسوس ہے کہ میں ابھی تک زندہ ہوں۔

خیر یہ تو ہوئیں "علمی اور ادبی دنیا کی" باتیں--- آیئے اسی ناول کی طرف۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے محسن بھوپالی کے اشارے پر میرا ذاتی کردار بھی داغدار کرنے کی کوشش کی۔ لکھتے ہیں۔

"اپنا مکان موجود ہے، لیکن لطیف آباد میں ایک چھوڑ دو دو کوارٹر الاٹ کرائے جا رہے ہیں۔"

گویا، افسران اعلیٰ سے تعلقات کا میں نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ ساجد امجد کم از کم یہی باتیں ریڈیو کے افسران سے پوچھ لیتے۔ وہ انہیں بتاتے کہ جو عملہ کراچی سے ٹرانسفر ہو کر حیدر آباد آیا تھا، کچھ عرصہ تو اسے "ریڈیو ہوٹل" (اسٹیشن روڈ) پر ٹھہرایا گیا اور جو لوگ لطیف آباد جانے پر آمادہ تھے، انہیں وہاں کوارٹر دے دیئے گئے۔ اور یہ کوارٹر مفت نہیں دیئے گئے ان کی قیمت اقساط میں لی گئی۔ ۵۵ء میں لطیف آباد اتنا آباد نہیں تھا جتنا اب ہے۔ لوگ وہاں رہتے ہوئے گھبراتے تھے۔ صرف وہی لوگ وہاں گئے جو بہت ضرورت مند تھے۔ (خود محسن بھوپالی بھی لطیف آباد کے کوارٹر میں رہتے تھے) جن صاحب نے شہر میں میرے مکان کا سراغ دیا تھا، ساجد امجد کم از کم ان سے پتہ ہی پوچھ لیتے۔

ایسے الزامات کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر میں افسران اعلیٰ سے ناجائز فائدہ ہی اٹھانے کا عادی ہوتا تو کراچی میں بھی (جب کہ اب مجھے پہلے سے زیادہ لوگ جانتے ہیں) ڈیفنس سوسائٹی اور گذری میں نہ سہی "ناظم آباد" ہی میں چار پانچ سو گز کا پلاٹ حاصل کر کے ایک بنگلہ بنوا لیتا۔ یا پھر کسی ایسے محکمے میں نوکری کر لیتا، جہاں "فضل ربی" عام ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں تو بعض "محکموں" کی ملازمت ہی آدمی کی "پہچان" بن جاتی ہے۔ (پہچان پر ہے ناز تو پہچان جایئے)

میں بھی کتنا نادان ہوں، ایسا کچھ نہیں کیا۔ برسوں مسلسل محنت کی اور اپنے بچوں کو صرف اعلیٰ تعلیم ہی دلوا سکا۔ بنگلے اور کوٹھی کا لالچ پہلے بھی نہیں کیا اور اب بھی نہیں۔

شاید اسی سبب سے توازن سا مجھ میں ہے
اک محتسب لیے ہوئے تلوار مجھ میں تھا

بڑے لوگوں سے ناجائز فائدے حاصل کرنے کی بات تو الگ رہی، میں نے تو آج

تک اپنی کتابوں پر کسی "بڑے" اہل قلم سے کوئی مضمون یا فلیپ تک نہیں لکھوایا۔ میری کتابوں کے سووینیرز میں بھی کسی نے کوئی "فرمایشی تحریر" نہیں دیکھی ہوگی۔ جو آدمی الفاظ کی "بھیک" نہ مانگے وہ کسی سے کچھ اور کیسے طلب کر سکتا ہے۔

وہ گل کسی بہار کا احسان کیوں اٹھائے
جس کو ملی ہو' زخم جگر کی شگفتگی

میں نے قابل کو ہمیشہ ایک اچھا شاعر ہی نہیں بہت اچھا شاعر سمجھا ہے مگر ایک بات جو میں خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ کسی کو اچھا یا بڑا سمجھنے کے لیے ضروری نہیں کہ خود کو برا یا چھوٹا سمجھا جائے۔ اگر شعرا یہ سمجھنے لگیں تو کبھی شعر ہی نہ کہہ سکیں۔ ہر شاعر جانتا ہے کہ

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

مگر ایک انداز فکر یہ بھی ہے۔

جہاں میں کوئی ہمارے سوا بھی ہو شاید
ہم اپنے آپ سے باہر نکل کے دیکھیں گے

ہماری شاعری میں تعلّی کی جو روایت ہے وہ تو کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ اردو میں تو ایک نوجوان شاعر یہاں تک کہہ دیتا ہے کہ

پہلا شاعر میر ہوا اور اس کے بعد ہوں میں

ڈاکٹر ساجد امجد تو خود بھی شاعر ہیں' میری بات کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔ جس قسم کی باتیں مجھ سے متعلق کی گئیں۔ یا جو کچھ میرے بارے میں لکھا گیا' اس پر سوچتا ہوں تو اپنا ہی ایک شعر یاد آجاتا ہے۔

کس کوچہ طفلاں میں چلے آئے ہو شاعر
آوازہ کسے ہے تو کوئی سنگ اٹھائے

اس غزل کا مطلع بھی سنا دوں کہ کبھی یہ کیفیت بھی مجھ پر طاری ہوئی اور یہ سچائی

بھی کھل کر سامنے آگئی۔

اس دشت سخن میں' کوئی کیا پھول کھلائے
چمکی جو ذرا دھوپ تو جلنے لگے "سائے"

لیکن پھر--- یہ احساس بھی تقویت دیتا رہا کہ

یہ بھی ہے ماہتاب پرستی کی اک ادا ---
جب اس کو چھو نہ پائے تو خاک اس پہ پھینک دی

اگر میں کمزور اعصاب کا آدمی ہوتا تو شاید آج جواب دینے کے قابل نہ ہوتا۔ لیکن میرا ضمیر بھی صاف ہے اور میرا خدا بھی شاہد ہے کہ میں کیا تھا اور کیا ہوں۔

حلقہ بگوش رہ کے کٹی جن کی زندگی
وہ کیا سمجھ سکیں گے مقام خود آگہی

قابل صاحب بھی میری طرح اوروں سے مختلف شاعر تھے۔ وہ بڑی خود آگہی اور توانائی کے ساتھ شعر کہتے تھے' اور یہ صفت ان میں اپنی خودداری کے سبب تھی۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے محسن بھوپالی اور انوار احمد زئی کے مضامین کی روشنی میں انہیں جتنا بے یار و مددگار' کمزور اور مظلوم شاعر دکھایا ہے' وہ ایسے نہیں تھے۔ ان کی شاعری ان کی اندرونی قوت کی آئینہ دار ہے۔ ایسا طاقتور شاعر کسی کی مخالفت پر' اپنے سے کمتر درجے کے شاعروں سے گلے مل مل کر رویا نہیں کرتا۔ آدھی آدھی رات تک ہوٹلوں میں بیٹھ کر اپنا دکھڑا سنانے والا شاعر صرف ان حضرات کے مضامین میں ہی نظر آتا ہے۔ قابل صاحب کے کسی بچپن کے دوست یا مخلص ہم عصر--- خادمی اجمیری یا پیکر واسطی نے کسی ایسے لمحے کی تصویر نہیں کھینچی کہ قابل صاحب ان سے' اپنے اوپر ہونے والے "ظلم" کی داستان سنا رہے ہوں۔ یہ بات ہی کتنی مضحکہ خیز ہے کہ ایک "نام نہاد شاعر" بقول ساجد امجد' جس کی شہر میں کوئی قدر بھی نہیں تھی--- شہر کے سارے ادیبوں اور شاعروں پر چھایا ہوا تھا! قابل صاحب کی رسائی تو افسران اعلیٰ تک تھی۔ ریڈیو کے افسروں سے بھی شکایت کی جا سکتی تھی' اس کا سماجی اور ادبی بائیکاٹ کیا

جا سکتا تھا۔۔ کم از کم کسی اخبار یا رسالے ہی میں "دوستوں" کے بیانات آجاتے۔ کیا شہر کے سارے ذرائع ابلاغ اس "نام نہاد شاعر" کے زیر اثر تھے؟

یہیں سے بات کھلتی ہے، یہیں سے راز ملتا ہے

یہ ساری داستان من گھڑت ہے۔ حقیقتاً قابل صاحب کا کوئی مخالف تھا نہ دشمن، سب کو ان سے محبت تھی۔ اور جو ان کے قریبی۔۔ حقیقی احباب تھے، ان کی ہر ممکن کوشش یہی تھی کہ کسی طرح ان کا علاج ہو جائے۔ اس کے لیے انہوں نے عملی اقدامات بھی کیے۔

پروفیسر فرمان فتح پوری اور اختر انصاری اکبر آبادی کے مضامین کے حوالے میں دے چکا ہوں۔ ۵۸ء میں جب "قابل کے سو شعر" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں پروفیسر ارشد رضا نے قابل صاحب کے تمام دوستوں اور سندھ کے ادب دوست اہل قلم کی تحریروں اور ان عملی کوششوں کا حکومتی سطح پر جائزہ لیا۔۔۔ حیرت ہے کہ "گہوارہ" اور "طالب علم" ڈائجسٹ کے "قابل نمبروں" میں ان کا یہ مضمون ادھورا چھاپا گیا۔ یعنی وہ حصہ جو صوبہ سندھ کے ادیبوں اور صحافیوں کی زندہ ضمیری کا ترجمان تھا۔۔۔ مضمون سے نکال دیا گیا۔۔ کیوں؟ اس کی مصلحت بھی محسن بھوپالی ہی سمجھ سکتے ہیں کیوں کہ وہ بقول ڈاکٹر ساجد امجد "سیاسی چالوں سے بھی واقف تھے اور ہر مہرہ مناسب گھر میں چل بھی سکتے تھے۔"

ان نمبروں میں کوئی ایسا مضمون نہیں چھپنے دیا گیا جسے پڑھ کر لوگ سوچ سکیں کہ کچھ اور لوگ بھی قابل صاحب سے محبت رکھتے تھے۔ اس مضمون میں قابل صاحب کا تعارف، مختصر حالات زندگی اور شاعرانہ اہمیت جتانے کے بعد پروفیسر ارشد رضا لکھتے ہیں۔

"..... لوگوں نے اس فن کار کی غربت اور بیماری کو دیکھا تو صرف یہی نہیں کہ صاحب اقتدار حضرات کو توجہ دلانے کی کوشش کی بلکہ اخبارات کے ذریعے حکومت سے مطالبہ کیا۔۔۔ کراچی اور سندھ کے اخبارات لکھتے رہے، اداریے لکھے جانے

لگے اور اپیلیں چھپتی رہیں۔ یہاں تک کہ ان پیہم اخباری مطالبات سے مجبور ہو کر پیرزادہ عبدالستار کی وزارت میں جب کہ پیر علی محمد راشدی وزیر صحت تھے، حکومت سندھ نے سولہ ہزار روپے ان کے علاج پر خرچ کرنے کی منظوری دے دی اور علاج کے لیے اٹلی بھیجنے کا اعلان کیا۔۔۔ اس کے چند ہفتوں بعد ہی پیرزادہ وزارت ختم ہو گئی اور محمد ایوب کھوڑو کو وزارت بنانے کی دعوت دی گئی۔ عوام نے اس حکومت سے بھی مطالبہ کیا۔ کھوڑو صاحب کے زمانے میں دوبارہ یہ مسئلہ کیبنٹ میں پیش ہوا اور پھر ایک بار حکومت نے لبنان کے سینی ٹوریم میں علاج کے لیے بھیجنے کا اعلان کیا۔ اس سلسلے میں کارروائی تقریباً مکمل ہو چکی تھی کہ ون یونٹ بن گیا۔

ون یونٹ کے قیام کے بعد حیدر آباد میں گورمانی صاحب گورنر مغربی پاکستان کی صدارت میں ایک مشاعرہ، انجمن ترقی اردو کی طرف سے منعقد ہوا جس میں گورمانی صاحب نے وعدہ کیا کہ اس کام کو مغربی پاکستان کی حکومت پورا کرے گی۔۔۔ لیکن وہ وعدہ بھی کہیں فضاؤں میں تحلیل ہو گیا۔ (۱۲ر مارچ ۱۹۵۸ء)

افسوس تو یہ ہے کہ قابل صاحب سے دوستی کے یہ "مخصوص دعویدار"[1] دوسروں کی کردار کشی اور الزام آرائی میں تو مصروف رہے مگر خود رائٹرز گلڈ حیدر آباد ریجن کے جوائنٹ سکریٹری ہو کر، حکومت سندھ اور مغربی پاکستان کی حکومت کے سابقہ فیصلوں کی روشنی میں، قابل صاحب کے علاج کے لیے، حکومت وقت سے کوئی مطالبہ نہ کر سکے۔ رائٹرز گلڈ ۳۱ر جنوری ۵۹ء کو قائم ہوئی تھی۔ ۵۹ء سے ۶۰ء تک صدر ایوب کی طرف سے جن گیارہ اہل قلم کو ذاتی وظائف دیئے گئے ان میں قابل صاحب کا نام بھی شامل تھا۔ انہیں علاج کے لیے پانچ سو روپے نقد دیئے گئے تھے اور ایک سو روپے ماہانہ دیا جاتا رہا (بحوالہ۔ رائٹرز گلڈ کا ترجمان "ہم قلم" سالگرہ نمبر ۶۱ء۔ صفحہ ۳۱۷)۔ ظاہر ہے کہ اتنی قلیل رقم سے نہ ان کا علاج ہو سکتا تھا اور نہ گزر اوقات۔۔۔ یہ تو حیدر آباد ریجن کے عہدے داروں کا فرض تھا کہ وہ کوئی ایسا طریقہ کار اختیار کرتے کہ مرکزی گلڈ یا حکومت مغربی پاکستان قابل صاحب کو علاج کے لیے

۱۔ محسن بھوپالی۔

(حسب فیصلہ سابق) ملک سے باہر بھیجنے پر مجبور ہو جاتی۔

ڈاکٹر ساجد امجد نے رائٹرز گلڈ اور حکومت وقت کی روش کا کوئی تجزیہ اپنے ناول میں نہیں کیا۔۔۔ انہوں نے اصل حقیقت جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ انہیں بس "ریڈیو کا ایک اسٹاف آرٹسٹ۔۔ نام نہاد شاعر" ہی قابل صاحب کی زندگی کے درپے نظر آتا رہا۔

محسن بھوپالی نے ڈاکٹر ساجد امجد کے اس ناول کے ذریعے' زندگی میں میری قبر کا کتبہ لکھوانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوجاتے اگر میرے احباب اور میرے طالب علم بروقت مجھے اس طرف متوجہ نہ کرتے۔ "شخص و عکس" بھی میں نے چند ایسے ہی مخلص دوستوں کے مشورے پر مرتب کی تھی۔ کیونکہ اگر آپ اس کے "باب تزکیہ" کا تاریخ وار مطالعہ کریں تو آپ کو ۱۹۶۳ء سے ہر دس سال بعد میری مخالفت کا ایک نیا منصوبہ نظر آئے گا۔ یہ ۱۹۹۳ء ہے جو قابل صاحب کے حوالے سے میری کردار کشی کی شاید آخری کوشش ہے جو انشاء اللہ پہلے منصوبوں کی طرح اس بار بھی ناکام ثابت ہوگی۔ فی الحال تو میں اپنے ہی شعر پر اپنا المیہ ختم کرتا ہوں۔

جینا بھی اک الزام ہے' مرنا بھی اک الزام
اے کاش ہم اس ملک کے فن کار نہ ہوتے

مگر قابل صاحب کا المیہ ابھی جاری ہے۔ ہر شاعر کا سرمایہ اس کا کلام ہوتا ہے' اور شعر و ادب کے معاملات فوری طے نہیں ہوتے' اس میں بڑے صبر و تحمل کی ضرورت ہوتی ہے' وقت اس سلسلے میں بہت دیر میں اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے۔۔۔ یہ بات میں بھی جانتا ہوں اور قابل صاحب بھی جانتے تھے۔ وہ پس پردہ محرکات کا خوب ادراک رکھتے تھے۔ اسی لیے کہتے ہیں۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

مگر کتنے ہی لوگ ہیں، جو وقت کی نذر بھی گئے' اس لیے نہیں کہ ان میں زندگی کی قوت نہیں تھی۔ اگر وقت کھلی آنکھوں انہیں دیکھ پاتا اور ان کا جوہر پرکھ لیا جاتا تو وہ مر کے بھی زندہ رہتے۔ قابل صاحب ایک ایسے ہی جوہر کے مالک تھے' اور ان کا جوہر ان کی زندگی میں پرکھ بھی لیا گیا۔۔۔ اس لیے انشاء اللہ انہیں کوئی نہ مار سکے گا۔ بس اللہ تعالیٰ انہیں ان نوحہ گروں سے بچائے رکھے جو سینہ کوبی تو کرتے رہتے ہیں مگر آنکھ میں ایک آنسو نہیں رکھتے۔

قابل صاحب کے انتقال کے بعد "مجلس یادگار قابل" قائم ہوئی اور اس نے کچھ عزائم کا اظہار کیا۔۔ ۶۳ء میں "دیدۂ بیدار شائع ہوا تو خوشی بھی ہوئی اور "حرف آغاز" میں یہ پڑھ کر دکھ بھی کہ یہ مجموعہ قابل صاحب کی بیوہ کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ بیگم قابل تو وہ عظیم خاتون ہے کہ تاریخ ادب ہمیشہ انہیں سلام کرتی رہے گی۔ انہوں نے قابل صاحب کے لیے جو ایثار کیا وہ محبت کی عظمت کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ' اپنے بیٹے کے سر پر قائم و دائم رکھے اور خدائے برتر قابل صاحب کے بیٹے کو بھی اس جوہر سے نوازے جو انسانوں کو تاریخ میں پائندہ رکھتا ہے۔۔۔ قابل صاحب کا "دیدۂ بیدار" بھی' اردو ادب کو اسی خاتون مکرم کی عطا ہے۔"

"خون رگ جاں" ۶۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں "احوال واقعی" کے تحت ناشرین نے یہ اعلان کیا تھا کہ قابل صاحب کی یاد میں نہ صرف ایک لائبریری قائم کی جائے گی بلکہ قابل صاحب کا تیسرا اور آخری مجموعہ بھی بہت جلد منظرعام پر لایا جائے گا۔ اس بات کو اب تیس (۳۰) سال گزر چکے ہیں' نہ لائبریری قائم ہو سکی نہ "باقیات قابل" شائع ہوا۔ خدا جانے ان کا باقی کلام محفوظ بھی ہے یا نہیں جب کہ "کلیات قابل" بھی ادھورا شائع ہوا ہے۔

"کلیات قابل" میں ان کے دونوں مجموعوں کی چھ نظمیں اور اٹھارہ قطعات شامل نہیں ہیں۔۔ کیوں؟ اس کا جواب شہزاد احمد نہیں دے سکتے اس لیے کہ وہ تو

ایک مخصوص مقصد کے لیے صرف "ابتدائیہ" لکھنے پر مامور تھے۔ اس کا جواب "مجلس یادگار قابل" سے مل سکتا ہے یا ان کے "وحدہٗ لا شریک" دوست محسن بھوپالی سے، اس کے علاوہ "کلیات قابل" میں اور بہت کچھ نہیں ہے۔ یہ مضمون لکھنے کے دوران جو کتابیں اور رسائل نظر سے گزرے تو اندازہ ہوا کہ اکثر غزلیں بھی ادھوری ہیں، مثلاً اکتوبر ۵۶ء کے "نئی قدریں" میں ان کی ایک غزل شائع ہوئی تھی۔

جہان آرزو، آواز ہی آواز ہوتا ہے

اس غزل کے تین شعر "دیدۂ بیدار" میں ہیں نہ "کلیات قابل" میں۔

ہجوم یاس میں اپنا عجب انداز ہوتا ہے
ہنسی فریاد ہوتی ہے، سکوت آواز ہوتا ہے

جنوں کو پیار آ جائے، خرد قربان ہو جائے
محبت کے گنہ گاروں کا وہ انداز ہوتا ہے

تری آواز کے قرباں، تری آواز کے صدقے
کبھی دل کے دھڑکنے کا یہی انداز ہوتا ہے

اس کے علاوہ ۶۰ء کے یادگار مشاعرے کا انتخاب "بوئے گل نالۂ دل" کی یہ غزل بھی ادھوری ہے۔

حسن کی آب و تاب تو دیکھو

اس غزل کے مندرجہ ذیل اشعار "خون رگ جاں" میں ہیں نہ "کلیات قابل" میں۔

کوئی اظہار مدعا جیسے
اس نظر کا حجاب تو دیکھو

سوز کا حسن، نغمگی کا جمال
ٹوٹ جائے رباب تو دیکھو

بڑھتی جاتی ہے تشنگی قابل
آگہی کی شراب تو دیکھو

''کلیات قابل'' یونی کیرنز (امارات) نے ۱۹۹۲ء میں شائع کیا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر بہت تعجب اور دکھ ہوا کہ قابل صاحب کے دونوں مجموعوں کے ''جملہ حقوق'' جو قابل صاحب کی بیوہ' محترمہ نرگس قابل کے نام محفوظ تھے۔۔ ''کلیات قابل'' (دونوں کتابوں کا مجموعہ) کے ''جملہ حقوق'' بحق پبلشر محفوظ ہیں۔

دوسری تکلیف دہ بات یہ نظر آئی کہ قابل صاحب کی بیوہ نے' دونوں کتابیں' ''قابل اجمیری کی روح مطمئنہ کے نام'' معنون کی تھیں۔ ''کلیات قابل'' کسی محترمہ ''ڈاکٹر اختر جمال ملک صاحبہ'' کی علم دوستی اور ادب نوازی کے نام معنون ہے۔

جب کوئی کتاب کسی کے نام انتساب کی جاتی ہے تو اس سے ایک ''تعلق'' کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ قابل صاحب اور ان کی بیوہ کے درمیان تو ایک ''ابدی تعلق'' ہے۔۔۔ یہ کیسی ''علم دوستی اور ادب نوازی'' ہے جس نے اس ''تعلق'' کو توڑ کر اپنا ''عارضی اور نمائشی رشتہ'' قائم کرلیا اور ایک لمحے کے لیے نہیں سوچا کہ بیگم قابل وہ عظیم عورت ہے جس نے قابل صاحب کے لیے اپنا مذہب اور اپنی زندگی کی تمام مسرتیں قربان کردیں۔ جس نے ''ہمارے شاعر'' کو زندہ رکھنے کی خاطر اپنے ہر نفس کو اجل کا انتظاریہ بنادیا۔ کیا ''مجلس یادگار قابل''۔۔ ''یونی کیرنز'' یا قابل کے المیے کی آڑ میں اپنا قصیدہ لکھوانے والے قابل اجمیری (مرحوم) کے ''محسن''۔۔اس ''مظلوم خاتون'' کو اس کی ''آخری متاع'' بھی نہیں دے سکتے تھے؟ اس ''متاع آخر'' کے چھن جانے پر بھی بیگم قابل فریاد کناں نہیں ہیں مگر قابل صاحب کا یہ شعر ضرور کچھ کہہ رہا ہے۔

مرا حال آج زبوں ہے کیوں' مرا درد آج فزوں ہے کیوں
مرے مہرباں' مرے چارہ گر' تری آبرو کا سوال ہے

(باقیات قابل) گزشتہ (۳۰) سال سے اشاعت کی منتظر ہے (مرتب)

مجلس یادگار قابل

کا ایک اور جرات مندانہ قدم

باقیات قابل

(زیر اشاعت)

زیر ترتیب مجموعہ اردو کے جواں مرگ غزل گو

حضرت قابل اجمیری مرحوم

کے باقی ماندہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ

کلام پر مشتمل ہوگا

ناشرین :— ”مجلس یادگار قابل“ جامعہ مسجد ھیراباد حیدرآباد

"زرد صحافت" کی مثالیں

میں لفظوں کے اثر کا معجزہ ہوں

ممتاز شاعر محسن بھوپالی سے ایک مکالمہ

حیدر آباد کے ایک مشاعرہ میں
قابل اجمیری کی صدارت میں
حمایت علی شاعر نے احتجاجاً
شرکت نہیں کی

نوائے وقت

جمعرات 23 جمادی الاول 1413ھ - 19 نومبر 1992ء

9/ تا 15/ جولائی 1993

قابل اجمیری کی المناک موت کا پس منظر

حمایت علی شاعر کی صفائی
ادھوری، گمراہ کن اور
تضادات سے بھرپور ہے

قومی اخبار

ممتاز شاعر محسن بھوپالی کا "قومی اخبار" کے نام وضاحتی خط

("قومی اخبار" "نوائے وقت" اور "پنچ لوک" کی سرخیاں)

حمایت علی شاعر جس کا سارا ادبی ذخیرہ چوری کے مال سے پر ہے

معروف ادیب پروفیسر تسنیم احمد کی کتاب "سرقۂ قلم" کا ایک باب

چہ دلاور است دزدے قسط نمبر (۱)

ہفت روزہ پنچ لوک مورخہ ۱۴ر اگست اور ۲۰ر ستمبر ۹۳ء (دو اقساط)

قابل صاحب کے انتقال کے (۳۱) سال بعد --- محسن بھوپالی اور ان کے صحافی دوستوں کی نوازشیں

محسن بھوپالی کا پہلا خط

(ایڈیٹر۔قومی اخبار کے نام)

(مطبوعہ "ہفتہ وار میگزین ۹ر جولائی ۹۳ء)

کوئی دو تین ہفتے قبل کی بات ہے، عزیزم عارف شفیق نے ایک ملاقات میں "قومی اخبار" میں قابل مرحوم کے سلسلے میں حمایت علی شاعر صاحب کے خط اور جوابی قسط کا حوالہ دیا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد سے اب تک میں ہر ہفتے ان کی قسط کا بڑی دلچسپی سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ بعض پچھلی قسطیں بھی حاصل کرلی ہیں۔ چونکہ ان میں بہت سی یکطرفہ باتوں، گمراہ کن واقعات اور ادھورے حوالوں کی بنیاد پر اپنی صفائی میں میرے علاوہ دیگر ہمعصروں شمیم احمد (مرحوم)، ارتضیٰ عزمی، انوار احمد زئی وغیرہ کو ملوث کرنے کی اپنی سی کوشش کی گئی ہے اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ اس لئے جواب آں غزل (شاعر کی رعایت سے) کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ پھر بھی چند ایک باتوں اور بعض واقعات کی اسی مرحلے پر وضاحت اور تصیح ہوجائے تو مناسب رہے گا۔ ان میں سرفہرست حمایت صاحب کا جام شورو کے مشاعرے میں قابل کی صدارت میں پڑھنے سے انکار اور انہیں مسند سے ہٹانے کا واقعہ ہے۔ جسے انہوں نے نہایت صفائی سے اپنے ایک مداح عزیزم کاظم رضا کے مضمون کے ایک پیراگراف کی گنجائش نکال کر ان کی زبانی ریکارڈ درست کروانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ ملاحظہ ہو "قومی اخبار میگزین ۲۰ر تا یکم جولائی کو صفحہ نمبر ۳۰ کالم ۲" حوالے کی چند سطریں دوبارہ پیش کی جاتی ہیں۔ میں اس حوالے اور دیگر کمیاب حوالوں کے لئے ان کا ممنون ہوں۔ محسن صاحب کے ممدوح (حمایت علی شاعر) نے احتجاج بھی کیا اور پھر بعد میں قابل اجمیری کی صدارت میں کلام بھی سنایا۔ واضح رہے کہ ممدوح کی وضاحت میں نے حمایت صاحب کی تشریح کی روشنی میں کی ہے۔

قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک بڑے جھوٹ کو پہلے اپنے مداح کے ذریعے حیدر آباد کے ایک اخبار میں چھپوایا (یہ حوالہ خود انہوں نے فراہم کیا ہے) پھر وقت پڑنے پر اسے اپنی قسط میں بغیر اپنے کسی کمٹ منٹ کے پیش کر کے لاکھوں قارئین کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ حمایت علی شاعر نے اس مشاعرے میں قابل اجمیری کی صدارت میں کلام سنایا تھا۔ جبکہ اس زمانے کے اخبارات میں واک آؤٹ کی خبریں شائع ہوئی تھیں۔ بعد میں کئی ہمعصروں٭ کے مضامین میں قابل اجمیری کی صدارت پر اعتراض اور پھر بغیر کلام سنائے مشاعرے سے چلے جانے کا ذکر آتا رہا۔ اس مشاعرے کے شرکاء میں مرزا عابد عباس، عظیم عباسی، لطیف ابد، حسن ظہیر، ضیاء اکبر آبادی، منذر حسین، سعید احمد سعیدی وغیرہ اور سینکڑوں سامعین ماشاء اللہ حیات ہیں۔ جنہوں نے اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ثبوت کے لئے ۱۷ اگست کا تراشہ منسلک ہے۔ اسی قسط میں شاعر صاحب نے تنقیدی نشست کے حوالے سے جس مصرعے کا ذکر کیا ہے وہ مصرعہ زیر بحث آیا ہی نہیں تھا بلکہ وہ قابل کا ایک اور شعر تھا جسے باقی صدیقی کا شعر بتایا گیا تھا جو کہ بعد میں غلط ثابت ہوا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ پچھلی ایک قسط میں ساجد امجد صاحب کی ایک صراحت نظر سے گزری ہے۔ انہوں نے میرے تعلق سے وضاحت کرتے ہوئے نہ جانے کس طرح یہ جملہ لکھ دیا کہ "اس تحریر میں قابل اجمیری کے ایک ہمعصر جناب محسن بھوپالی کے مشورے خاص طور پر شریک تحریر رہے"۔ حمایت صاحب نے اس جملے کو بنیاد بنا کر پہلے مجھے مشیر پھر مشیر خاص کا سیاسی عہدہ دے کر کم و بیش ہر قسط میں اپنی ادبی اور فلمی دنیا کی فتوحات کے ذکر کے ساتھ ساتھ ضمناً میرا اور قابل کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ریکارڈ درست رکھنے کے لئے عرض ہے کہ میں نے ساجد امجد صاحب کو ان کے تحقیقی اور سوانحی مضمون کے سلسلے میں ان کے کہنے پر دو ایک بار معلومات ضرور فراہم کیں اور

٭ کاش محسن صاحب کچھ "ہم عصروں" کے مضامین کے حوالے بھی دے دیتے۔۔۔(مرتب)

بعض رسائل کی نشاندہی کی جس کی ذمہ داری میں قبول کرنے کے لئے تیار ہوں۔ واضح رہے کہ ادبی محاورے میں مشورہ یا مشورے کا لفظ کسی بھی ادیب یا شاعر کو اس کی نثری یا شعری تخلیق کی نوک پلک درست کرنے، لفظوں کی نشست ٹھیک کرنے یا عروض و قواعد کی رو سے رہنمائی کرنے اور نثر کی مناسبت سے بیان کو مختصر کرنے، کاٹ دار بنانے یا نرم کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ سو اس تشریح کی رو سے میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ مذکورہ سوانحی مضمون اشاعت سے پہلے کسی بھی شکل میں میری نظر سے نہیں گزرا تھا۔ امید ہے حمایت صاحب اس وضاحت کو کافی پائیں گے۔ اس طرح ایک قسط میں انہوں نے قابل کو عمر میں اپنے سے چھوٹا لکھا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ قابل صاحب بڑے نہیں تو ہم عمر ضرور تھے۔ ملاحظہ ہو دیباچہ "آگ میں پھول" پہلا ایڈیشن جس میں حمایت صاحب لکھتے ہیں ۱۹۵۶ء میں ڈرتے ڈرتے میری عمر چھبیسویں برس میں قدم رکھ رہی ہے جبکہ قابل اجمیری بھی ۱۹۵۶ء میں ۲۵ برس کے تھے (تاریخ پیدائش ۱۹۳۱ء) اسی طرح انہوں نے ایک قسط میں قابل کے انتقال کے بعد ان کے ذریعے مجھ پر شہرت حاصل کرنے کا الزام لگایا ہے۔ اس سلسلے میں مختصر عرض ہے کہ ۱۹۶۱ء میں میرا شعری مجموعہ "شکست شب" شائع ہو چکا تھا۔ جس کی پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار نظر کامرانی کنوینر فن کدہ کے زیر اہتمام حیدر آباد کے سب سے بڑے ہوٹل رٹز میں تقریب اشاعت ہوئی تھی۔ قابل کی زندگی میں ہی میرے بعض اشعار مجھے پاکستان گیر شہرت عطا کر چکے تھے۔ قابل صاحب کو ہم اپنی ادبی محفلوں میں اکثر بلایا کرتے تھے اور ان سے ذاتی تعلقات تھے۔ یہ مثال بے محل نہ ہوگی کہ کنوینر "مجلس یادگار قابل" کی حیثیت سے میں نے رفقاء کے تعاون سے دیدہ بیدار کی اشاعت کا اہتمام کیا تو اس کے پیش لفظ کو میں اپنے روابط کے علاوہ اپنی اور قابل کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں اپنے نام سے تفصیل کے ساتھ لکھ سکتا تھا۔ لیکن میں نے اس سے عمداً گریز کرتے ہوئے پیش لفظ والا صفحہ لکھ کر آخر میں لفظ "ناشرین" کتاب کروایا تھا۔ میرے ایک مضمون کی بار بار

"خامہ بگوش" کا کالم (ا) پڑھ لیجئے۔ اسی کتاب میں شامل ہے (مرتب)

اشاعت کا ذکر انہوں نے منصوبے کے طور پر کیا حالانکہ یہ ان پرچوں اور اخباروں کی ضرورت رہی ہوگی۔

آخر میں اس خط کے ذریعے حمایت صاحب کو اس پر یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ان کے لئے میرے دلی جذبات اور احساسات آج بھی وہی ہیں جن کی جھلک میرے سفرنامے حیرتوں کی سرزمین مطبوعہ ۱۹۹۲ء میں ملتی ہے۔ ساتھ ہی ان سے کم و بیش چالیس سال کی طویل رفاقت کے ناتے ایک گلہ کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے ایک قسط میں ساجد امجد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ "وہ اس سوانحی مضمون کو قلمبند کرنے سے پہلے ان سے تو معلوم کرلیتے۔ تاکہ دوسرے رخ سے بھی آگاہی ہوجاتی۔" میں بھی بجا طور پر ان سے یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ وہ بھی یکطرفہ جوابی کارروائی کرنے سے پہلے مجھ سے[4] تو پوچھ لیتے جس کا انہیں حق حاصل تھا۔۔۔اور ہے!

— : غور طلب : —

(مشاعرہ جام شورو۔ ۱۹۶۱ء)

○ محسن صاحب نے اپنے خط میں جن شعراء کے نام گنائے ہیں' وہ یہ ہیں۔ مرزا عابد عباس۔ عظیم عباسی۔ لطیف ابد۔ حسن ظہیر۔ ضیا اکبر آبادی۔ منذر حسین اور سعید احمد سعیدی وغیرہ

○ مشاعرے کی رپورٹ میں جن شعرا کی شرکت کا ذکر ہے' وہ یہ ہیں۔ پروفیسر عظیم عباسی۔ محسن بھوپالی۔ مظہر عرفانی۔ غنی دہلوی۔ کریم رازی۔ فضا جلالوی اور اصغر عابدی جن کا کلام بہت پسند کیا گیا۔ صدارت قابل اجمیری نے کی تھی مگر ان کے کلام کا کوئی حوالہ نہیں۔ (مطبوعہ "رہنما" ۲۷؍اگست ۶۲ء)

○ "یادگار گروپ فوٹو" میں جو شعرائے کرام تشریف فرما ہیں' وہ یہ ہیں۔ علی احمد۔ ضیا اکبر آبادی۔ قابل اجمیری۔ محسن بھوپالی۔ بلیغ رامپوری۔ یونس شرر۔ سعید احمد سعیدی اور عبدالطیف ابد وغیرہ۔

یہ تینوں حوالے محسن صاحب کے فراہم کردہ ہیں اور سب میں "بیشتر" مختلف نام ہیں ظاہر ہے کہ مشاعرے کا احوال یہی شعرائے کرام جانتے ہوں گے مگر سوائے محسن بھوپالی صاحب کے ان میں سے کسی نے کبھی کچھ نہیں لکھا۔ (مرتب)

---

[4] ساجد امجد کے وضاحتی مکتوب کی شاعت کے ایک ماہ بعد حمایت صاحب کا مضمون چھپنا شروع ہوا۔ ساجد امجد نے اگر سوانحی ناول اور اپنے مکتوب میں غلط بیانی سے کام لیا تھا تو محسن صاحب اس کی تردید کرسکتے تھے (مرتب)

محسن بھوپالی کا دوسرا خط

(ایڈیٹر "قومی اخبار" کے نام)

(مطبوعہ "ہفتہ وار میگزین۔ ۱۶ اور ۲۳ جولائی ۹۳ء)

تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ پہلی بات اپنے خط سے متعلق ہے۔ تنقیدی نشست کے تعلق سے جس مصرع کا ذکر آیا ہے۔ حقیقتاً اس مصرع کا مکمل شعر زیر بحث آیا تھا۔ امید ہے کہ آپ یہ تشریح شامل اشاعت کریں گے۔ جیسا کہ میں نے اپنے ۲۷ جون کے خط میں لکھا تھا۔ حالانکہ حمایت علی شاعر صاحب کی قسطوں کا سلسلہ جاری ہے۔ اس لیے میں "جوابِ آں غزل" کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ اب جبکہ ان کی آخری قسط شائع ہو چکی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ ان کی بدگمانیوں اور ان کے نتیجے میں لگائے گئے الزامات کا جو براہ راست مجھ سے متعلق ہیں ضروری باتوں کے ساتھ جواب دوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے بھی صفائی کا موقع دیں گے۔

والسلام

مخلص محسن بھوپالی

میں اپنی بات ان کی پہلی قسط سے ہی شروع کروں گا۔ حمایت صاحب نے اس قسط میں اپنی کتاب "شخص و عکس" کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے "انہوں نے گزشتہ دس سال پہلے تک جو کچھ میرے ساتھ کیا میری کتاب شخص و عکس (مطبوعہ ۱۹۸۴ء) کا ایک گوشہ اس کا آئینہ دار ہے" مطالعہ کرنے سے پتہ چلا کہ یہ گوشہ چونکہ یکطرفہ تحریروں اور اپنی من پسند تاویلات پر مشتمل ہے اس لیے ایک اور گوشے کا متقاضی ہے۔ جس کا "قومی اخبار" متحمل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح انہوں نے ریکارڈ درست کروانے کی خاطر "کلیم"

سکھر میں میرے ایک مضمون کو جوان کے ساتھ ایک شام میں پڑھا گیا تھا اور ۱۹۷۰ء میں جنگ راولپنڈی میں شائع بھی ہو چکا ہے ۱۴ سال بعد (۱۴ر اکتوبر ۸۳ء) دوبارہ چھپوا کر اور پھر جواب کے طور پر تفصیلی خط لکھ کر (مطبوعہ "کلیم" سکھر ۱۱ر نومبر ۱۹۸۳ء) انہوں نے بیس برس پرانے واقعات کو دوبارہ زیر بحث لانے پر اکسایا تھا۔ چنانچہ اس کا جواب ہی میں نے ایک کھلا خط (مطبوعہ "کلیم" سکھر ۳۰ر مارچ ۱۹۸۴ء) لکھا تھا۔ ادھر ایک رسالے "دائرے"٭ شمارہ ۸/۱۹۸۳ء میں انہوں نے سرشار صدیقی صاحب پر مضمون لکھتے ہوئے ان کے شعر میں میرے ایک شعر کی "حیرت انگیز مماثلت" کا ذکر کرتے ہوئے اختلاف کو ہوا دینے میں ایک مرتبہ پھر پہل کی' چنانچہ میں نے اپنے مذکورہ بالا جوابی خط میں ان کی ایک ثلاثی اور حضرت سیماب اکبر آبادی (المتوفی ۱۹۵۱ء) کے ایک شعر میں حیرت انگیز مماثلت کا ذکر کرتے ہوئے اپنے طور پر معاملہ ختم کر دیا تھا۔ وہ ثلاثی اور شعر یہ تھا۔

عقیدت کچھ بنادے ورنہ پتھر صرف پتھر ہے
حرم کے در میں ہو یا بت کدے کے آستانے میں

حضرت سیماب اکبر آبادی

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت تراش لے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت سنوار دے تو یہی خدا ہے

اس قسط میں آگے چل کر وہ میرے مضمون "چند یادیں" کی مختلف رسائل میں اشاعت کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں "قابل کے انتقال کے ۵ سال بعد "گہوارہ" قابل نمبر ۷۶ء میں بھی جو مضمون میرے خلاف لکھا تھا اس میں میرا نام لکھنے کی جرات نہیں کی تھی۔"

اس سلسلے میں عرض ہے کہ جس شخص نے پانچ برس پہلے بھرے مشاعرے میں قابل

٭ "دائرے" نہیں "الفاظ" ایڈیٹر۔ نسیم درانی (مرتب)

صاحب کو دوبارہ صدارت کا اعلان کرکے انہیں مشاعرے کی صدارت جاری رکھنے کا اعلان کرکے ڈنکے کی چوٹ پر اپنی قوت ارادی اور جرات کا مظاہرہ کیا تھا (حوالہ مضمون "چند یادیں") وہ کیا مضمون میں ان کا نام نہیں دے سکتا تھا جبکہ ان کا نام مشاعرے کی روداد مطبوعہ "رہنما" ۱۷ اگست ۶۲ء میں بھی اس پورے واقعے کے ساتھ شائع ہوچکا تھا۔ میں نے اخلاقاً" ان کا نام دینے سے گریز کیا تھا۔ طالب علم ڈائجسٹ کے قابل نمبر مطبوعہ فروری ۱۹۷۰ء کے مرتب محمد حسین قریشی نے قابل پر اس وقت تک شائع ہونے والے مختلف مضامین کو یکجا کرکے شائع کیا تھا ان میں فرمان فتحپوری صاحب کا وہ مضمون بھی شامل تھا جو ابو مسلم صحافی کے رسالے "مشرب"* میں بہت پہلے شائع ہوچکا تھا۔ چنانچہ میرے مضمون کو دوبارہ شائع کرنے میں مجھے تو کوئی خصوصیت نظر نہیں آتی۔ ہاں روزنامہ "پاسبان" میں ۱۵ برس بعد ۵ نومبر ۸۵ء میں مذکورہ مضمون چھپوانے، پھر جوابی مضمون شائع کروا کر ریکارڈ درست کرانے میں مجھے "شعوری" کوشش ضرور کارفرما نظر آتی ہے۔ جس کے بارے میں میرا تجزیہ آگے آئے گا۔ آگے چل کر حمایت صاحب لکھتے ہیں "پھر یہی مضمون اقتباس کی صورت میں "کلیات قابل" مطبوعہ ۱۹۹۲ء میں شہزاد احمد کی معرفت شامل کیا گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کلیات قابل کا ابتدائیہ لاہور کے ایک شاعر سے کیوں لکھوایا گیا جس نے قابل کو کبھی دیکھا نہ کبھی ان سے ملا جو کبھی حیدرآباد میں رہا ہی نہیں، مقصد صاف ظاہر ہے جس طرح ڈاکٹر ساجد امجد نے محسن بھوپالی کی باتوں پر اعتبار کرکے یہ ناول لکھ دیا، شہزاد احمد بھی ان کے مضمون کو معتبر سمجھ لیں اور اس کے اقتباسات اپنے ابتدائیہ میں شامل کردیں۔ اس طرح قابل مرحوم کی آخری کتاب کو بھی محسن بھوپالی نے اپنی تشہیر کا ذریعہ بنایا۔ اور میرے خلاف ایک "جھوٹ" کو سچ بنانے کی ایک اور کوشش کرلی۔" میں اس پوری سچویشن کی تخلیق پر حمایت صاحب کو داد دیتا ہوں۔ وہ چونکہ ایک مدت تک فلمی دنیا سے وابستہ رہے ہیں اس لیے انہوں نے کلیات قابل کی اشاعت میں شہزاد احمد کے انتخابات، ان کے دیباچے کی شمولیت اور دیباچے میں میرے مضمون کے اقتباس کے حوالے کو میرے کھاتے میں ڈال

---

* یہ فرمان صاحب کا "مشرب" والا مضمون نہیں تھا ------ نیا مضمون تھا۔ (مرتب)

کر مجھے کلیات قابل کو اپنی تشہیر کا ذریعہ بنانے کے الزام سے نوازا ہے۔ میں نے تو اپنی مرتب اور شائع کردہ "دیدۂ بیدار" کو مواقع حاصل ہونے کے باوجود تشہیر کا ذریعہ نہیں بنایا۔ ملاحظہ ہو میرا خط مطبوعہ ۹؍ جولائی قومی میگزین جبکہ حمایت صاحب اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ کلیات قابل، سلیم جعفری صاحب نے دبئی میں جشن قتیل کے موقع پر مئی ۱۹۹۲ء میں اپنے وسائل سے شائع کی تھی۔ سلیم جعفری سے ان کے تعلقات مجھ سے بہت پہلے سے ہیں۔ سلیم جعفری نے دو ماہ پہلے انہیں جشن جگن ناتھ آزاد میں مدعو کیا تھا۔ وہ ان سے براہ راست لاہور کے شاعر سے دیباچہ لکھوانے کی وجہ اور اس میں میرے مضمون کے اقتباس کے "ٹوٹے" (فلمی اصطلاح میں) کو استعمال کرنے اور ترغیب دلانے والے کے بارے میں معلومات حاصل کرسکتے تھے۔ پھر شہزاد احمد بھی ان کے لیے کوئی اجنبی نہیں ہیں۔ ایک مدت تک وہ ریڈیو اور ٹی وی سے وابستہ رہے ہیں۔ پھر لاہور کے علاوہ پاکستان اور بیرون ملک مشاعروں میں بھی اکثر ان سے ملتے رہے ہیں۔ ان سے ہی پوچھ لیا ہوتا کہ محسن کے مضمون کے اقتباس کو استعمال کرنے کے لیے ان سے کس نے کہا کہ ان کا دیباچہ بلکہ کلیات ہی محسن بھوپالی کی تشہیر کا ذریعہ بن گئی۔ مجھے بزعم خود اس غلط سمت میں کی گئی سراغ رسانی سے جو دلی تکلیف ہوئی ہے اس کا اندازہ وہ خود مجھ سے بہتر طور پر کرسکتے ہیں کہ

گھائل کی گت گھائل جانے!

اس الزام کے بعد وہ آگے چل کر مذکورہ ناول (ساجد امجد کے سوانحی مضمون) کی اشاعت کو بھی اس منصوبے کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "۱ اکتوبر ۹۲ء میں "سرگزشت[1]" میں پورا ناول شائع کیا گیا" کیا میں ان سے پوچھ سکتا ہوں کہ قضیہ زمین برسر زمین کے علاوہ صحافتی اصول کے مطابق بھی جب یہ ناول ایک رسالے میں شائع ہوا تھا تو انہوں نے مارچ ۹۳ء تک یعنی کامل چھ ماہ تک اس رسالے یعنی "سرگزشت[1]" ڈائجسٹ کے مدیر سے کسی مصلحت کے تحت نہ کسی قسم کا تعرض کیا اور نہ ہی تردید شائع کروائی۔ ان جیسے مستعد اور باخبر شخص کی اس "بے خبری" کو ذہن قبول کرنے کے لیے

---

[1] حمایت صاحب نے لکھا ہے کہ انہوں نے یہ سوانحی ناول "قومی اخبار" میں پہلی بار پڑھا تھا۔ (مرتب)

تیار نہیں۔ آگے چل کر "نوائے وقت" میں شائع ہونے والے انٹرویو کا حوالہ دیتے ہوئے حمایت صاحب نے مجھ پر یہ الزام بھی لگایا ہے کہ میں نے اپنے ذاتی تعلقات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ادبی صفحہ کے انچارج سے مذکورہ اخبار میں ان کے نام کی جلی سرخی بھی لگوائی۔ اس ضمن میں عرض ہے ہائی لائٹ یا ذیلی سرخی لگانے کا کام صفحہ کا انچارج اپنی صوابدید پر لے آؤٹ کے مطابق کرتا ہے۔ حمایت صاحب کا اس حد تک شک کرنا میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ یہ انٹرویو نسیم تقوی صاحب نے لیا تھا۔ وہ مجھے بھی کراچی نہیں بلکہ حیدر آباد سندھ سے اتنی ہی مدت سے جانتے ہیں جتنی مدت سے حمایت صاحب کو۔ وضاحت کے طور پر بتاتا چلوں کہ میں نے نسیم تقوی کے سوال کا جواب اس جملے سے شروع کیا تھا "بھائی آپ یہ پنڈورا بکس نہ ہی کھولیں تو بہتر ہے" پھر جن باتوں کو دہرایا تھا ان کا اختتام اس جملے پر ہوا تھا "لیکن یہ سب باتیں جیسا کہ میں پہلے بھی کہیں لکھ چکا ہوں آج سے تیس بتیس برس پہلے کی ہیں جب بقول کسے آتش جوان تھا!" اس پیرایہ جواب سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ میں نے اس طرح کے سوال پر اصرار کیا تھا یا انٹرویو کرنے والے کے سوال کو محدود کرتے ہوئے بارہا شائع ہونے والے واقعات کا مختصر طور پر اظہار کیا تھا۔ قسط نمبر۲ مطبوعہ ۱۰ر تا ۱۷ر جون ۹۳ء میں حمایت صاحب نے پہلے تو ایک الزام "۔۔۔ ایسی حرکات اور ایسے واقعات اس سے متعلق کردیئے جو عموماً خود محسن بھوپالی کیا کرتے تھے۔" پھر ان حرکات اور واقعات کی مثال میں اپنے مداح کاظم رضا کے مضمون "پاسبان" مطبوعہ ۱۲ر نومبر ۸۵ء کا ایک اقتباس پیش کیا ہے "میں نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا ہے کہ محسن صاحب مشاعرہ گاہ میں پہنچنے کے باوجود اس وقت تک پنڈال سے باہر ٹہلتے رہتے تھے جب تک ان کے ممدوح کا نام (یعنی حمایت علی شاعر۔ محسن) نہ پکار لیا جائے۔ مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ انہیں اپنے ممدوح کے بعد کلام سنانے کا موقع میسر آجائے۔" میری اس حرکت کو صاحب مضمون نے بقول ان کے اکثر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور لطف کی بات یہ ہے کہ کسی ایک بھی مشاعرے کا حوالہ نہیں دیا جس میں مجھے حمایت علی شاعر کے بعد پڑھایا گیا ہو۔ انہوں نے یہ بھی نہیں لکھا

کہ وہ اکثر پنڈال کے باہر کیوں کھڑے رہتے تھے! خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی اس طرح کا مفروضہ ہے جبکہ حمایت صاحب کا جامشورو کے مشاعرے میں احتجاج کے باوجود قابل کی صدارت میں پڑھنے کا واقعہ گھڑا گیا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ایسا صرف ایک بار ہوا تھا۔ وہ تھا میمن انجمن کالج کا سالانہ مشاعرہ اس میں جب میرے بعد حمایت صاحب نے میری طرف دیکھ کر بدل جاتے ہیں لوگ سنبھل جاتے ہیں لوگ والی غزل پڑھی تو حاضرین میں سے بہت سوں نے مجھے دوبارہ پڑھوانے پر اصرار کیا۔ میں نے مائیک پر آکر دوبارہ کلام سنایا۔ روزنامہ ''حریت'' کراچی ۱۹ دسمبر ۶۲ء میں اس مشاعرے کی روداد دیکھی جاسکتی ہے اور یہ اشعار بھی۔

شاعر ان کی دوستی کا اب بھی دم بھرتے ہیں آپ
ٹھوکریں کھا کر تو کہتے ہیں سنبھل جاتے لوگ

شاعر

بہتر ہے کہ اس بزم سے اٹھ آیئے محسن
سرقے کو جہاں رتبہ الہام دیا جائے

محسن بھوپالی

ان اقتباسات اور کاظم رضا کے مذکورہ مضمون کو الف سے ے تک پڑھنے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ یہ سب ریکارڈ درست کروانے کی ایک اور کڑی تھی۔ کاظم رضا نے اپنے مضمون میں ۶۲ء میں منعقد ہونے والے مشاعرے اور اس سال منعقد ہونے والی تنقیدی نشست کا اپنے آپ کو عینی شاہد لکھا ہے جبکہ ان کی عمر بمشکل بارہ تیرہ[1] برس رہی ہوگی کہ وہ انور احمد زئی کے ہم عمر تو نہیں ان سے بڑے بھی نہیں ہیں بہرحال اس عمر میں تقدیم و تاخیر کے رموز کو سمجھنا' صدارت پر کسی کو بٹھانے کے لیے سازباز کرنے اور دیگر ہتھکنڈے استعمال کرنے کی جانکاری اور پھر تنقیدی نشست کے حوالے سے اس کے آداب اور طریقہ کار کا علم ہونا ایک عام قاری کو متعجب کر دینے کے لیے کافی ہے۔ مثلاً اسی مضمون کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے ''میں اس نشست میں

---

[1] سید کاظم رضا اگر انوار احمد زئی کے ہم عمر بھی تھے تو مشاعرہ جام شورہ ۶۱ء میں ان کی عمر ۱۷ یا ۱۸ سال کی

موجود تھا۔ قابل مرحوم کے ایک شعر پر کہا گیا تھا کہ قابل صاحب کا مذکورہ شعر باقی صدیقی کے ایک شعر کا چربہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات تنقیدی نشست میں کہی گئی تھی۔ ہم تنقیدی نشستوں کے انداز و مزاج سے واقف ہیں۔ وہاں ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی کبھی محض گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے ایسا کرنا پڑتا ہے۔" (یہ تو وہی مثل ہوئی کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔ محسن) یہ عبارت صاف چغلی کھاتی ہے کہ یہ سب شاعرانہ تخیل کی کاریگری ہے اور کچھ نہیں۔ اس شبہ کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ مذکورہ تنقیدی نشست کی روداد مطبوعہ ۱۰ر اگست ۶۲ء میں کاظم رضا سے منسوب ایک تنقیدی جملہ یا ایک فقرہ بھی شائع نہیں ہوا ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے جبکہ وہ نشست میں موجود بھی تھے اور مضمون سے مترشح ہونے والی تنقیدی بصیرت بھی رکھتے تھے! ۸۵ء میں حمایت صاحب سندھ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے وہ اکثر و بیشتر اپنے عزیز دوست شاکر جعفری (صدر چیمبر آف کامرس حیدرآباد) کے دفتر میں بھی آیا جایا کرتے تھے۔ کاظم رضا اسی دفتر میں آفس سیکریٹری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ممکن ہے اسی ملاحظے میں انہوں نے ڈکٹیشن لے لیا ہو۔ اور پھر ریکارڈ کو از سر نو درست کرنے کے منصوبے کے تحت "پاسبان" میں ایک ہفتے میرا مضمون اور فوراً دوسرے ہفتے اس میں بیان کردہ واقعات کی اپنے طور پر تردید اور تشریح کر کے دوسرے ہی ہفتے چھپوا دیا گیا (کہ یہ سب کچھ حیدرآباد میں رہتے ہوئے ہی ممکن تھا) اور یہ اطمینان حاصل کر لیا گیا کہ اب سب کچھ ٹھیک ہے۔ کاظم رضا کی یقیناً کچھ اور بھی مجبوریاں رہی ہوں گی۔ ایسا کرتے ہوئے وہ یہ بھول گئے کہ ان کی نائب ادارت (کاظم رضا ہفت روزہ "فکر و عمل"[1] کے نائب مدیر تھے) میں شائع ہونے والے پرچے کے قابل نمبر ۳۰ر ستمبر ۷۷ء میں قابل کے تعلق سے اداریہ بھی شائع ہو چکا ہے جو ان کے ذہن کا عکاس اور ان کے پرچے کی پالیسی کا مظہر ہے (ملاحظہ ہو اداریئے کا عکس) اس شمارے میں احمد رئیس کے مضمون "قابل اجمیری کی یادیں" کے پہلے پیراگراف کا حوالہ بے محل نہ ہوگا۔ قابل مرحوم کے تعلق سے میرے رفقاء اور میری جو تھوڑی بہت خدمات رہی ہیں ان پر روشنی پڑتی ہے۔

---

[1] فکر و عمل" میں حمایت صاحب کا کہیں ذکر نہیں ---- اس کے ایڈیٹر انجم اجمیری تھے۔ (مرتب)

"قابل اجمیری کی پندرہویں برسی ہے دیکھئے اس موقع پر قابل کے عقیدت منداور پرستار اپنے محبوب شاعر کو کس انداز سے خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ مجلس یادگار قابل کے کنوینر جناب محسن بھوپالی اور ان کے وہ رفقاء خاموش ہیں جن کی سعی و کوشش سے حیدر آباد میں یوم قابل کی روایت کا آغاز ہوا تھا۔ اور قابل کے دو شعری مجموعے "دیدۂ بیدار" اور "خون رگ جاں" منصۂ شہود پر آئے تھے۔ اور "طالب علم ڈائجسٹ" کا قابل نمبر نہایت اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ جس میں قابل کا بہت سارہ کلام بھی یکجا کیا گیا ہے جو ان کے دو مجموعوں میں شامل نہیں تھا۔"

واضح رہے کہ ۶۸ء میں میرا تبادلہ کراچی میں ہوگیا تھا۔ پھر بھی رفقاء کی کاوشوں میں ہاتھ بٹاتا رہا تھا۔ ملاحظہ کیجئے "اظہار تشکر" از مرتب قابل نمبر طالب علم ڈائجسٹ مطبوعہ ۱۹۷۰ء عقل حیران ہے کہ کاظم رضا کی ادارتی ذمہ داریوں کے ساتھ شائع ہونے والے پرچے میں شامل ان تحریروں پر بھروسہ کرے یا پھر پاسبان ۱۲ر نومبر ۸۵ء میں شائع ہونے والے مضمون پر جو میرے اس مضمون کے جواب میں لکھا گیا جو گہوارہ ۶۷ء میں اور پھر "طالب علم ڈائجسٹ" قابل نمبر مطبوعہ ۷۰ء میں شائع ہوا۔ اور جس کی تردید اور تکذیب کے لیے انہوں نے ۱۵برس کا طویل عرصہ لیا جبکہ وہ حیدر آباد سندھ کے باشندہ ہیں اور آج بھی وہیں مقیم ہیں۔

کلیات قابل کی اشاعت اور اس میں شامل شہزاد احمد کے دیباچے کے ذریعے اپنی تشہیر کے الزام کا تذکرہ پہلے آچکا ہے۔ لیکن اس خیال کے تحت کہ حمایت صاحب حوالے اور ثبوت کے بغیر میرے بیان کو کافی نہیں سمجھیں گے، اس لیے میں نے شہزاد صاحب سے رجوع کیا تھا۔ انہوں نے بوجوہ جوابی خط محشربدایونی صاحب کو اور اس کی نقل میرے نام پوسٹ کی ہے۔ مذکورہ خط لفظ بہ لفظ درج ذیل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ خط کے مندرجات انہیں مطمئن کرنے اور میرے بیان کردہ حقائق کو سچ ثابت کرنے میں یقیناً معاون ثابت ہوں گے۔ شہزاد احمد صاحب نے اپنے خط کے آخری پیراگراف میں جو ہمدردانہ مشورہ دیا ہے، اسے قبول کرتے ہوئے میں کوشش کروں گا کہ اپنے خلاف

لگائے گئے اہم الزامات کا انتہائی اختصار کے ساتھ جواب دوں۔

حمایت صاحب نے قسط نمبر۲ مطبوعہ ۱۰ر تا ۱۷ر جون میں ہی ماہنامہ "زاویئے" میں میرے گوشے کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "زاویئے" میں قابل صاحب کا کوئی گوشہ شائع نہیں ہوا۔ ذرا سوچئے' قابل کے واقعی قدردان اور دوست کون تھے اور کون نمائشی؟ اگر حمایت صاحب مجلس یادگار قابل کی کسی کوتاہی کی نشاندہی کرتے تو میں کھلے دل سے اس کا اعتراف کرتا۔ انہوں نے "زاویئے" کا حوالہ دیا ہے جس کے ناشر اور مدیر حسن ظہیر تھے اور جس کی اعزازی مجلس مشاورت میں' میں اکیلا ہی نہیں بلکہ جناب مرزا عابد عباس اور جناب جبریل صدیقی بھی تھے۔ مدیر "زاویئے" نے ایک معینہ پالیسی کے تحت کسی نہ کسی بقید حیات ادیب و شاعر کی شخصیت و فن سے متعلق گوشہ مختص کرنے کا آغاز اپنے پہلے شمارے مطبوعہ نومبر ۱۹۶۵ء سے کیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس پہلے شمارے میں افسانہ نگار سلطان جمیل نسیم کی تصویر' ان کا افسانہ "دستک" اور ان کی شخصیت و فن پر جناب حمایت علی شاعر کا تحریر کردہ مضمون[1] شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں ترتیب وار گوشے اس طرح شائع کیے گئے: نقاد افسانہ نگار حشمت نیر' (شمارہ دسمبر ۶۵ء)' شاعر محسن بھوپالی (شمارہ ۸ر جنوری' فروری ۶۶ء)' شاعر عبداللہ جاوید (شمارہ سالنامہ ۶۶ء)۔ اس تفصیل سے صحیح صورتحال یقیناً واضح ہو گئی ہوگی۔ اور اب مجلس یادگار قابل کی کارکردگی۔ ۶۲ء سے ۶۸ء تک کے عرصے میں یعنی قابل صاحب کے انتقال کے بعد کے اس عرصے میں مجلس نے اپنے وسائل بروئے کار لاتے ہوئے جو کچھ کیا' اس کی تفصیل مختصراً اس طرح ہے۔ ۶۳ء میں قابل کی پہلی برسی پر "دیدۂ بیدار" کی اشاعت اور یوم قابل۔ اکتوبر ۶۴ء میں یوم قابل کا انعقاد۔ ۶۵ء میں ستمبر ۶۵ء کی جنگ کے مابعد اثرات کی وجہ سے یوم قابل نہیں منایا جاسکا۔ ۶۶ء میں مجلس یادگار قابل کے زیر اہتمام قابل کا دوسرا مجموعہ کلام "خون رگ جاں" کی اشاعت ۳ر اکتوبر ۶۷ء میں بڑے پیمانے پر یوم قابل کا انعقاد۔ اس دن پہلی نشست مقالات پر مشتمل تھی جس کی صدارت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے کی اور جس میں فرمان فتح پوری' مجتبیٰ حسین اور دیگر نقادوں نے اپنے

---

[1] سلطان جمیل نسیم پر حمایت صاحب نے یہ مضمون ۶۱ء میں لکھا تھا۔ "شخص و عکس" میں شامل ہے (مرتب)

مقالے پڑھے۔ اسی رات بڑے پیانے پر مشاعرہ ہوا جس میں کراچی اور سندھ کے نامور شعراء اور شاعرات نے شرکت کی اور پروفیسر مجتبیٰ حسین نے صدارت فرمائی۔ یہ تو تھی اس وقت تک کی کارکردگی۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ۶۸ء میں میرا تبادلہ کراچی ہوگیا تھا لیکن مجلس کے بعض احباب سے رابطہ قائم رہا۔ ۷۰ء میں محمد حسین قریشی نے اپنے رسالے طالب علم ڈائجسٹ کا ایک یادگار قابل نمبر شائع کیا جس کی اہمیت اور افادیت آج بھی مسلم ہے جبکہ حمایت صاحب ۵۶ء۔۵۷ء کے دوران اپنے ذاتی رسالے "شعور"[4] میں جو عبدالعزیز خالد پھر شیخ ایاز اور شمیم احمد کے ساتھ نکالا گیا تھا (واضح رہے کہ انہوں نے شمیم احمد کے نام کا حوالہ دینا پسند نہیں کیا تھا۔ ملاحظہ ہو قسط ۲ کالم ۵) اور جس کے تین شمارے شائع ہوئے تھے نہ قابل کا کلام دیا نہ ہی ان کا کوئی مضمون۔

قسط نمبر ۳ کالم ایک مطبوعہ ۱۸ر تا ۲۴ر جون میں یادگار مشاعروں کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں "۵۹ء سے یادگار مشاعروں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا تھا۔" اس جملے کے بعد انہوں نے مشاعرے کے گلدستے کی اشاعت اور اس میں اپنے حرف آغاز کا ذکر پھر قابل اجمیری اور میری مشاعروں میں شرکت اور آمدنی کے وسیلے کا ذکر ایسے گول مول انداز میں کیا ہے جیسے یہ مشاعرے حمایت صاحب کی کوششوں سے منعقد ہوئے۔ میں اور قابل ان کی ایماء پر بلائے گئے اور ہم دونوں کی آمدنی کا وسیلہ بھی بنے۔ سبحان اللہ! (حالانکہ انہیں ہم تینوں کی آمدنی کا وسیلہ لکھنا چاہیے تھا۔) حمایت صاحب کی اس ادھوری تحریر کے بعد ضروری ہوجاتا ہے کہ ان مشاعروں کا صحیح پس منظر بیان کردیا جائے۔ اس زمانے میں (۵۹ء تا ۶۱ء) حیدر آباد کے کمشنر جناب نیاز احمد تھے۔ (کاش حمایت صاحب ان کے لیے ایک جملہ ہی لکھ دیتے!) وہ عام بیوروکریٹ کی طرح نہیں تھے بلکہ وہ علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کے نہ صرف دلدادہ تھے بلکہ ان کی ترویج و ترقی کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتے تھے۔ چنانچہ حیدر آباد کا نیاز اسٹیڈیم' رانی باغ میں ارٹنگ اوپن ایئر تھیٹر اور پبلک اسکول حیدر آباد ان کی چند بہترین یادگاروں میں سے ہیں۔ اس طرح ثقافتی انجمن ارٹنگ کا قیام بھی انہی کی کوششوں کے نتیجے میں عمل میں آیا تھا۔ شعر و ادب کی

4۔ شعور کا پہلا شمارہ جون' جولائی ۵۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں عبدالعزیز خالد کا نام ہے نہ شمیم احمد کا' شمیم احمد کا نام ۵۷ء سے شامل ہوا قابل صاحب کے حوالے سے دیکھئے صفحہ (۱۲۳) "دوستی کی سزا" (مرتب)

ترویج کے لیے انہوں نے ہی یادگار مشاعروں کی داغ بیل ڈالی۔ ان کے بڑے بھائی محمد شعیب صاحب پاکستان کے وزیر خزانہ تھے۔ نیاز صاحب کی وجہ سے انہوں نے تینوں یادگار مشاعروں میں بہ حیثیت صدر شرکت کی جبکہ ان مشاعروں کے تینوں بار سیکریٹری مرزا عابد عباس ہی تھے۔ (حمایت صاحب نے ان کے ذکر سے بھی گریز کیا ہے۔) ان مشاعروں کے گلدستے باقاعدہ کتابی صورت میں شائع ہوئے۔1 "دود چراغ محفل" مشاعرہ ۵۹ء' مرتبہ مرزا عابد عباس اور حمایت علی شاعر۔2 "بوئے گل نالۂ دل" مشاعرہ ۶۰ء' مرتبہ مرزا عابد عباس۔3 "شمع ہر رنگ میں جلتی ہے" ۶۱ء' مرتبہ مرزا عابد عباس۔ واضح رہے کہ ان مشاعروں میں کراچی کے سوا سندھ کے منتخب شعراء کو ہی دعوت دی جاتی تھی اور اس سلسلے میں نیاز احمد صاحب اپنی صوابدید کا استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ سندھ سے مشاعرہ ۵۹ء میں عظیم عباسی' قابل اجمیری' حمایت علی شاعر اور میں نے شرکت کی۔ مشاعرہ ۶۰ء میں عظیم عباسی' قابل اجمیری' الیاس عشقی' مختار کریمی اور میں نے شرکت کی اور مشاعرہ ۶۱ء میں صبا اکبر آبادی' رعنا اکبر آبادی' الیاس عشقی' قابل اجمیری' حمایت علی شاعر' فرید جاوید' رضی ترمذی' مرزا عابد عباس اور میں نے شرکت کی۔ اس فہرست یہ اندازہ بھی بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ کن "جغادری" شعرا کو زحمت نہیں دی جاتی تھی! "بوئے گل نالۂ دل" اور "شمع ہر رنگ میں جلتی ہے" میں شعراء کے کلام سے پہلے مرزا عابد عباس کا تحریر کردہ خطبہ استقبالیہ شامل کیا گیا ہے جبکہ "دود چراغ محفل" میں مرزا عابد عباس صاحب کے استقبالیہ کے علاوہ ان کی ایک اور تحریر "چراغ وفا پہ کیا گزری" شامل ہے۔ علاوہ ازیں اسی کتاب میں حمایت صاحب کا "حرف آغاز" شریک اشاعت ہے جس میں انہوں نے بہ حیثیت مرتب و ناشر کتاب کی ترتیب اور اشاعت کے مراحل کا ذکر کیا ہے اور بس۔ تو یہ تھا پس منظر ان مشاعروں کا جو واقعی یادگار تھے اور یادگار رہیں گے۔ ان مشاعروں کے تذکرے کے بعد انہوں نے میری کتاب کی تقریب اشاعت پر اپنے اختلافی مضمون' کلام پر "اصلاح" اور اپنے آنچل کے متنازعہ نغمہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے جس پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے' اس کے جواب الجواب کے

لیے بھی ایک الگ گوشہ چاہیے جسے میں اپنی زیر ترتیب کتاب "مضامین محسن" کے ایک گوشے "عکس بر عکس" کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

ان کی چوتھی قسط کے مندرجات (جو مجھ سے متعلق تھے) ان کے بارے میں، میں اپنے پہلے وضاحتی خط مطبوعہ قومی میگزین ۹ر تا ۱۵ر جولائی ۹۳ء میں حوالوں کے ساتھ لکھ چکا ہوں۔ حمایت صاحب نے قسط نمبر پانچ مطبوعہ ۲ر تا ۸ر جولائی میں قابل کے مندرجہ ذیل شعر کے بارے میں مزید مثالیں رقم کی ہیں۔

اس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو
زندگی کتنی خوبصورت ہے

جبکہ اتنی تحقیق اور تدقیق کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ تنقیدی نشست میں حمایت صاحب نے کہا تھا "مجھے اس شعر کی خوبی سے انکار نہیں لیکن اس میں خیال کا توارد ہو گیا ہے' اس خیال کا ایک شعر میں نے باقی صدیقی کی غزل میں پڑھا ہے' غالباً یہ ہے:

اس کی محفل میں آئے تو جانا
زندگی کتنی خوبصورت ہے

قابل نے اس میں "دیکھو" کہہ کر ایک التزام ضرور پیدا کیا ہے مگر میں سوچ رہا ہوں' داد کسے دی جائے؟" جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا بیان غلط یادداشت پر مبنی تھا۔ باقی صدیقی نے ایسا کوئی شعر کہا' نہ ان کے مجموعوں میں موجود ہے۔ اس کذب بیانی[1] سے قابل کو یقیناً صدمہ پہنچا تھا جس کا اندازہ صرف ایک مثال سے ہو سکتا ہے۔ تنقیدی نشست کے بعد قابل صاحب' مرزا عابد عباس کے ہاں گئے تھے اور انہوں نے روتے ہوئے ساری روداد گوش گزار کی تھی۔

قسط نمبر پانچ ۲ر تا ۸ر جولائی ۹۳ء میں حمایت صاحب نے ایک ایسے مسئلے کو جس پر چھٹی دہائی میں ہندوپاک کے مختلف رسائل میں بحث و تنقید ہوتی رہی (یعنی ساحر کی نظم پرچھائیاں اور حمایت صاحب کی نظم بنگال سے کوریا تک) دوبارہ چھیڑا اور پھر اپنی مساعی اور ساحر سے ملاقات کا ذکر کر کے پرانی یادیں تازہ کردیں۔ جبکہ یہ مسئلہ بھی ایک الگ

---

[1] "غلط یادداشت" کو "کذب بیانی" کہنا کہاں تک درست ہے؟ (مرتب)

گوشے کا متقاضی ہے۔ جہاں تک میرے ریمارکس کا تعلق ہے تو میں پہلے بھی کلیم میں لکھ چکا ہوں کہ وہ مضمون (مطبوعہ روزنامہ جنگ راولپنڈی ۱۵ر دسمبر ۷۲ء) حمایت صاحب کے ساتھ ایک شام میں پڑھا گیا تھا جس میں وہی جذبہ کارفرما تھا جس کے تحت حمایت علی شاعر صاحب نے پچّیس نومبر ۶۱ء کو میری کتاب "شکست شب" کی تقریب رونمائی میں پڑھا تھا نہ کہ اس جذبے کے تحت لکھا تھا جس کے تحت انہوں نے "شکست شب" سے متعلق مضمون ریڈیو پر پڑھا تھا! اسی قسط کے پانچویں کالم میں قابل کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں سے متعلق کچھ لکھنے کے لیے ان کی موت کے انتظار کا طعنہ دے کر مجھے، ارتضٰی عزمی اور انوار احمد زئی کو ہدف بنایا ہے اور آگے چل کر انہوں نے قابل صاحب کے احباب میں رفیق ریواڑوی صاحب کا بھی نام لیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے، رفیق ریواڑوی صاحب کے خیالات! "سوال:۔ قابل اجمیری کو موت کے دہانے تک پہنچانے والے لوگوں میں کون لوگ پیش پیش تھے؟" جواب:۔ "قابل اجمیری ایک نہ بھولنے والی شخصیت ہے۔ اس نے واقعی زندگی سے بھرپور شاعری کی ہے۔ موت زندگی تو اللہ کے اختیار میں ہے لیکن قابل اجمیری کی شہرت اور ساکھ کو منافقین کے ایک ٹولے نے نقصان پہنچانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ اس زمانے میں سلطان ہوٹل اور جہانگیر ہوٹل میں شاعروں کی محفلیں جمتی تھیں۔ لوگوں نے میرے اور قابل کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ آخرکار ہمارے ایک مہربان عامر رضا کے توسط سے جب میرا اور قابل کا آمنا سامنا ہوا تو پھر تمام گلے شکوے دور ہو گئے اور غلط فہمی پیدا کرنے والوں کے چہرے سامنے آگئے۔ حمایت علی شاعر کی جنگ غلط فہمی کی بنا پر تھی۔ قابل کا خیال تھا کہ اس مارکیٹ میں میرا زیادہ اثر ہے جبکہ حمایت علی شاعر قابل سے آگے بڑھنا چاہتے تھے لیکن اصل صورتحال اس سے مختلف تھی کیونکہ قابل اجمیری غزل کے بہترین شاعر اور حمایت نظم کے خوبصورت شاعر تھے۔ دونوں اپنی اپنی اصناف میں ملکہ رکھتے ہیں۔ اختر انصاری اکبر آبادی نے قابل کے مخالفوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ برگ یوسفی بھی قابل سے خوش نہیں تھے۔ البتہ محسن بھوپالی، حمایت علی شاعر سے جنگ لڑنے کے لیے قابل

اجمیری کی ڈھال بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ شہر بڑا بد قسمت ہے۔ قابل اجمیری جیسے ہیرے کو اپنی منافقت سے وقت سے پہلے مٹی کے حوالے کردیا۔ قابل کو موت کے دہانے تک پہنچانے والے آج بھی اس کو نہیں مار سکے۔ قابل کے آج بھی بے شمار اشعار لوگوں کے حافظوں میں محفوظ ہیں اور اس کے حریفوں کے اشعار آج تک ان کے مجموعوں کے جزدان میں محفوظ ہیں۔" (انٹرویو رفیق ریواڑوی "نوائے وقت" کراچی ۲۷ مارچ ۸۳ء)

ایک اور اقتباس "حیدر آباد میں ایک وقت تھا قابل اجمیری سے اچھا غزل گو کوئی نہیں تھا لیکن برگ یوسفی اور حمایت علی شاعر اور ایسے ہی ناکام غزل گو شعرا نے ٹی بی کے آخری اسٹیج کے مریض قابل اجمیری کو مختلف مواقع پر اس قدر ذہنی صدمے پہنچائے کہ وہ پھر سنبھل نہ سکے۔ ادبی نشستوں میں قابل اجمیری کی غزلوں کو چربہ اور سرقہ قرار دیا گیا۔ مشاعروں میں ان کی صدارت پر اعتراض کیے گئے۔" (انٹرویو احمد ضیاء مطبوعہ ہفت روزہ "چٹان" لاہور ۶ دسمبر ۸۲ء) جبکہ احباب میں شامل انجم اجمیری کے خیالات کا عکس ان کے "فکر و عمل" کے اداریہ مطبوعہ ۳۰ ستمبر ۷۷ء سے ظاہر ہے۔

آخری قسط مطبوعہ ۹ تا ۱۵ جولائی میں انہوں نے قابل کے کلام اور شخصیت کا جس اخلاص اور دردمندی سے ذکر کیا ہے وہ واقعی قابل رشک ہے۔ کاش وہ اپنی ادارت میں شائع ہونے والے یا اپنی اعانت سے چھپنے والے رسالے "نئی قدریں" میں اتنی ہی لگاوٹ اور جذبے کی سچائی کے ساتھ کوئی مضمون[1] اس زمانے میں لکھ دیتے۔ انہوں نے اسی قسط میں اپنے کم و بیش آدھے درجن اشعار برمحل و بے محل استعمال کرکے اپنی ڈھارس بندھائی ہے۔ کیا مضائقہ ہے، اگر میں بھی اسی زمانے کے یادگار اشعار میں سے اپنا صرف ایک مقطع دہرا دوں:

محسن ہو مرے ساتھ اگر مجمع طفلاں
ہر شعر بڑا شعر ہو ہر بات بڑی بات

"دیدۂ بیدار" کی اشاعت کے سلسلے میں انہوں نے بیوہ کی مالی اعانت پر دکھ کا اظہار

---

[1] محسن بھوپالی صاحب نے بھی آج تک کوئی مضمون قابل صاحب کی شاعری پر نہیں لکھا (مرتب)

کیا ہے۔ صحیح صورتحال یہ ہے کہ میں اور رفقائے مجلس آخر تک محترمہ نرجس بیوہ قابل کو منع کرتے رہے اور اس پر اصرار کرتے رہے کہ دیدۂ بیدار کے جملہ مصارف احباب برداشت کر رہے ہیں لیکن جب انہوں نے گلوگیر آواز میں کہا کہ آپ لوگ میرے شوہر کی اس کتاب کی اشاعت میں مجھے شریک ہونے سے محروم کر رہے ہیں تو ہم نے انہیں بھی مالی معاونین میں شامل کرلیا تھا۔ وہ ماشاءاللہ حیات ہیں' ان سے اس امر کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔ آخر میں انہوں نے کلیات قابل کی اشاعت کے منصوبے سے لے کر اس کی اشاعت' دیباچہ' انتساب اور کلام پر ہر ہر طرح سے تنقید کی ہے اور بعض صورتوں میں بجا تنقید کی ہے لیکن یہ سب لکھیڑا انہوں نے یہ سمجھ کر اٹھائی کہ اس کی اشاعت میں محسن کا ہاتھ ہے حالانکہ شہزاد احمد صاحب کے خط سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ میں ان تمام مراحل سے لاعلم تھا۔ پھر بھی مزید تسلی کے لیے وہ اپنے اور میرے دوست سلیم جعفری سے رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔ انہیں سلیم جعفری یہ بھی بتائیں گے کہ میں نے کلیات موصول ہوتے ہی انہیں تفصیلی طور پر لکھا تھا جس میں ٹائٹل سمیت کتابت اور طباعت کو دوسرے درجہ کا بتاتے ہوئے بعض غزلوں کے دوبار چھپنے اور بعض ادھوری غزلوں کی نشاندہی کی تھی۔ سلیم جعفری صاحب کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ انہوں نے بذریعہ خط ان فروگزاشتوں کو تسلیم کیا تھا۔

اپنی گفتگو سمیٹتے ہوئے میں یہی کہوں گا کہ غلط فہمی کی بنیاد پر الزامات کی جس عمارت کو حمایت علی شاعر صاحب نے تعمیر کیا تھا' وہ کس قدر ناپائیدار نکلی! سچ ہے' حقائق کو وقتی طور پر توڑا مروڑا تو جاسکتا ہے' بدلا نہیں جاسکتا۔ چنانچہ آخر میں' میں اپنے پہلے وضاحتی خط مطبوعہ قومی اخبار نیوز میگزین ۹ر تا ۱۵ر جولائی ۹۳ء کا آخری پیراگراف دہرائے دیتا ہوں "حمایت صاحب کے لیے میرے دلی جذبات اور احساسات آج بھی وہی ہیں جن کی جھلک میرے سفرنامے "حیرتوں کی سرزمین" مطبوعہ ۱۹۹۲ء میں ملتی ہے۔ ساتھ ہی ان سے کم و بیش چالیس سال کی طویل رفاقت کے ناتے ایک گلہ کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے ایک قسط میں ساجد امجد صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ "اس سوانحی مضمون

کو قلمبند کرنے سے پہلے ان سے تو معلوم کر لیتے تاکہ دوسرے رخ سے آگاہی ہو جاتی۔"
میں بھی بجا طور پر ان سے یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ وہ بھی یکطرفہ جوابی کارروائی کرنے سے پہلے مجھ سے تو پوچھ لیتے جس کا انہیں حق حاصل تھا اور ہے!"
امید ہے کہ وہ اس صراحت کو کافی سمجھیں گے جو یقیناً مستحسن نہ سہی لیکن ریکارڈ درست رکھنے کے لیے ضروری تھی۔

ریکارڈ درست رکھنے کی خاطر

"قومی اخبار" کے ہفتہ وار میگزین میں محسن بھوپالی صاحب کے ان "جوابی خطوط" کے ساتھ کچھ تصاویر اور بعض رسائل کے تراشے بھی شائع کئے گئے ہیں۔ ۹ جولائی ۹۳ء کے شمارے میں محسن صاحب کے پہلے خط کے ساتھ پندرہ روزہ "رہنما" (حیدر آباد) کے "ضمیمے" (مورخہ ۱۷ اگست ۶۲ء) کے تراشے کی فوٹو کاپی شامل ہے۔ جس میں "مشاعرہ جام شورو" کی رپورٹ دی گئی ہے۔
محسن صاحب کے دوسرے خط کی آخری قسط (مورخہ ۲۳ جولائی ۹۳ء) کے ساتھ "مشاعرہ جام شورو" کا گروپ فوٹو شامل ہے۔ جس پر سے تاریخ مشاعرہ نکال دی گئی ہے 'کیوں؟
شاید محسن صاحب یہ تاثر دینا چاہتے ہوں کہ وہ مشاعرہ "انہی دنوں" ہوا تھا مگر وہ بھول گئے کہ یہی "گروپ فوٹو"---- "تاریخ مشاعرہ کے ساتھ" انہوں نے کسی اور رسالے میں بھی چھپوا رکھا تھا اور اس جلی سرخی کے ساتھ **(یادگار گروپ فوٹو۔مشاعرہ جام شورو ۶۱ء)**
(مطبوعہ۔ طالب علم ڈائجسٹ۔ قابل نمبر۔ فروری ۷۰ء) اندرونی سرورق پر۔ یعنی "۶۱ء کے مشاعرے کی رپورٹ اگست ۶۲ء میں" اور وہ بھی ایک رسالے کا "ضمیمہ" نکال کر شائع کی گئی۔ سبحان اللہ!

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

محسن صاحب کی انہی "کارگزاریوں" کا تجزیہ محترم عالم ذکریا صاحب نے اپنے جوابی مضمون میں نہایت مدلل انداز میں کیا ہے۔ افسوس کہ یہ مضمون "قومی اخبار" میں---- "بوجوہ" شائع نہیں کیا گیا۔ اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیے۔ (مرتب)

"مشرب" (مئی ۵۵ء) میں فرمان صاحب کا مضمون "شاعر سندھ" شائع ہوا تھا "طالب علم ڈائجسٹ" میں نیا مضمون ہے جو ان کے انتقال کے بعد لکھا گیا تھا۔ محسن صاحب نے اپنے مطبوعہ مضمون کی شمولیت کے لئے خواہ مخواہ ایک "جھوٹ" کا سہارا لیا (مرتب)

"فکر و عمل" کا اداریہ اس کے ایڈیٹر انجم اجمیری کا تحریر کردہ تھا۔ اس میں حیدر آباد کی عمومی ادبی فضا کا جائزہ لیتے ہوئے قابل صاحب سے ہمدردی جتائی گئی تھی۔ کسی مخصوص شخص کی طرف کوئی اشارہ نہیں تھا۔۔۔ کاش انجم اجمیری زندہ ہوتے تو ان سے پوچھ بھی لیا جاتا۔۔۔۔مگر۔۔۔۔ سید کاظم رضا (نائب مدیر) تو بفضل خدا سلامت ہیں سید کاظم رضا نے "فکر و عمل" میں محسن صاحب کا مضمون نہیں چھاپا ۸۵ءمیں قابل صاحب کی برسی پر محسن صاحب کا ۶۷ء میں لکھا ہوا وہی مضمون روزنامہ "پاسبان" (حیدر آباد) میں ۵ نومبر ۸۵ء کو جب تیسری بار شائع کیا گیا تو کاظم رضا نے مجبوراً باضابطہ نام لے کر محسن صاحب کے تمام ادبی مشاغل اور ادبی سیاستوں کا ذکر کردیا۔ محسن صاحب نے اپنے جوابی مضمون میں حسب سابق پھر الزام آرائی کی ہے اور شاکر جعفری کے حوالے سے ایک "من گھڑت افسانہ" تراشا ہے۔ شاکر صاحب محسن صاحب کے بھی دوستوں میں شامل ہیں۔ افسانہ تراشنے سے پہلے وہ ان سے تصدیق تو کرلیتے۔ کاظم رضا کا مضمون کتاب میں شامل ہے۔(مرتب)

یہ تنقیدی نشست رائٹرز گلڈ کی جانب سے سجاد حیدر (ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان۔ حیدر آباد) کی صدارت میں ہوئی تھی۔ شریک محفل تھے۔ حمایت علی شاعر، قابل اجمیری، اختر انصاری اکبر آبادی، سید رضی ترمذی، محسن بھوپالی، مخدوم امیر احمد، پروفیسر سید محمد نصر، پروفیسر حضور احمد سلیم، محمد احمد، سید ارتضاء عزمی، رضوان صدیقی، سید کاظم رضا، مشہود انور، قاصد عزیز، قدیر غوثی، نعمت اللہ، شاکر جعفری، عثمان عرفانی، پروفیسر خالد وہاب، طاہر رضوی اور سلیم جعفری وغیرہ ۔ اس تنقیدی نشست میں عثمان عرفانی نے اپنا افسانہ "تشنگی کا سفر" پڑھا تھا۔ اور قابل اجمیری نے غزل سنائی تھی۔

میری پہلی نظم

مطبوعہ ہفت روزہ "بیباک" ٹنڈو محمد خان۔ یکم جون ۱۹۵۲ء

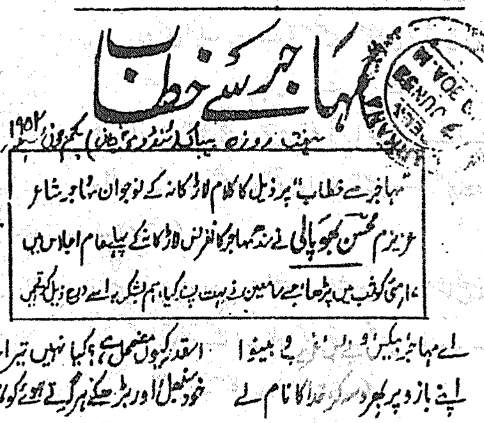
مہاجر سے خطاب

ہفت روزہ بیباک (ٹنڈو محمد خان) یکم جون ۱۹۵۲ء

"مہاجر سے خطاب" پر ذیل کا کلام لاڑکانہ کے نوجوان مہاجر شاعر عزیزم محسن بھوپالی نے سندھ مہاجر کانفرنس لاڑکانہ کے پہلے عام اجلاس ۱۷ مئی کو شب میں پڑھا جسے سامعین نے بہت پسند کیا۔ ہم شکریہ کے ساتھ اسے درج ذیل کرتے ہیں

اے مہاجر بیکس و بے بس و بے نوا   اس قدر کیوں مضمحل ہے؟ کیا نہیں تیرا خدا
اپنے بازو پر بھروسہ کر خدا کا نام لے   خود سنبھل اور بڑھ کے ہر گرتے ہوئے کو تھام لے

محسن صاحب کے ایک سووینیر سے ماخوذ ان کی پہلی نظم کے دو شعر (مرتب)

ایک خبر - بلا تبصرہ

اللہ ہی کے لئے ہیں مشرق و مغرب (قرآن حکیم)

روزنامہ **مشرق** کراچی

بانی عنایت اللہ مرحوم

لاہور، کراچی، پشاور اور کوئٹہ سے بیک وقت شائع ہوتا ہے

اتوار ۳۰ جولائی ۱۹۷۸ء مطابق ۲۴ شعبان المعظم ۱۳۹۸ھ قیمت ۷۰ پیسے فون

تین لاکھ روپے سے تعمیر ہونیوالی پولیس چوکی پہلی ہی بارش میں منہدم ہو گئی

دو سینئر پولیس افسروں اور ایک ٹھیکیدار کے خلاف تحقیقات شروع ہو گئی

عمرکوٹ ۲۹ جولائی (پ پ ا) دو سینئر پولیس افسر اور ایک ٹھیکیدار دھورونارو میں ایک پولیس چوکی کی تعمیر کے سلسلہ میں مبینہ طور پر فراڈ کے ایک کیس میں ملوث پائے گئے ہیں۔ اینٹی کرپشن پولیس اس معاملہ کی تحقیقات کر رہی ہے تین لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کی جانے والی پولیس چوکی پہلی بارش کے دوران منہدم ہو گئی۔ اس کی مرمت پر بعد میں مزید ایک لاکھ ۴۲ ہزار روپے خرچ کئے گئے۔ دھورونارو میں پولیس چوکی کی تعمیر کے سلسلہ میں جو افراد فنڈز کے غلط استعمال میں ملوث ہیں ان میں سینٹرل پولیس آفس کراچی کے پروجیکٹ ڈائریکٹر مسٹر آئی آئی صدیقی، اسسٹنٹ پروجیکٹ ڈائریکٹر عبدالرحمٰن محسن بھوپالی اور ایک ٹھیکیدار محمد یوسف شامل ہے۔ ابتدائی تحقیقات سے انکشاف ہوا دھورونارو پولیس چوکی کی چھت آر سی سی کے بجائے لکڑی کی بنائی گئی تھی اور عمارت میں استعمال ہونیوالی لکڑی پولیس چوکی کے پلاٹ میں موجود ایک درخت کاٹ کر حاصل کی گئی تھی۔ تحقیقات سے پتہ چلا کہ دھورونارو پولیس چوکی کی تعمیر پر پچاس یا ساٹھ ہزار سے زیادہ لاگت نہیں آسکتی تھی لیکن متعلقہ پولیس افسروں نے ظاہر کیا کہ پولیس چوکی کی تعمیر پر چار لاکھ ۴۲ ہزار روپے کی لاگت آئی ہے۔

محمد فاضل ذکریا

ایک مراسلہ

(مطبوعہ "قومی اخبار" ہفتہ وار میگزین۔ ۲۰؍اگست ۹۳ء)

مجھے اور بہت سے قارئین کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ قابل اجمیری پر ساجد امجد کا مضمون اس پر حمایت علی شاعر کی چھ قسطوں پر مشتمل طویل روداد اور پھر محسن بھوپالی کے دو قسطوں پر مشتمل جوابی مضمون کا سلسلہ ختم ہوا۔ اس طرح قابل کے آخری ایام کے کربناک دور کی تمام جزئیات ریکارڈ پر آگئیں۔ جہاں تک محسن بھوپالی کا تعلق ہے۔ انہوں نے شہزاد احمد کی ہمدردانہ اپیل کو مدنظر رکھتے ہوئے اس مسئلے پر واقعی نہایت اختصار سے کام لیا اور اپنے اوپر لگائے گئے ذاتی الزامات سے قطع نظر صرف قابل سے تعلق رکھنے والے معاملات کے بارے میں دلیل اور ثبوت کے ساتھ بات کی۔ حمایت صاحب نے اپنے جوابی مضمون میں موضوع سے ہٹ کر اپنے ادبی اور فلمی کیریئر کے بارے میں بتاتے ہوئے اس قدر تفصیل سے کام لیا کہ اکثر جگہ ایسا لگا کہ وہ اپنی سوانح لکھ رہے ہوں۔ انہوں نے اپنے بارے میں کئی ایسی باتیں لکھیں جن کی تردید ضروری تھی۔ محسن صاحب غالباً صرف نظر کر گئے۔ میں یہاں مختصراً صرف ایک دعوے کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔ ملاحظہ ہو آخری قسط کالم نمبرا مطبوعہ ۹؍ تا ۱۵؍ جولائی ۱۹۹۳ء۔

"بڑے لوگوں سے ناجائز فائدے حاصل کرنے کی بات تو الگ رہی میں نے تو آج تک اپنی کتابوں پر کسی بڑے اہل قلم سے کوئی مضمون یا فلیپ تک نہیں لکھوایا۔ میری

کتابوں کے سوونیئر میں کسی نے کوئی فرمائشی تحریر نہیں دیکھی ہوگی۔ جو آدمی الفاظ کی بھیک نہ مانگے وہ کسی سے کچھ اور کیسے طلب کرسکتا ہے۔" جبکہ صحیح صورتحال یہ ہے کہ "آگ میں پھول" کا فلیپ ممتاز حسین صاحب نے لکھا تھا۔ "ہارون کی آواز" پر فیض کی وہ رائے جو انہوں نے تقریب اشاعت میں تقریر کرتے ہوئے دی تھی اور جو "مساوات" کے رپورٹر کے حوالے سے خبر کے طور پر شائع ہوئی تھی بیک ٹائٹل پر دی گئی ہے۔ سوونیئرز کے سلسلے میں عرض ہے کہ حمایت علی شاعر صاحب نے ۱۹۷۴ء میں اپنی دوسری کتاب "مٹی کا قرض" کی تقریب رونمائی کے سلسلے میں مہران اکیڈمی کے زیر اہتمام بہ یک وقت دو سوونیئر شائع کرکے ---- ایک نیا ریکارڈ قائم کیا جسے اب تک کوئی نہیں توڑ سکا۔ ان سوونیئرز میں حسب دستور اشتہارات کے علاوہ نقاد اور اہل قلم کی رائے تبصرے اور خطوط کے اقتباس شامل ہیں۔ بعد ازاں ۱۹۸۵ء میں "ہارون کی آواز" اور شخص و عکس کی اشاعت پر دوبارہ سوونیئر شائع کیا گیا تھا۔ اس سوونیئر میں بھی دیگر نقادوں کے علاوہ ڈاکٹر نیاز فتح پوری، ڈاکٹر سید عبداللہ، احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، انور معظم وغیرہ کے تاثرات اور رائے اور ساتھ ساتھ اشتہارات بھی تھے جن میں سسپنس ڈائجسٹ اور جاسوسی ڈائجسٹ (اور اب سرگزشت) کے ادارے کا اشتہار بھی شامل تھا، خبر نہیں فرمائشی تحریر سے ان کی کیا مراد ہے اور کیا خط لکھ کر جواباً "اپنے کلام کے بارے میں رائے حاصل کرنا فرمائشی تحریر کے زمرے سے خارج سمجھا جاسکتا ہے۔

(نوٹ) (۱) حمایت علی شاعر صاحب کی صرف دو کتابوں "آگ میں پھول" (مطبوعہ ۵۶ء) اور "ہارون کی آواز" (مطبوعہ ۸۵ء) پر ادب کی دو بڑی شخصیتوں ممتاز حسین اور فیض احمد فیض کے "مطبوعہ ریکارڈ" سے ماخوذ تاثرات شائع کئے گئے تھے۔ جن سوونیئرز کا حوالہ دیا گیا ہے وہ حمایت صاحب کی ۱۸ سال بعد شائع ہونے والی کتاب "مٹی کا قرض" کی تقاریب رونمائی پر ۷۴ء میں شائع ہوئے تھے جو مہران اکادمی کے تعاون سے نیشنل سینٹرز کے زیر اہتمام (ریذیڈنٹ ڈائریکٹر۔ نیلوفر عباسی) کراچی میں بتاریخ ۱۴ دسمبر ۷۴ء کو زیر صدارت اختر حسین رائے پوری اور لاہور میں (ڈائریکٹر۔ کشور ناہید) ۱۱ جنوری ۷۵ء کو زیر صدارت فیض احمد فیض۔ اور ۹ مارچ ۷۵ء کو روزنامہ "کلیم" کے زیر اہتمام سکھر میں منعقد ہوئی تھیں۔

ان سووینیرز میں ''آگ میں پھول'' (۵۶ء) اور ''مٹی کا قرض'' (۷۴ء) میں شامل حمایت صاحب کے لکھے ہوئے پیش لفظ اور چند بزرگوں کے بہت پہلے کے تحریر کردہ خطوط شامل تھے۔ دوسرے سووینیر میں بھی یہی خطوط شائع کئے گئے ہیں۔ (''مٹی کا قرض'' کے بعد حمایت صاحب کی کسی کتاب کی تقریب رونمائی منعقد نہیں ہوئی اور یہ بھی ان دنوں کی بات ہے جب حمایت صاحب فلم انڈسٹری سے متعلق تھے۔) دوسرا سووینیر ۸۵ء میں حمایت صاحب کی تین کتابوں کے سلسلے میں شائع ہوا تھا۔ ''شخص و عکس'' (مقالات و مباحث) ہارون کی آواز (مجموعہ کلام) اور ''بنگال سے کوریا تک'' کا انگریزی ترجمہ Flower in flames (مترجمہ) پروفیسر راجندر سنگھ ورما (پنجاب یونیورسٹی۔ پٹیالہ۔ بھارت) اس سووینیر میں جن اہل قلم کے خطوط اور مضامین شامل تھے ---- ان کے نام اور تاریخیں ملاحظہ فرمائیے۔

خطوط: بابائے اردو مولوی عبدالحق (۱۲ر اگست ۵۹ء)، علامہ نیاز فتح پوری (تاریخ ندارد)، اثر لکھنوی (۲۷ر دسمبر ۶۶ء)، خواجہ غلام السیدین (۲۴ر ستمبر ۶۲ء)، سجاد ظہیر (۱۸ر دسمبر ۶۲ء)، پروفیسر عابد علی عابد (۱۸ر مارچ ۶۶ء)، پروفیسر احتشام حسین (۹ر ستمبر ۵۷ء)، مخدوم محی الدین (تاریخ ندارد)، ڈاکٹر وزیر آغا (۱۶ر مہینہ اور سنہ نہیں ہے مگر خط کے اندراجات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خط ۵۸ء کا تحریر کردہ تھا۔)

مضامین: احمد ندیم قاسمی (مطبوعہ۔ ماہنامہ۔ ''کتاب'' لاہور۔ فروری ۷۵ء) ڈاکٹر سید عبداللہ (مطبوعہ ''اوراق'' لاہور۔ اپریل مئی ۷۵ء) فیض احمد فیض (مطبوعہ۔ روزنامہ ''مساوات'' لاہور ۱۲ر جنوری ۷۵ء) یونس احمر (مطبوعہ The muslim daily اسلام آباد ۲ر جنوری ۸۱ء) ڈاکٹر انور معظم اور ڈاکٹر ارتکاز افضل (مطبوعہ۔ روزنامہ ''اورنگ آباد ٹائمز'' کا ''حمایت علی شاعر نمبر'' مورخہ ۲ر جون ۸۵ء ---- (بھارت) اس سووینیر میں ان مضامین کے عکس شائع کئے گئے تھے۔ (مرتب)

ڈاکٹر ساجد امجد نے محسن بھوپالی کی نشان دہی پر لطیف آباد میں حمایت صاحب کے کوارٹر اور فاضل ذکریا صاحب نے حمایت صاحب کے سووینیر تو گنوا دیئے مگر ان کے اس جملے کا تجزیہ نہیں کیا۔

''اگر میں افسران اعلیٰ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا عادی ہوتا تو کراچی میں بھی.... کم از کم ''ناظم آباد'' میں ہی چار پانچ سو گز کا پلاٹ حاصل کر کے ایک ''بنگلہ'' بنوا لیتا یا پھر کسی ایسے محکمے' میں نوکری کر لیتا جہاں ''فضل ربی'' عام ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں تو بعض ''محکموں'' کی ملازمت ہی آدمی کی ''پہچان'' بن جاتی ہے'' ---- اور اس ''پہچان'' کی گواہی تو بعض اخبارات بھی دے چکے ہیں (روزنامہ ''مشرق'' کراچی مورخہ ۳۰ جولائی ۷۸ء)

یہ گروپ فوٹو "طالب علم ڈائجسٹ" کے قابل نمبر فروری ۷۰ء میں شائع ہوا تھا۔(مرتب)

یادگار گروپ فوٹو [illegible] ۱۹۳۱ء

(دائیں طرف سے) [illegible]

یہی گروپ فوٹو (تاریخ مشاعرہ نکال کر) "قومی اخبار" (ہفتہ وار میگزین- مورخہ ۲۳ر تا ۲۹ جولائی ۹۳ء) میں محسن صاحب نے اپنے جوابی مضمون کے ساتھ شائع کیا۔(مرتب)

23 / تا29 / جولائی 1993ء

قومی اخبار نیوز میگزین 29

۶۱ء میں ہونے والے مشاعرے کی رپورٹ کے لئے، پندرہ روزہ رسالہ "رہنما" کا "خصوصی ضمیمہ" ۱۷ر اگست ۶۲ء میں نکالا گیا۔۔۔(سبحان اللہ) یہ "ضمیمہ" بھی محسن صاحب نے اپنے جوابی مضمون میں فراہم کیا تھا۔(مطبوعہ "قومی اخبار" ہفتہ وار میگزین۔۔۹ر جولائی ۹۳ء) یہ تضادات قابل غور ہیں۔(مرتب)

17/اگست 62ء کو پندرہ روزہ "رہنما" حیدر آباد میں شائع ہونے والی مشاعرہ کی رپورٹ کا عکس

رجسٹرڈ ایس ایل نمبر ۲۷۴

جام شورے کا مشاعرہ ناکام نہیں ہوا تھا
بلکہ ناکام بنانے کی کوشش ناکام ہو گئی تھی

پندرہ روزہ ضمیمہ رہنما حیدرآباد

ایڈیٹر سید لیعقوب علی شاہ

قیمت ۲ر

جام شورے میں پچھلے دنوں ایک سرکاری محکمہ کی جانب سے عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ جس کے اصل واقعات اس طرح بیان کئے جاتے ہیں کہ مشاعرے کے آغاز کے وقت قابل اجمیری نے منتظمین سے صدارت کی درخواست کی اور اسکی تائید دو شاعروں نے کی جن میں ایک کراچی کے مہمان شاعر بھی تھے۔

حمایت علی شاعر بھی وہاں موجود تھے۔ اس وقت انہوں نے کوئی اختلاف ظاہر نہیں کیا۔ لیکن مشاعرہ شروع ہونے کے تھوڑی دیر بعد پنڈال سے باہر چلے گئے اور مشاعرے کے منتظمین سے مطالبہ کیا کہ قابل اجمیری کو مسند صدارت سے

ختم کرکے کسی دوسرے کی صدارت کا اعلان کریں۔

قابل اجمیری نے مائک پر آکر حمایت علی شاعر کا مطالبہ اور منتظمین کا تقاضا پبلک کے سامنے پیش کردیا اور ڈائس سے اتر گئے ان کے ساتھ ہی تمام شعراء بھی اٹھ کر

جام شورے میں پچھلے دنوں ایک سرکاری محکمہ کی جانب سے عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ جس کے اصل واقعات اس طرح بیان کئے جاتے ہیں کہ مشاعرے کے آغاز کے وقت قابل اجمیری سے منتظمین نے صدارت کی درخواست کی اور اس کی تائید دو شاعروں نے کی جن میں ایک کراچی کے مہمان خصوصی شاعر بھی تھے۔

حمایت علی شاعر بھی وہاں موجود تھے۔ اس وقت انہوں نے کوئی اختلاف ظاہر نہیں کیا لیکن مشاعرہ شروع ہونے کے تھوڑی دیر بعد پنڈال سے باہر چلے گئے اور مشاعرے کے منتظمین سے مطالبہ کیا کہ قابل اجمیری کو مسند صدارت سے ہٹا کے کسی اور کو صدر بنایا جائے۔ ورنہ میں اپنا کلام سنائے بغیر واپس چلا جاؤں گا۔ منتظمین نے حمایت علی شاعر کے اس عجیب مطالبہ کو بھی قبول کرلیا اور قابل اجمیری سے کہہ دیا کہ وہ اپنی صدارت ختم کرکے کسی دوسرے کی صدارت کا اعلان کریں۔

قابل اجمیری نے مائک پر آکر حمایت علی شاعر کا مطالبہ اور منتظمین کا تقاضا پبلک کے سامنے پیش کیا اور ڈائس سے اتر گئے ان کے ساتھ ہی تمام شعرا بھی اٹھ کر کھڑے ہوئے۔

سامعین نے حمایت علی شاعر کے اس جذبہ کو اظہار ناپسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا۔

مقبول شاعر محسن بھوپالی نے مائک پر آکر اعلان کیا کہ یہ بات قطعی نامناسب ہے مشہور مزاح گو شاعر عظیم عباسی نے بھی قابل اجمیری کی صدارت پر اصرار کیا۔ آخر سامعین اور شعراء کی متفقہ درخواست پر دوبارہ مشاعرہ شروع ہوا۔ حمایت علی شاعر اپنا کلام سنائے بغیر چلے گئے۔

مشاعرے میں حیدر آباد کے ممتاز شعراء کے علاوہ کراچی کے چند شعرا بھی شریک تھے۔

پروفیسر عظیم عباسی، محسن بھوپالی، مظہر عرفانی، غنی دہلوی، کریم رازی، فضا جالندھری اور اصغر عابدی کا کلام بہت پسند کیا گیا۔

مذکورہ بالا مشاعرے کی رپورٹ بھی کسی آئندہ شمارے میں غلط انداز میں شائع کی گئی ہے۔ انور فریدی کی تردید بھی اس شمارے میں شائع کی جارہی ہے۔

قومی اخبار نیوز میگزین 29

مشاعرے کی رپورٹ بھی قابل غور ہے (مرتب)

(محمد عالم ذکریا)

پردۂ چشم اٹھا' دیدہ تحقیق سے دیکھ

یہ مضمون ۲۶ اگست ۹۳ء کو بذریعہ رجسٹری "قومی اخبار" کے ایڈیٹر الیاس شاکر کے نام پوسٹ کیا گیا تھا۔ "غالباً انہیں نہیں ملا" اس لئے شائع نہیں کیا گیا۔ (مرتب)

جناب الیاس شاکر صاحب

میں ادب کا ایک قدیم طالب علم ہوں اور قابل اجمیری' حمایت علی شاعر اور محسن بھوپالی تینوں کا نیاز مند ہی نہیں' مختلف خصوصیات کی بنا پر تینوں کا قدر شناس بھی ہوں۔ آپ نے ۲۰ر اگست ۹۳ء کے شمارے میں کسی محمد فاضل کا ایک ایسا خط شائع کیا ہے جس میں محسن بھوپالی کے تفصیلی جوابی مضمون (مطبوعہ ۹ر اور ۱۶ر جولائی ۹۳ء) کی توصیف اور حمایت علی شاعر پر تنقید کی گئی ہے۔ اب ایک ایسا مضمون بھی شائع کر دیجئے جس میں محسن صاحب کے دیئے ہوئے "دلائل اور ثبوت" کا تجزیہ ہو اور فاضل مکتوب نگار اور متعدد قارئین کرام کی خوش گمانی اور بد گمانی دور ہو جائے۔

جہاں تک میرا مطالعہ ہے قابل صاحب کے انتقال کے بعد گزشتہ تیس (30) سال میں حمایت علی شاعر کی کوئی ایسی تحریر کہیں شائع نہیں ہوئی جس میں قابل صاحب کے تعلق سے محسن صاحب یا ان کے کسی دوست کے کسی مضمون' انٹرویو یا کسی خط کا جواب دیا گیا ہو۔ اس کے برعکس محسن صاحب کا ایک مضمون کئی بار شائع ہوا اور ان کے حلقہ احباب نے بھی جی کھول کر حمایت صاحب پر مسلسل کرم کیا ہے۔

قابل صاحب کی زندگی میں ۵۵ء سے ۶۲ء تک صرف دو واقعات کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

ایک۔ "جام شورو کا مشاعرہ" دوسرا۔ "ایک تنقیدی نشست۔"

محسن صاحب نے بھی اپنے مضمون میں انہی واقعات کا تذکرہ کیا ہے مگر ڈاکٹر ساجد امجد کے سوانحی ناول کے سلسلے میں، محسن بھوپالی نے 'انہیں ایسا "تحقیقی" مواد (ذاتی اور غیرذاتی) فراہم کیا اور ایسے مشورے دیئے کہ موصوف نے حمایت صاحب کی پوری شخصیت ہی مسخ کر کے رکھ دی۔ انداز نگارش ایسا تضحیک آمیز اختیار کیا کہ اگر حمایت صاحب اسکا جواب نہ لکھتے تو شاید اہل ادب انہیں ویسا ہی شخص سمجھ لیتے جیسی تصویر کشی ان کے ناول میں کی گئی ہے۔ موصوف نے انہیں "قابل دشمن" ہی نہیں---- "قاتل" تک لکھ دیا جب کہ خود ساجد امجد نے اقرار کرلیا کہ وہ نہ کبھی حیدر آباد میں رہے اور نہ کبھی قابل صاحب کو دیکھا۔ اپنی تاریخ پیدائش کے مطابق اس دور میں وہ سات سے چودہ سال کے تھے۔ (تاریخ پیدائش ۱۹۴۸ء) اتنی تذلیل اور رسوائی کا سامان کرنے کے بعد محسن صاحب کا یہ شکوہ بھی عجیب ہے کہ حمایت صاحب کو مضمون لکھنے سے پہلے ان سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔ کیا خوب!

وہی قتل بھی کرے ہے' وہی لے ثواب الٹا

ساجد امجد نے اپنے خط مطبوعہ ۳۰؍اپریل ۹۳ء (حیدر آباد کی حد تک) تمام معلومات کی ذمہ داری واضح الفاظ میں محسن بھوپالی پر ڈالی تھی۔ حمایت صاحب کا مضمون اس خط کی اشاعت کے پورے ایک ماہ بعد چھپنا شروع ہوا۔ (۴؍جون تا ۹؍جولائی ۹۳ء۔ چھ اقساط) اگر ساجد امجد نے غلط بیانی یا مبالغہ آرائی سے کام لیا تھا تو محسن صاحب اس کی تردید یا تصحیح کرسکتے تھے۔ خیر---- اب تو محسن صاحب نے تسلیم بھی کرلیا ہے کہ یہ ناول انہی کے مشوروں کی روشنی میں تحریر کیا گیا ہے۔ (اگر ان سے پوچھ بھی لیا جاتا تو وہ یہی اقرار کرتے)

شہزاد احمد کے سلسلے میں البتہ یہ بات واضح ہوگئی کہ انہیں سلیم جعفری نے طالب علم ڈائجسٹ کا "قابل نمبر" فراہم کیا تھا۔ اس میں محسن صاحب کے مضمون سے اقتباس دینا' حیدر آباد کی ادبی فضا سے ان کی لاعلمی کا ثبوت ہے۔ اگر وہ حقیقت حال سے واقف ہوتے تو

یقیناً ان اقتباسات سے گریز کرتے۔ محسن صاحب نے اپنے جوابی مضمون میں جن نکتہ آفرینیوں سے کام لیا ہے ان کا مطالعہ بھی دلچسپ ہے۔

حیدر آباد کے یادگار مشاعروں کا ذکر حمایت صاحب نے اس لیے کیا تھا کہ قابل صاحب کے بارے میں پھیلائی ہوئی ایک بڑی غلط فہمی دور کردی جائے۔ حمایت صاحب نے تاریخی حوالوں سے ثابت کیا کہ وہ نہ صرف ریڈیو بلکہ شہر کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ ان کی راہ میں کسی نے روڑے نہیں اٹکائے، کسی نے ان کی روزی کے دروازے بند نہیں کیے۔ محسن صاحب نے خدا جانے یہ مطلب کیسے اخذ کرلیا کہ یہ "مشاعرے حمایت صاحب کی کوششوں سے منعقد ہوئے' ان میں' میں (محسن) اور قابل ان کی ایما پر بلائے گئے اور ہم دونوں کی آمدنی کا وسیلہ بنے" ایسے جملے دوستوں میں بدگمانی پیدا کرنے کے لیے گھڑے جاتے ہیں۔ محسن صاحب اس ہنر میں خاصے ماہر نظر آتے ہیں۔ حمایت صاحب نے اپنے مضمون میں سلیم، شمیم اور قمر جمیل کو بدگمان کرنے کی مثالیں بھی دی ہیں اب وہ غالباً مرزا عابد عباس صاحب کو حمایت صاحب سے بدگمان کرنا چاہتے ہیں۔

جام شورو کے مشاعرے کے احوال میں بھی ان کا ہنر دیدنی ہے، محسن صاحب نے اپنے خط اور جوابی مضمون کے ساتھ "قومی اخبار" کو (پندرہ روزہ) "رہنما" کے "ضمیمے" کا عکس اور "جام شورو مشاعرے میں لیا گیا" ایک گروپ فوٹو بھی فراہم کیا ہے۔ اس فوٹو گروپ میں مرزا عابد عباس اور عظیم عباسی صاحبان کے سوا قابل صاحب کے ساتھ' وہ تمام شعراء موجود ہیں جن کے نام انہوں نے اپنے مضمون میں' حمایت صاحب کے بائیکاٹ کے عینی گواہوں کے طور پر گنائے ہیں۔ یہی گروپ فوٹو طالب علم ڈائجسٹ کے "قابل نمبر" مطبوعہ فروری ۷۰ء میں بھی شائع کیا گیا تھا' جس کا عنوان تھا:

"یادگار گروپ فوٹو مشاعرہ جام شورو ۱۹۶۱ء"

ہم سب جانتے ہیں کہ کسی اخبار یا رسالے کا "ضمیمہ" اس وقت شائع کیا جاتا ہے جب کوئی "قومی اہمیت" کا واقعہ یا کوئی "غیر معمولی" سانحہ وقوع پذیر ہوجائے اور اس کی فوری خبر دینا مقصود ہو۔ پہلے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس مشاعرے کا بائیکاٹ کوئی "قومی سانحہ"

تھا جو ایک رسالے کا "ضمیمہ" شائع کردیا گیا؟ بفرض محال اگر یہ اتنا ہی اہم واقعہ تھا تو یہ "ضمیمہ" ۱۷ راگست ۶۲ء کو یعنی تقریباً آٹھ ماہ بعد کیوں نکالا گیا۔ (گروپ فوٹو پر مشاعرے کی تاریخ اور مہینے کا کوئی حوالہ نہیں، ممکن ہے مشاعرہ دسمبر ۶۱ء میں ہوا ہو۔ کیونکہ ۲۵ رنومبر ۱۹۶۱ء کو محسن صاحب کے پہلے مجموعے "شکست شب" کی تقریب رونمائی ہوئی تھی اور اس میں حمایت صاحب نے اس کتاب پر اپنا مضمون پڑھا تھا۔ مطلب یہ کہ اس وقت تک انہیں حمایت صاحب سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ شکایت تو ریڈیو کے ادبی پروگرام میں نشر ہونے کے بعد پیدا ہوئی جس میں وہ مضمون پورا پڑھا گیا۔ (غلطیوں کی نشاندہی کے ساتھ)

اس "ضمیمے" میں مشاعرے کی جلی سرخی کے بعد جو خبر شائع کی گئی اس کی عبارت بھی دعوت فکر دیتی ہے۔ توجہ فرمائیے۔

"جام شورو میں پچھلے دنوں ایک سرکاری، محکمے کی جانب سے ایک عظیم الشان مشاعرہ کا انعقاد ہوا جس کے اصل واقعات یوں بتائے جاتے ہیں۔ مشاعرے کے آغاز کے وقت قابل اجمیری سے، منتظمین نے صدارت کی درخواست کی اور اس کی تائید دو شاعروں نے کی جن میں ایک کراچی کے مہمان خصوصی تھے۔[1]

حمایت علی شاعر بھی وہاں موجود تھے، اس وقت انہوں نے وہاں کوئی اختلاف ظاہر نہیں کیا لیکن مشاعرہ شروع ہونے کے تھوڑی دیر بعد پنڈال سے باہر چلے گئے اور مشاعرہ کے منتظمین سے مطالبہ کیا کہ قابل اجمیری کو مسند صدارت سے ہٹا کر کسی اور کو صدر بنایا جائے ورنہ میں اپنا کلام سنائے بغیر واپس چلا جاؤں گا۔ منتظمین نے حمایت علی شاعر کے اس عجیب مطالبے کو بھی قبول کرلیا اور قابل اجمیری سے کہہ دیا کہ وہ اپنی صدارت ختم کرکے کسی دوسرے کی صدارت کا اعلان کردیں۔"

سوچنے کی بات یہ ہے کہ منتظمین مشاعرہ نے "خود" قابل صاحب سے صدارت کی درخواست کی، اور پھر "خود" ہی انہیں مسند صدارت سے اترنے کے لیے کہہ دیا۔ آخر منتظمین نے حمایت صاحب کے اس "عجیب مطالبے" کو مان کیسے لیا؟ کیا حمایت صاحب اس محکمے کے افسر اعلیٰ تھے یا صوبہ سندھ کے وزیر اعلیٰ؟؟ ہمارے مشاعروں میں کوئی بڑے سے

---

[1] کراچی کے مہمان خصوصی؟ ان کا نام تک نہیں دیا گیا (مرتب)

بڑا آدمی بھی آجائے تو زیادہ سے زیادہ اسے مہمان خصوصی بنادیا جاتا ہے صدارت کی مسند سے کسی کو اتارا نہیں جاتا۔ یہ بات ہی کتنی مضحکہ خیز ہے کہ اسی صدر سے کہہ دیا جائے کہ "اپنی صدارت ختم کرکے کسی دوسرے کی صدارت کا اعلان کردیں" اسی سے پتہ چلتا ہے کہ درپردہ کوئی اور بات ہے۔

سید کاظم رضا نے درست لکھا تھا کہ اس مشاعرے کی صدارت کے لیے حمایت صاحب کو آمادہ کیا گیا تھا۔ محسن صاحب سے یہ بات برداشت نہ ہوسکی۔ انہوں نے درپردہ سازش کی اور قابل صاحب کو صدر بنادیا۔ (قابل صاحب کو اصل حقیقت کا قطعی علم نہیں تھا) میرا خیال ہے۔ جس طرح قابل صاحب نے مسند صدارت سے اتر کر احتجاجاً گھر جانے کا اعلان کردیا تھا۔ حمایت صاحب کا بائیکاٹ بھی ان کی "عزت نفس" کا تقاضا تھا۔ اگر محسن صاحب کے ساتھ ایسا واقعہ ہوتا وہ بھی غالباً یہی کرتے۔

خبر کا ایک دلچسپ حصہ یہ بھی ہے۔

"پروفیسر عظیم عباسی، محسن بھوپالی، مظہر عرفانی، غنی دہلوی، کریم رازی، فضا جلالوی اور اصغر عابدی کا کلام بہت پسند کیا گیا" یعنی قابل اجمیری اور مرزا عابد عباس سمیت حیدر آباد کے ان تمام "ممتاز شعرا" کا کلام پسند نہیں کیا گیا جو مشاعرے میں شریک تھے اور جو یادگار فوٹو گروپ میں بھی شامل ہیں (خدا جانے مرزا عابد عباس صاحب اور پروفیسر عظیم عباسی صاحب گروپ فوٹو میں کیوں نہیں ہیں) کہنا یہ ہے کہ یہ ہے ہمارے محسن بھوپالی کا کارنامہ ----- ایسے "دلائل اور ثبوت" فراہم کیے ہیں کہ اس "ضمیمے" پر بھی "جعلی" ہونے کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

اپنے جوابی مضمون میں انہوں نے ایک مقامی مشاعرے کا احوال بھی لکھا ہے۔

"میمن انجمن کالج کے سالانہ مشاعرے میں حمایت صاحب نے میری طرف دیکھ کر "بدل جاتے ہیں لوگ، سنبھل جاتے ہیں لوگ" والی غزل پڑھی تو حاضرین نے مجھے دوبارہ پڑھوانے پر اصرار کیا۔ میں نے مائیک پر آکر دوبارہ کلام سنایا۔ روزنامہ حریت (کراچی) ۱۹ر دسمبر ۶۲ء میں اس مشاعرے کی روداد دیکھی جاسکتی ہے اور یہ اشعار بھی۔

شاعر ان کی دوستی کا اب بھی دم بھرتے ہیں آپ
ٹھوکریں کھاکر تو سنتے ہیں سنبھل جاتے ہیں لوگ
(شاعر)

بہتر ہے کہ اس بزم سے اٹھ آیئے محسن
سرقے' کو جہاں رتبہ' الہام دیا جائے
(محسن بھوپالی)

(اقتباس ختم ہوا)

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ۶۲ء تک حمایت صاحب کے فلمی نغمے (کسی چمن میں رہو تم بہار بن کے رہو) پر بہترین نغمہ نگاری کے ایوارڈ کا اعلان بھی نہیں ہوا تھا۔ پھر اس شعر میں محسن صاحب نے کس پر چوٹ کی تھی؟ ان دنوں یا تو قابل صاحب کی غزل پر ہونے والی تنقید کی دھوم تھی یا حمایت صاحب کی طویل نظم "بنگال سے کوریا تک" کی۔

محسن صاحب نے کبھی کھل کر اس کے خلاف کچھ نہیں لکھا' یہ کام وہ دوسروں سے لیتے رہے تھے مثلاً شیمم احمد وغیرہ سے۔

تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ حمایت صاحب کے خلاف لکھا ہوا شمیم احمد مرحوم کا ایک مضمون آج کل جلی سرخیوں کے ساتھ کسی ہفتہ وار میں قسط وار شائع کیا جارہا ہے آخر دس سال بعد یکایک اس کی دوبارہ اشاعت کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟ سوچیں اور ایک یونیورسٹی کے "ادبیات کے پروفیسر" کا انداز تحریر ملاحظہ فرمائیں۔ یہ مضمون ان کی کتاب "برش قلم" سے ماخوذ ہے جو ۸۳ء میں شائع ہوئی تھی اس میں "باب سرخ" کے تحت حمایت صاحب کے علاوہ احمد ندیم قاسمی' سبط حسین' ممتاز حسین' صہبا لکھنوی' عتیق احمد' انور خواجہ اور شہزاد منظر کے خلاف اور "باب زرد" کے تحت ڈاکٹر وزیر آغا اور ان کے حلقہ احباب کے خلاف ایسے مضامین ہیں جن کے لہجے سے مصنف کے مزاج کا پتہ چلتا ہے یعنی کدورت و نفرت سے بھرپور۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے (اس مضمون کا پس منظر اور اس کا تجزیہ حمایت علی شاعر کی کتاب "شخص و عکس" میں دیکھا جا سکتا ہے جو ۸۴ء میں شائع

* گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا ست — کار طفلاں تمام خواہد شد

ہوئی تھی)۔

محسن صاحب نے اپنے جوابی خط اور مضمون میں سید کاظم رضا کے وضاحتی مضمون (مطبوعہ روزنامہ "پاسباں" ۱۲ر نومبر ۸۵ء محسن صاحب کے مضمون کی غالباً تیسری اشاعت کے بعد) کے بارے میں جو افسانہ تراشا ہے وہ بھی ان کے مزاج کا غماز ہے۔ موصوف نے سید کاظم رضا کی عمر کا بھی محاسبہ کیا ہے۔ (کاش وہ اپنے احباب کی عمروں کا بھی جائزہ لیتے)

انہوں نے ایک نوجوان شاعر احمد ضیاء کے ایک انٹرویو (بحوالہ محسن، مطبوعہ ۶ر دسمبر ۸۲ء ہفتہ وار "چٹان" لاہور) کا ایک اقتباس فراہم کیا ہے ملاحظہ فرمائیے۔

"برگ یوسفی اور حمایت علی شاعر اور ایسے ہی ناکام غزل گو شعرا نے ٹی بی کے آخری اسٹیج کے مریض قابل اجمیری کو "مختلف مواقع" پر اس قدر ذہنی صدمے پہنچائے کہ وہ پھر سنبھل نہ سکے "ادبی نشستوں" میں قابل اجمیری کی غزلوں کو "چربہ" اور "سرقہ" قرار دیا گیا۔ "مشاعروں" میں بھی ان کی صدارت پر اعتراض کیا گیا (ہر حوالہ صیغہ "جمع" میں ہے جب کہ بات صرف ایک مشاعرے اور ایک تنقیدی نشست کی ہے لیکن یہ بات وہ جانے جو ان محفلوں میں شریک رہا ہو)

محسن صاحب کو یاد تو ہوگا کہ ۵۵ء سے ۶۳ء کے درمیان احمد ضیاء کی عمر کیا ہوگی؟ چھ سے بارہ سال (تاریخ پیدائش اپریل ۴۹ء بحوالہ "شہر صنم" مطبوعہ ۶۸ء) اس کتاب میں ۱۸ سالہ نوجوان کی شاعری پر محسن بھوپالی نے ایک صفحے کا جو فلیپ لکھا ہے وہ بھی "قابل مطالعہ" ہے۔

حمایت علی شاعر کے خلاف لکھنے والے انوار احمد زئی ہوں کہ احمد ضیاء، ڈاکٹر ساجد امجد کی طرح سبھی "طفل مکتب" تھے اور سبھی کی عمریں قابل صاحب کی زندگی میں چھ سے بارہ یا چودہ سال سے زیادہ نہیں تھیں۔ ظاہر ہے کہ سب کی معلومات "سنی سنائی" تک محدود ہیں، ان سب پر سید محمد جعفری کا وہ شعر صادق آتا ہے جو انہوں نے ایوب خاں کے بارے میں کہا تھا۔

کیا لکھایا ہے کیا پڑھایا ہے
قدرت اللہ شہاب کیا کہنا

مجھے تو ان کی تحریروں کو دیکھ کر غالب کا مصرعہ یاد آگیا۔

اے طفل خود معاملہ' قد سے عصا بلند!

شاید محسن بھوپالی نے اسی "مجمع طفلاں" کا دل رکھنے کے لیے یہ شعر کہا تھا۔

محسن میرے اطراف ہو گر مجمع طفلاں
ہر شعر بڑا شعر ہے' ہر بات بڑی بات

محسن صاحب نے دوسرا اقتباس' بابو رفیق ریواڑوی کے انٹرویو سے پیش کیا ہے یہ انٹرویو' احمد ضیاء کے انٹرویو کے تین ماہ بعد ہی ۲۷ مارچ ۸۳ء کو "نوائے وقت" (کراچی) میں شائع ہوا تھا (بحوالہ محسن بھوپالی)۔

بابو جی نے غزل اور نظم میں قابل صاحب اور حمایت صاحب کا الگ الگ مقام متعین کیا مگر "ایک مشاعرے اور ایک تنقیدی نشست" (جن میں وہ شریک بھی نہیں تھے) کے حوالے سے حمایت علی شاعر کے بائیکاٹ اور بحث کو ایک "جنگ" سے تعبیر کیا اور دوسرے اہل قلم کو بھی لپیٹ دیا' کہتے ہیں۔

"حمایت علی شاعر کی جنگ غلط فہمی کی بنا پر تھی' برگ یوسفی بھی قابل سے خوش نہیں تھے' اختر انصاری اکبر آبادی نے قابل کے مخالفوں کا بھرپور ساتھ دیا' محسن بھوپالی' حمایت علی شاعر سے جنگ لڑنے کے لیے قابل صاحب کی ڈھال بننے کی کوشش کر رہے تھے" (حالانکہ حمایت صاحب کے خلاف محسن بھوپالی کا پہلا خط قابل اجمیری کے انتقال کے تقریباً ایک سال بعد کراچی کے فلمی ہفت روزہ "کردار" میں ۱۲ر ستمبر ۶۳ء کو شائع ہوا اور وہ بھی ان کے ایوارڈ کی مخالفت کے سلسلے میں) بابو رفیق ایواڑوی کے بارے میں میرا کچھ کہنا مناسب نہیں' ان کے رفیق دیرینہ سید ارتضاء عزمی کے اس مضمون سے چند جملے نقل کرتا ہوں جو انھوں نے قابل اجمیری کے بارے میں لکھا ہے (مشمولہ کتاب "ایک محقق تین ادیب" مرتبہ صابر بن ذوقی' مطبوعہ ۱۹۹۴ء صفحہ ۲۰۰)

"بابو رفیق ریواڑوی (اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت کرے) ادبی سیاست بازی میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ میرے عزیز ترین دوست سلطان جمیل نسیم' ادبی سیاست بازی میں بابو رفیق ریواڑوی سے متاثر تھے۔ اس لیے "بزم غزل" کی تشکیل میں انہوں نے کوئی حصہ نہیں لیا اس لیے کہ اس سرگرمی میں ان کو میرا ہمنوا ہونا پڑتا۔"

قابل صاحب کی غزل سے متعلق جس تنقیدی نشست کا بہت چرچا کیا گیا تھا' حمایت صاحب نے اپنے تفصیلی مضمون میں ۱۰ر اگست ۶۲ء کے "رہنما" کی رپورٹ کے جملے دہراتے ہوئے' سرقے اور چربے سے متعلق پھیلائی ہوئی غلط فہمی دور کی اور "توارد" کے حوالے سے بعض بزرگ اور ہم عصر شعراء کے اشعار پیش کرتے ہوئے' علمی انداز میں بحث کی اور کسی پر کوئی الزام عائد نہیں کیا۔ اس کے برعکس سرشار صدیقی کے ایک شعر سے محسن بھوپالی کے ایک شعر کی مطابقت پیدا ہوجانے پر (بحوالہ "شجر ممنوعہ کا شاعر" مطبوعہ "الفاظ" شمارہ نمبر۸۔ ۸۳ء) محسن صاحب نے حمایت صاحب کی ایک "ثلاثی" کی سیماب اکبر آبادی کے ایک شعر سے مماثلت دریافت کرلی (مطبوعہ "کلیم" سکھر' ۳۰ر مارچ ۸۴ء) اور لطف یہ کہ اپنا شعر نقل نہیں کیا قارئین کی ضیافت طبع کے لیے میں ایک اور بزرگ شاعر کے شعر کے ساتھ وہ اشعار پیش کرتا ہوں۔

کھلے یہ تم پہ مسافر کی زندگی کیا ہے
مری طرح اگر اک دن گزارنا پڑ جائے
(محشر بدایونی)

میں نے جس حال میں اک عمر بسر کی سرشار
ایک ہی دن' کبھی اس طرح گزارے کوئی
(سرشار صدیقی)

میں نے جس طرح زیست کاٹی ہے
ایک دن ہی سہی' بسر تو کر
(محسن بھوپالی)

حمایت صاحب نے اس شعر پر مشفق خواجہ (خامہ بگوش) کا مشہور فقرہ بھی نہیں دہرایا کہ ----

"محسن نے زیست نہیں کاٹی' گھاس کاٹی ہے" (مطبوعہ تکبیر) خیر یہ ناقدوں کی باتیں ہیں۔ جہاں تک ہم خیالی اور ہم زبانی کا تعلق ہے میں اسے بھی "توارد" کہوں گا۔

اس قسم کی مماثلت اور غلطیوں کی نشاندہی سے شاعر کا مرتبہ کم نہیں ہو جاتا۔ غالب نے کتنے یقین اور ناز سے کہا تھا

فارسی بیں' تا بہ بینی' نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

مولانا حسرت موہانی نے غالب کے ایک شعر میں فارسی ہی کی غلطی پکڑلی۔

غلطی ہائے مضامین مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

"نکات سخن" میں مولانا لکھتے ہیں کہ "غلط" عربی لفظ ہے۔ اس کی جمع "اغلاط" ہے "غلطی" اردو ہے' جمع بنانے کے لیے اس کے ساتھ "ہا" نہیں لگ سکتا۔ اسی طرح ہندوستانی محقق' نقاد اور ماہر لسانیات رشید حسن خاں نے ماہنامہ "کتاب نما" (دہلی) میں جوش اور فیض کے اشعار میں زبان کی متعدد غلطیاں گنائیں۔ کیا ان غلطیوں کی نشاندہی سے دونوں چھوٹے شاعر ہو گئے؟ (ان مضامین کے جواب میں حمایت علی شاعر کا طویل خط نما مضمون (مطبوعہ "کتاب نما" دہلی جنوری ۱۹۹۱ء) شاید محسن صاحب نے بھی پڑھا ہو۔ ہم خیال مصرعوں اور اشعار کا مطالعہ "سیر کے واسطے تھوڑی سے فضا اور سہی" کے عنوان سے حمایت صاحب کی کتاب "شخص و عکس" میں بھی شامل ہے۔ جس میں حافظ' سعدی' انشاء ناسخ' غالب' داغ' اقبال' حسرت' جگر اور فیض تک' مماثلت رکھنے والے کئی اشعار کا انتخاب دیا گیا ہے۔ محسن صاحب نے اسے بھی پڑھا ہو گا۔ کیا حمایت صاحب نے کسی پر سرقے یا چربے کا الزام لگایا ہے؟ بالکل نہیں۔ ہمارے بزرگ تو یہ کام بڑے فخر سے کیا کرتے تھے۔

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں (انیس)

یہ علم و ادب کے معاملات ہیں۔ ان مسائل پر گفتگو سے کوئی کسی کو دشمن یا قاتل قرار نہیں دیتا۔ محسن صاحب اور ان کے دوستوں نے قابل صاحب کے معاملے میں یہ پہلی مثال قائم کی ہے۔

ابھی حال کی بات ہے محسن بھوپالی نے اپنے بزرگ اور محترم شاعر حنیف اسعدی کی ایک نعت میں ایک غلطی کا نہ صرف سراغ دیا بلکہ اپنی طرف سے اصلاح بھی دے دی' لکھتے ہیں "میری دانست میں وہ چوتھے بند کے ایک مصرعے میں' روانی میں لکھ گئے ہیں" "رب ہفت عالمیں" یہاں عالمیں کی "عین" تو تقطیع میں گرجاتی ہے۔ وہ "رب عرش بریں" بھی کہہ سکتے تھے (خط مطبوعہ۔ اقدار کراچی نمبر۶ جلد نمبر۲ شمارہ نمبر ۲۳-۲۴)

اس اعتراض پر ایک نوجوان طالب علم نے محسن صاحب کی فروگزشتوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک مصرعے کی نشان دہی کردی۔

یہ کار عشق ہے اس میں مختتانہ نہیں ملتا

وہ کہتا ہے۔

"قافیہ میں تلفظ کی فاش غلطی ہے' مختتانہ کا لفظ محسن صاحب نے "محن تانہ" کے وزن پر باندھا ہے۔ جب کہ اس کا صحیح تلفظ "محنت آنہ" ہے جس کی ادائیگی سے مصرعہ ساقط الوزن ہوجاتا ہے"۔ (مطبوعہ "اقدار" جلد۳ شمارہ ۳-۴)

محسن صاحب نے جواباً تحریر کیا۔

"مجھے تسلیم ہے اور ہر کھلے دل کے شاعر کو اپنے کلام میں موجود غلطی کو اس کی نشان دہی پر تسلیم کرلینا چاہیے" کاش محسن صاحب حمایت صاحب کی بتائی ہوئی غلطیوں کو بھی اسی فراخدلی کے ساتھ قبول کرلیتے تو یہ بات "قابل دشمنی" کے الزام تک نہ پہنچتی۔ نہ ساجد امجد کے ناول میں ان کی "کردار کشی" کی جاتی اور نہ حمایت صاحب' چھ قسطوں پر مشتمل ایک مضمون لکھتے۔ دوسروں کو ان کی غلطیوں سے آگاہ کرنے کا "نیک فریضہ" محسن صاحب "خود" بھی برابر انجام دے رہے ہیں "تخلیق" (لاہور) میں ان کے اکثر خطوط اس عمل کے

آئینہ دار ہیں۔ قابل تحسین ہیں وہ نوجوان جو محسن صاحب کو اپنے سے بڑا سمجھ کر ان کی ہر بات برداشت کر رہے ہیں۔ کاش محسن صاحب بھی ایسے ہی صبر و تحمل کے عادی ہوتے۔

علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں ذرا دیر اسے تھام ابھی

محسن صاحب نے قابل کی زندگی میں اپنی "پاکستان گیر شہرت" کا حوالہ دیتے ہوئے خط کے آخر میں لکھا ہے کہ

"کنوینیر مجلس یادگار قابل کی حیثیت سے میں نے رفقاء کے تعاون سے "دیدہ بیدار" کی اشاعت کا اہتمام کیا تو اس کے پیش لفظ کو میں اپنے روابط کے علاوہ اپنی اور قابل کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں اپنے نام سے تفصیل کے ساتھ لکھ سکتا تھا لیکن میں نے عملاً گریز کرتے ہوئے پیش لفظ والا صفحہ لکھ کر آخر میں لفظ "ناشرین" کتاب کر دیا تھا"۔

محسن صاحب نے واقعی "مجلس یادگار قابل" کے ذریعے جو خدمات انجام دیں وہ قابل تعریف ہیں۔ خدا نے ان کو اس نیک کام کا صلہ بھی دیدیا۔ جتنی شہرت انہوں نے اس سلسلے میں حاصل کی، ان کے کسی رفیق کار کو نہیں ملی بالخصوص قابل کے وہ دوست جو اجمیر میں ان کے ساتھ تھے اور حیدر آباد میں بھی تادم مرگ ساتھ رہے اور شاید "مجلس یادگار قابل" میں بھی شریک تھے۔ جنہوں نے قابل صاحب کی زندگی میں اور انتقال کے بعد بھی ان کی شخصیت اور شاعری پر تفصیلی مضامین لکھے ---- طالب علم ڈائجسٹ (قابل نمبر) کے مرتب محمد حسین قریشی کے "حرف تشکر" سے لیکر احمد رئیس کے مضمون تک (جس کا اقتباس انہوں نے اپنے جوابی مضمون میں دیا ہے) محسن صاحب کی "قابل دوستی کی تشہیر" شاہد ہے انہوں نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ————

اور ساتھ ہی قابل صاحب کے ایک دوست سید ارتضاء عزمی کے یہ جملے بھی سوچنے کی دعوت دیتے ہیں جو ان کے مقالے "کچھ باتیں، کچھ یادیں" (قابل صاحب سے متعلق) مطبوعہ کتاب "ایک محقق، تین ادیب" (مطبوعہ ۹۲ء) کے صفحہ (۱۹۵) پر درج ہیں کہ

"انہیں لوگوں نے اس کے انتقال کے بعد "مجلس یادگار قابل" کی داغ بیل ڈال کر

مرحوم کے مرتب کردہ مجموعہ کلام "دیدۂ بیدار" کی اشاعت کا اہتمام کرکے اپنے سینوں پر نیک نامی کے تمغے سجا لئے۔"

"دیدۂ بیدار" ہو کہ "خون رگ جاں" دونوں میں بے شمار غلطیاں ہیں۔ غزلیں اور نظمیں ادھوری ہیں اور کچھ دوبارہ چھپ گئی ہیں۔ "کلیات قابل" کے اسقام کی ذمہ داری بھی ظاہر ہے کہ شہزاد احمد پر عائد نہیں ہوتی۔ اور شاید سلیم جعفری اور جاوید طفیل بھی اس کے ذمہ دار نہیں کیونکہ وہ صرف اس کے "ناشر" تھے۔ خیر، مرحوم کا "کلیات" چھپ گیا یہ ہی بہت کچھ ہے۔ اور اس کی داد بہرحال سلیم جعفری کو دینا چاہیے۔

جیسا کہ حمایت صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ "کلیات" میں "دیدہ بیدار" اور "خون رگ جاں" کی بھی اکثر نظمیں، غزلیں اور قطعات نہیں ہیں۔ قابل صاحب کا غیر مطبوعہ اور مختلف رسائل میں بکھرا ہوا کلام الگ ہے، جسے کلیات میں شامل ہونا چاہیے تھا۔ "کلیات" کی فہرست میں صفحہ ۱۴۲ سے ۱۵۸ تک کی غزلوں کا اندراج بھی نہیں ہے۔ شاید دوسرے ایڈیشن میں سلیم جعفری یہ کوتاہیاں دور کردیں۔ (خدا کرے)

اگر "مجلس یادگار قابل" اور "یونی کیرین امارات" اس سلسلے میں حمایت صاحب کی بھی خدمات حاصل کر سکیں تو ممکن ہے یہ خامیاں دور ہو جائیں۔ بشرطیکہ یہ حضرات حمایت صاحب کو بھی "قابل دوستوں" میں شمار کر سکیں۔

محسن صاحب یوں تو بڑے "کھلے دل" کے آدمی ہیں اپنے "کلیات" (مجموعہ سخن) کے سوونیئر میں انہوں نے ۶۱ء سے ۹۲ء تک اپنی کتابوں کی رونمائی کے سلسلے میں مختلف اخبارات کی رپورٹنگ کے عکس کے علاوہ مختلف مصنفوں کی کتابوں پر لیے ہوئے ان کے آٹوگراف کے عکس بھی شائع کردیئے ہیں، یہ دراصل "بڑے اہل قلم" سے ان کے تعلقات کا تحریری ثبوت ہے۔ (خدا کرے لوگ ان آٹوگرافس کی اشاعت کو ان کی سستی شہرت پسندی سے تعبیر نہ کریں)

فاضل مکتوب نگار محمد فاضل نے "بڑے اہل قلم" سے فرمائشی تاثرات "مانگنے" کے سلسلے میں انکشاف کیا ہے کہ حمایت صاحب کی کتابیں اور سوونیئر بھی ایسی تحریروں سے

آلودہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ''بڑے اہل قلم'' کے مطبوعہ مضامین سے (حوالوں کے ساتھ) اقتباسات دینا اور بڑے اہل قلم سے ''توصیفی جملے مانگ کر'' بطور فلیپ کتابوں پر چھاپنا دو مختلف عمل ہیں۔ (یہ صرف شاعر کی انا کا مسئلہ ہے)

محسن صاحب نے حمایت صاحب کے خلاف اپنے ''دو صفحاتی'' مضمون کی بار بار اشاعت کا جواز' ایک تو یہ پیش کیا کہ ''یہ پرچوں اور رسالوں کی ضرورت ہوگی'' (سبحان اللہ) دوسرے' طالب علم ڈائجسٹ کے قابل نمبر میں اس کی شمولیت فرمان فتحپوری کے مضمون کے حوالے سے کی گئی ہے۔ ان کی یادداشت کے مطابق وہ بھی ''مطبوعہ'' مضمون تھا۔ اب انہیں کون یاد دلائے کہ ''مشرب'' (کراچی) میں ان کا مضمون' حکومت سندھ کی طرف سے قابل صاحب کو ''شاعر سندھ'' کا خطاب ملنے پر لکھا گیا تھا اور حکومت وقت کی دوغلی پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے قابل صاحب کے علاج پر زور دیا گیا تھا (واضح ہو کہ یہ مضمون ''مشرب'' (کراچی) مئی ۵۵ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا جس کے ایڈیٹر (ڈاکٹر ساجد امجد کے سوانحی ناول اور بابو رفیق ریواڑوی کے انٹرویو کے حوالے سے) ''یکے از دشمنان قابل'' استاد اختر انصاری اکبر آبادی (مرحوم) تھے جنہوں نے ''نئی قدریں'' حیدر آباد میں قابل صاحب کی زندگی میں اور ان کے انتقال کے بعد بھی ان کی ''شاعری اور اس کی توصیف'' میں کئی مضامین شائع کیے۔) طالب علم ڈائجسٹ (فروری ۷۰ء) میں فرمان صاحب کا تازہ مضمون شائع ہوا جو قابل صاحب کے انتقال کے بعد لکھا گیا تھا۔ اور اس کا عنوان تھا ''غزل میں تجدد کی ایک مثال''

یہی نہیں ---- اور بھی مثالیں ہیں۔ ریکارڈ درست رکھنے کی ممکنہ کوششوں کے باوجود ان کی اپنی کتابوں میں بھی کئی متضاد حوالے ملتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے (بقول خود) ۵۱ء میں ''سندھ یونیورسٹی'' سے میٹرک پاس کیا تھا اور ''مہاجر سے خطاب'' ان کی پہلی نظم ہے جو ۱۷ مئی کو ''سندھ کنونشن لاڑکانہ'' میں پڑھی گئی تھی اور یکم جون ۵۲ء کو ہفت روزہ ''بیباک'' (ٹنڈو محمد خان) میں شائع ہوئی ---- یہ انکشاف محسن صاحب نے اپنے کلیات کے سوونیئر مطبوعہ ۱۰ مئی ۹۴ء میں (بقلم خود) کیا ہے۔ ویسے یہ نظم کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔

البتہ ''شکست شب'' میں کچھ نظموں اور غزلوں پر سال تحریر اس سے بھی پہلے کا ہے لیکن اشاعت کے حوالے چار پانچ سال بعد کے دیئے گئے ہیں۔

دو تین مثالیں دیکھئے۔

(۱) (غزل) جو چھوڑ آئے تھے گرداب میں سفینوں کو (۵۰ء) جب محسن صاحب نویں جماعت کے طالب علم تھے۔ (اشاعت کا کوئی حوالہ نہیں) شاید پہلی بار اس کتاب میں شائع ہوئی یعنی ۶۱ء میں۔

(۲) (نظم) خیر مقدم (۵۱ء) اشاعت۔ ''مشیر'' (کراچی) ۵۴ء

(۳) (نظم) مینا بازار (۵۱ء) اشاعت۔ ''نمکدان'' (کراچی) ۵۵ء

دلچسپ بات یہ ہے کہ ''یہی نظم'' ان کے محقق دوست شمیم احمد نے ''نمکدان'' میں ۵۴ء میں دریافت کرلی تھی (یعنی اشاعت سے ایک سال پہلے) اور حمایت علی شاعر پر ''دو مصرعے) چوری کرنے کا الزام عائد کردیا۔ (بحوالہ برش قلم۔ صفحہ نمبر ۲۹۱، مطبوعہ ۸۳ء)

''شکست شب'' میں پندرہ بیس نظمیں اور غزلیں ایسی ہیں جن پر سال تحریر اور سال اشاعت میں کئی برسوں کا فاصلہ ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا اسے محسن صاحب کا ''صبر و ضبط'' سمجھا جائے یا کسی مصلحت کا تقاضہ؟ شعراء کے بارے میں مشہور تو یہ ہے کہ وہ جب بھی کچھ لکھتے ہیں تو سنانے یا چھپوانے کے لئے بیتاب ہو جاتے ہیں ورنہ ''پیٹ کا عارضہ'' لاحق ہو جاتا ہے۔ خدا جانے محسن صاحب کون سا ''چورن'' استعمال کرتے ہیں۔

ایک اور دلچسپ مثال ــــــ

''ثلاثی'' کے بارے میں ''تثلیث'' (اردو نظم میں نیا تجربہ) کے عنوان سے ایک ہندوستانی نقاد اثر فاروقی کا ایک مضمون ماہنامہ ''الشجاع'' (کراچی) جون ۶۳ء میں شائع ہوا تھا۔ محسن صاحب نے ستمبر کے شمارے میں ایک مراسلہ چھپوا دیا اور اس میں یہ انکشاف کیا کہ ان کی نظم ''عشرت یک لمحہ'' سے متاثر ہو کر حمایت صاحب نے ثلاثی یا تثلیث کا تجربہ کیا ہے۔ حمایت صاحب کا جواب نومبر ۶۳ء کے ''الشجاع'' میں یا ''شخص و عکس'' میں پڑھا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے ''عشرت یک لمحہ'' کی خاطر محسن صاحب کے سارے مجموعے کھنگال ڈالے حتیٰ کہ کلیات بھی چھان مارا ــــ اس عنوان کی کوئی نظم نہیں ملی ــــ جب کہ

''کلیات'' میں سارا مطبوعہ کلام شامل ہوتا ہے۔ خیر' اس چھان بین میں خود حمایت علی شاعر کی ایک طویل نظم مطالعے میں آگئی۔ ''شاید کہ بہار آئی'' (مطبوعہ - ''ماہ نو'' کراچی- فروری ۵۶ء) یہ نظم ''ثلاثی'' کی تیکنک میں لکھی گئی تھی۔

''بنگال سے کوریا تک'' اور ''پرچھائیاں'' کے سلسلے میں بھی ان کا' شمیم احمد کا اور قمر جمیل کا ''مشترکہ جھوٹ'' دعوت فکر دیتا ہے۔ اور مجھ ایسے قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہمارے اہل علم و ادب کسی کی مخالفت میں کتنے پست ہوسکتے ہیں۔! شمیم احمد کے تو مضامین کا لہجہ ہی ان کے ''خبث باطن'' کا آئینہ دار ہے۔ (بحوالہ مضامین ''برش قلم'' اور روزنامہ ''جسارت'' کراچی- ۲۴ر جون ۸۳ء) قمر جمیل بھی ان کے نقش قدم پر چل کر کچھ کم خراب نہیں ہوئے بے شمار لوگ جانتے ہیں کہ حمایت صاحب اپنی یہ طویل نظم ''بنگال سے کوریا تک'' ۵۲ء سے مشاعروں میں سنا رہے ہیں اور اس بات کا تو محسن صاحب بھی اقرار کریں گے کہ ان سے یہ نظم کتنے اصرار کے ساتھ سنی جاتی تھی۔ شاید وہ یہ بھی جانتے ہوں کہ ۵۲ء ہی سے یہ نظم پاکستان اور ہندوستان کے مختلف رسالوں میں چھپ رہی ہے- سب سے پہلے اردو کالج کے مجلّہ ''برگ گل'' کے پہلے شمارے (تعلیمی سال ۵۲ء-۵۳ء) میں ''تصور'' کے عنوان سے اس کا ایک حصہ چھپا تھا (صفحہ نمبر۱۱۹) یہ شمارہ ابن انشاء کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔ پوری نظم پہلی بار' مارچ ۵۴ء میں (زیر ادارت وامق جونپوری) ماہنامہ ''شاہراہ'' (دہلی) کے سالنامے میں شائع ہوئی تھی۔ یہ وہی رسالہ ہے جسے ابتدا میں ساحر لدھیانوی ایڈٹ کرتے تھے۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ حمایت صاحب ۵۱ء میں پاکستان آگئے تھے اور ۵۲ء میں ''اردو کالج'' کے طالب علم رہے۔ ساحر صاحب کی پرچھائیاں' پہلی بار ۵۵ء میں شائع ہوئی۔ ساحر صاحب کے پیش لفظ اور علی سردار جعفری کے دیباچے کی تاریخیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ۲۱ر اور ۲۳ر نومبر ۵۵ء) اس سے پہلے ''پرچھائیاں'' کا کوئی حصہ کہیں شائع نہیں ہوا تھا۔ یہ ساری تفصیلات ''شاہراہ'' کے عکس کے ساتھ ''شخص و عکس'' میں بھی موجود ہیں۔ محسن صاحب نے اپنے مضمون ''کچھ یادیں' کچھ باتیں'' (مطبوعہ روزنامہ ''جنگ'' راولپنڈی- مورخہ ۱۵ر دسمبر ۷۲ء) میں اسی نظم کے تعلق سے ''چند حاسدوں اور کوتاہ نظر شاعروں'' کا ذکر بھی کیا

مگر ---- ہائے رے شہرت کی ہوس! ۸۳ء میں شمیم احمد اور قمر جمیل کے بے بنیاد الزامات پر محمول مضامین کا تھوڑا بہت "شہرہ" ہوا تو محسن بھوپالی کے منہ میں پانی بھر آیا اور انہوں نے ایک غیر متعلق مضمون میں دعویٰ کرکے حمایت صاحب کی مخالفت کا "اولین اعزاز" حاصل کرلیا۔ (بحوالہ روزنامہ "جسارت" ۲۶ر اگست ۸۳ء۔ روزنامہ "حریت" ۲۳ر ستمبر ۸۳ء اور روزنامہ "کلیم" ۳۰ر مارچ ۸۴ء) اور سنہ ۷۲ء کے لکھے ہوئے اپنے ہی مضمون کو "وقتی مصلحت" سے تعبیر کردیا۔ لکھتے ہیں۔

"وہ مضمون کسی فن کار کے ساتھ شام منانے کی تقریب کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھا گیا تھا۔" (مطبوعہ "کلیم" ۳۰ر مارچ ۸۴ء)

اور اب اپنے جوابی مضمون (مطبوعہ "قومی اخبار" میگزین۔ مورخہ ۱۶ر جولائی ۹۳ء) میں بھی بہ الفاظ دیگر یہی بات دہرائی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محسن صاحب کی ہر تحریر کسی نہ کسی مصلحت یا وقتی تقاضے کے تابع ہوتی ہے۔

خیر ---- یہ ان کا نقطۂ نظر ہوگا ---- وقت اپنا فیصلہ دیا کرتا ہے۔ اب ان کی عمر اور وقت کا تقاضا یہ ہے کہ دوسروں کو موردِ الزام ٹھہرانے کی بجائے اپنے گریبان میں جھانک لیں، محسن صاحب نے قابل صاحب کی شخصیت اور شاعری پر ان کی زندگی میں کچھ لکھا نہ ان کے مرنے کے بعد ---- حتیٰ کہ ان کی کتابوں پر چند سطری فلیپ بھی نہیں لکھے حالانکہ فلیپ لکھنا اور لکھوانا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ کیا عمر بھر کے تعلقات کا حاصل ---- وہی دو صفحاتی ---- "چند یادیں" ہیں جو انہوں نے قابل صاحب کے انتقال کے پانچ سال کے بعد لکھیں۔ (طبع اول۔ گہوارہ۔ ۶۷ء) اور پھر پاکستان اور ہندوستان کے مختلف رسائل واخبارات میں بار بار چھپوائیں ----؟ اس مضمون میں بھی قابل صاحب کی محبت کم اور حمایت صاحب کو دکھ دینے کی مسرت زیادہ پوشیدہ تھی۔

"ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اس کا آسماں کیوں ہو" | غالب

ایڈیٹر "قومی اخبار" کے نام رجسٹری کی رسید کا عکس صفحہ (۱۲۶) پر دیکھئے (مرتب)

"دوستی کی سزا"

محسن صاحب نے اپنے دوسرے خط میں (صفحہ ۹۱ پر) "شعور" میں قابل صاحب پر مضمون اور کلام نہ چھاپنے کا گلہ کیا ہے۔ میں نے جب حمایت صاحب سے اسکا سبب پوچھا تو انھوں نے مسکرا کر جواب دیا "محسن صاحب اگر مضمون لکھ دیتے تو میں ضرور شائع کرتا۔ آخر "شعور" میں محسن صاحب کا کلام بھی تو چھپتا تھا۔ جہاں تک میرے لکھنے کا سوال ہے' تو میں ان سے اتنا واقف نہیں تھا۔ وہی بات جو ڈاکٹر کریم الدین احمد نے لکھی' میرے تعلق سے بھی درست ہے"۔ ڈاکٹر صاحب اپنے مضمون "قابل کی شعری دنیا" (مطبوعہ طالب علم ڈائجسٹ "قابل نمبر" فروری ۷۰ء) میں لکھتے ہیں۔

" مجھ سے ایک آدھ صاحب نے مضمون لکھنے کو کہا۔ میں ٹال گیا۔ میں کیا لکھوں؟ میں تو جانتا ہی نہیں تھا۔ اس وقت تک ان کا مجموعہ بھی نہیں چھپا تھا۔ صرف سو اشعار کا کتابچہ بازار میں تھا۔ بھلا اس سے شاعر کا کیا پتہ چل سکتا ہے۔ مضمون تو ان لوگوں کو لکھنا چاہئے تھا جو شاعر کے ساتھ چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھتے رہے ہیں۔ جو شاعر کی تخلیقات کے کسی حد تک ہم راز ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی مضمون نہیں لکھا۔ معلوم نہیں یہ محبت کی علامت ہے یا ----"

ظاہر ہے کہ محسن صاحب کی قابل صاحب سے "ایسی ہی دوستی" تھی (بحوالہ "چند یادیں" نوشتہ محسن بھوپالی' اور "قابل کی سرگزشت"۔ نوشتہ ساجد امجد) حمایت صاحب ۵۵ء میں حیدر آباد آئے تھے اور ۵۶ میں شعور شائع کیا۔ ان دنوں قابل صاحب کوئٹہ سینی ٹوریم میں زیر علاج تھے۔ ملاحظہ ہو (صفحہ ۵۱) مکتوب قابل اجمیری۔ مورخہ ۱۰ اگست ۵۶ء مطبوعہ "نئی قدریں" اکتوبر ۵۶ء۔ اسکے علاوہ ۶۰ء اور ۶۱ء کے درمیان بھی وہ کچھ عرصہ کوئٹہ میں ہی رہے۔ اسی دوران انہوں نے محترمہ نرگس سے شادی کی۔ ملاحظہ ہو انٹرویو بیگم قابل اجمیری۔ نوشتہ توصیف چغتائی۔ (صفحہ ۱۳۱) محسن صاحب کاش اپنے عمل پر بھی غور کرتے۔ گزشتہ (۳۲) سال سے نہ صرف قابل صاحب کا کلام' ان کے "رشحات قلم" کا منتظر ہے بلکہ "باقیات قابل" بھی اشاعت کے "عزم جرات مندانہ" کی اب تک راہ دیکھ رہی ہے۔ ("قابل لائبریری" اور "قابل میموریل اسکول" کے دعوے تو "افسانہ پارینہ" ہوئے) شاید قابل صاحب نے ایسے ہی دوستوں کے لئے کہا تھا۔

کوئی احسان کر کے قابل پر
دوستی کی سزا نہ دے جانا

(مرتب)

محسن بھوپالی

چند یادیں

(یہ مضمون قابل صاحب کے انتقال کے پانچ سال بعد لکھا گیا اور اس میں کہیں حمایت صاحب کا نام ہے نہ کوئی واضح اشارہ (مرتب)

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ مشاعرہ شباب پر تھا کہ اچانک صدر مشاعرہ نے مائیک سنبھالا اور ایک رندھی ہوئی آواز نے فضا میں سوگواری کی سی کیفیت پیدا کردی۔ حضرات! میری صدارت پر ایک ہم عصر شاعر کو اعتراض ہے اس لیے منتظمین کے کہنے پر صدارت سے دستبردار ہوتا ہوں اور.... اور میں گھر جا رہا ہوں۔ آخری فقرہ درد کی گہرائیوں میں ڈوب چکا تھا۔ سامعین ششدر رہ گئے۔ مشاعرہ گاہ پر چند ثانیوں کے لیے سناٹا چھا گیا۔

قابل اجمیری اسٹیج سے اترے اور بھاری قدموں کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ میں نے محسوس کیا جیسے یہ میری توہین ہوئی ہے۔ ایک شاعر کی توہین ہوئی ہے۔ قریب ہی مرزا عابد عباس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ عابد صاحب یہ سخت ناانصافی ہے۔ قابل صاحب کو روکنا چاہیے اور عابد صاحب نے اثبات میں کہا۔ میں تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔ اور میں نے قابل اجمیری صاحب کا ہاتھ تھام لیا۔ چند لمحوں میں قابل صاحب مسند صدارت پر تھے۔

مائیک پر آکر میں نے کہنا شروع کیا۔

حضرات! یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ ادبی سیاست یہاں بھی در آئی ہے۔ یہ ادبی محفل ہے۔ یہاں کسی قسم کی سیاست کو دخل نہیں دینا چاہیے۔ میری درخواست ہے کہ اس

---

[1] (مشاعرہ جام شورو ۱۹۶۱ء)

مشاعرے کی صدارت قابل صاحب جاری رکھیں۔ آپ حضرات سے توقع ہے کہ آپ تائید فرمائیں گے۔ مجمع میں جان پڑ گئی۔ چاروں طرف سے تالیوں کی آواز آنے لگی تھی۔ اوراس طرح یہ مشاعرہ دوبارہ شروع ہوگیا۔

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ایک رات کوئی گیارہ بجے کا عمل ہوگا۔ سوسائٹی کے نزدیک قابل صاحب سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ میرے ساتھ حسن ظہیر تھے۔ قابل صاحب نے چھوٹتے ہی کہا۔ لوگ اب مجھے شاعر ماننے سے انکار کر رہے ہیں۔ ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ میں نے اور حسن ظہیر نے انہیں دلاسہ دیا۔ دیر تک حیدر آباد کی ادبی سیاست پر گفتگو ہوتی رہی اور کوئی ایک بجے وہ ہم سے جدا ہوئے۔

میں سوچتا رہا تپ دق کا مریض یوں بھی حساس ہوتا ہے۔ اور اگر وہ شاعر ہو تو اور بھی زیادہ حساس ہوتا ہے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ قابل اجمیری صاحب ذرا ذرا سی بات کو بیحد اہمیت دینے لگے تھے۔

مجھے وہ تنقیدی نشست بھی یاد ہے۔ جہاں شہر کے منتخب شعراء اور ادیب جمع تھے۔ قابل صاحب نے اپنی غزل تنقید کے لیے پیش کی اور ایک شاعر اور ان کے چند ساتھیوں نے تابڑتوڑ حملے کردیئے۔ جوش تنقید میں نہیں۔ بلکہ جوش تنقیص میں۔ شاعر صاحب۔ قابل کے ایک شعر کو جوں کا توں باقی صدیقی کا شعر بتا گئے۔ اور اس طرح قابل صاحب کا دل توڑ کر رکھ دیا۔

حالانکہ بعد میں تحقیق سے پتہ چلا کہ باقی نے اس طرح میں کوئی شعر نہیں کہا ہے۔

اللہ اللہ یہ جسارت! شعریت کا بھرم رکھنے کے لیے۔!!

ایک دن آیا کہ قابل ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوگیا۔ وہ ۳؍اکتوبر ۱۹۶۲ء کا دن تھا۔

وہ قابل جو اس اعتماد کے ساتھ جی رہا تھا کہ۔

زندگی کو مری ضرورت ہے

دوسروں کی ضرورتوں پر قربان ہوگیا۔ چو نکیئے نہیں۔ پروپیگنڈہ اور شہرت آج کے شاعر

کی ضرورت ہے۔

دولت آج کے شاعر کی ضرورت ہے۔!!

ادبی ساکھ آج کے شاعر کی ضرورت ہے۔!!

اور قابل زندگی بھران سے محروم رہا۔ اسے خود بھی احساس تھا لیکن وہ اپنے جوہر سے نا آشنا نہ تھا۔

اس نے بہت پہلے کہہ دیا تھا

اجل کی گود میں قابل ہوئی ہے عمر تمام
عجب نہیں کہ مری موت زندگی ہو جائے

(قابل اجمیری پر لکھا ہوا محسن صاحب کا واحد مضمون جو متعدد بار شائع کیا گیا)

مطبوعہ "گہوارہ" (قابل نمبر) ۶۷ء - حیدر آباد

مطبوعہ - طالب علم ڈائجسٹ (قابل نمبر) فروری ۷۰ء - حیدر آباد

مطبوعہ - روزنامہ "پاسبان" ۵ / نومبر ۸۵ء حیدر آباد

مطبوعہ - کلیات قابل ۹۲ء (اقتباسات کی صورت) ضخامت (۲۱۱) صفحات

سنا گیا ہے کہ ان کے علاوہ یہی مضمون ہندوستان میں اجمیر اور بھوپال کے رسائل میں بھی چھپوایا گیا ہے۔ واللہ اعلم ---- (مرتب)

رجسٹری کی رسید کا عکس

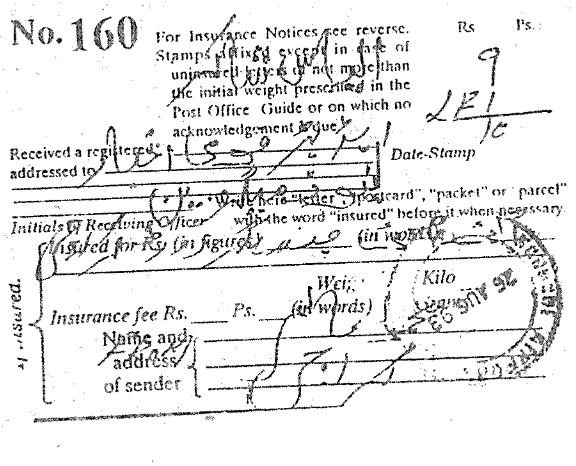
No. 160 For Insurance Notices see reverse. Stamps affixed except in case of uninsured letters of not more than the initial weight prescribed in the Post Office Guide or on which no acknowledgement is due.

Rs Ps.

Received a registered ... addressed to ...

Date-Stamp

Write here "letter", "postcard", "packet" or "parcel" with the word "insured" before it when necessary.

Initials of Receiving Officer

Insured for Rs. (in figures) ... (in words)

Insurance fee Rs. ... Ps. ...

Weight (in words) ... Kilo

Name and address of sender

(مطبوعہ روزنامہ "پاسبان" حیدر آباد۔ مورخہ ۱۲ر نومبر ۸۵ء)

سید کاظم رضا

قابل، محسن اور......

محسن صاحب کا مضمون "چند یادیں" جب تیسری بار "حمایت صاحب کی تصویر کے ساتھ" ۵ر نومبر ۸۵ء روزنامہ "پاسبان" حیدر آباد میں شائع کیا گیا تو سید کاظم رضا نے یہ وضاحتی مضمون لکھا۔(مرتب)

۳۱ر اکتوبر* قابل اجمیری مرحوم کی برسی کا دن تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ اس روز حیدر آباد میں قابل اجمیری کی یاد میں کوئی تقریب منعقد نہ ہوئی حالانکہ قابل اجمیری مرحوم نے اپنی زندگی کا خاصہ حصہ اس شہر میں گزارا تھا اور یہیں انہوں نے اپنے بہترین اشعار کہے تھے۔

اس کو بے مہری عالم کا صلہ کہتے ہیں

پاسبان، اور اس کے ادبی صفحے کے نگراں برادرم عزیز احمد وارثی اس لحاظ سے قابل ستائش اور ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ۵ر نومبر ۱۹۸۵ء کے ادبی ایڈیشن میں قابل مرحوم کے بارے میں دو مضامین اور ان کی منتخب غزلیں چھاپ کر شہر والوں کو اس فروگذاشت کا احساس دلایا۔

مجھے یقین ہے کہ برادرم عزیز احمد وارثی نے قابل صاحب کے بارے میں مضامین انتہائی نیک نیتی سے شائع کیے ہیں تاہم کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ محترم محسن بھوپالی والا مضمون اب نہ چھاپتے۔ یہ مضمون بہت عرصہ قبل لکھا گیا تھا۔ اور اس وقت کسی اخبار یا رسالے میں شائع بھی ہوا تھا۔ مگر آج کے بیشتر قارئین کو اس وقت کے حالات اور اس دور کے ادبی ماحول سے واقفیت نہیں ہے۔ چنانچہ اس مضمون سے قابل اجمیری مرحوم یا ادبی حلقوں کو کوئی فائدہ پہنچنے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی بلکہ مجھے اندیشہ ہے کہ

---

* ۳ر اکتوبر (مرتب)

کئی سوئے ہوئے فتنے از سرِ نو جاگ اٹھیں گے۔

محسن بھوپالی صاحب نے اپنے مضمون میں کسی صاحب کا نام نہیں لیا ہے۔ مگر یہ صاف ہے کہ ان کا اشارہ کس طرف ہے۔ میں بھی نام نہیں لوں گا مگر اپنی اور پڑھنے والوں کی آسانی کے لیے میں انہیں "محسن صاحب کے ممدوح" کے نام سے پکاروں گا۔

جس زمانے کا اس مضمون میں ذکر ہے۔ میں نے وہ زمانہ دیکھا ہے۔ جس مشاعرے کا اس مضمون میں ذکر ہے۔ وہ بھی میرے سامنے کی بات ہے۔ اس لیے میں تصویر کا دوسرا رخ پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

جس زمانے کا یادگار یہ مضمون ہے اس زمانے میں محسن بھوپالی اور ان کے ممدوح کے درمیان ایسے برادرانہ اور دوستانہ مراسم نہیں تھے' جیسے آج ہیں۔ اس زمانے میں محسن صاحب اور ان کے ممدوح ہم عصر ہونے کے ناطے ایک دوسرے کے حلیف نہیں حریف تھے اور میں نے اکثر اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا ہے کہ محسن صاحب مشاعرہ گاہ میں پہنچنے کے باوجود اس وقت تک پنڈال سے باہر ٹہلتے رہتے تھے جب تک کہ ان کے ممدوح کا نام نہ پکار لیا جائے۔ مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ انہیں ان کے ممدوح کے بعد کلام سنانے کا موقع میسر آجائے۔ گویا اس دور میں محسن صاحب اور ان کے ممدوح کے درمیان ٹھنی رہتی تھی۔

محسن صاحب نے اپنے مضمون میں جس مشاعرے کا ذکر کیا ہے کہ اس مشاعرے کے منتظمین نے محسن صاحب کے ممدوح سے رابطہ پیدا کرکے انہیں بااصرار اس امر پر آمادہ کیا تھا کہ وہ مذکورہ مشاعرے کی صدارت قبول کرلیں مگر یہ بات محسن صاحب کو گوارہ نہ ہوئی اور انہوں نے اندر ہی اندر سازباز کرکے مشاعرے کی صدارت کی مسند پر قابل اجمیری مرحوم کو بٹھا دیا۔

قابل اجمیری مرحوم انتہائی شریف اور معصوم انسان تھے۔ وہ اس سیاست سے آگاہ نہ تھے۔ مگر جب محسن صاحب کے ممدوح' مشاعرہ گاہ میں پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جس مشاعرے کی صدارت کے لیے انہیں مجبور کیا گیا تھا' وہاں کسی چال کے تحت قابل

اجمیری مرحوم کو صدر بنا دیا گیا ہے۔ محسن بھوپالی کے ممدوح نے اس طرزِ عمل کے خلاف احتجاج کیا تھا مگر احتجاج کا رخ ہرگز قابل اجمیری مرحوم کی طرف نہیں تھا بلکہ وہ اس غلط روش کا منتظمین کو احساس دلانا چاہتے تھے۔ محسن صاحب کے ممدوح نے احتجاج بھی کیا اور بعد میں قابل صاحب کی صدارت میں کلام بھی سنایا۔ گویا انہوں نے منتظمین کی بدعہدی اور جوڑ توڑ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنے رفیق اور ہم عصر شاعر کی عزت و توقیر بھی کی۔ محسن بھوپالی صاحب چونکہ اس زمانے میں اپنے ممدوح کے خلاف اپنے دل میں نفرت و اختلاف کا ایک سمندر رکھتے تھے۔ انہوں نے غلط بیانی کرتے ہوئے اپنے ممدوح کے احتجاج کا رخ قابل اجمیری مرحوم کی ذات کی طرف موڑ کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں قابل اجمیری مرحوم کی ذات سے کوئی ہمدردی یا محبت نہیں تھی۔

اسی طرح اس مضمون میں ایک تنقیدی نشست کا بھی ذکر ہے۔ اس تنقیدی نشست میں قابل اجمیری مرحوم نے اپنی وہ معروف غزل سنائی تھی جس کا مطلع تھا۔

تم نے مانو مگر حقیقت ہے
عشق انسان کی ضرورت ہے

میں اس نشست میں موجود تھا۔ قابل مرحوم کے ایک شعر پر یہ کہا گیا تھا کہ قابل صاحب کا مذکورہ شعر باقی صدیقی کے ایک شعر کا چربہ[ﮦ] معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات تنقیدی نشست میں کہی گئی ایک بات تھی اور کوئی حتمی رائے نہیں تھی۔ نشست کے دوران بھی اس رائے سے اختلاف کیا گیا تھا۔ ہم تنقیدی نشستوں کے انداز اور مزاج سے واقف ہیں۔ وہاں ایسا بھی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی محض گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے ایسا کرنا پڑتا ہے۔ کسی کی تحقیر یا تذلیل ہرگز مطلوب نہیں ہوتی۔ اس ایک بے ضرر سے واقعے کو بھی محسن بھوپالی صاحب نے اپنی مقصد براری کے لیے توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ بات ادبی بددیانتی کے زمرے میں آتی ہے۔

میرے لیے محسن صاحب اور ان کے ممدوح دونوں ہی محترم ہیں مگر یہ داستان دہرانا

ﮦ حمایت صاحب نے [illegible] ملاحظہ ہو صفحہ [illegible] — (مرتب)

اس لیے ضروری تھا کہ تاریخی حقائق کو ذاتی منفعت کی خاطر مسخ کرنا قابلِ مذمت رجحان ہے اور اس کی ہر مرحلے پر ہمت شکنی ہونی چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ گڑے مردے اکھاڑنے سے کسی کا بھلا نہیں ہوتا بلکہ گلی سڑی نعشوں کے تعفن سے ساری فضا مکدر ہو جاتی ہے۔

آج قابل اجمیری صاحب مرحوم ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ قابل صاحب مرحوم نے بڑی کٹھن زندگی گزاری۔ وہ ایک انتہائی موذی مرض کا شکار تھے۔ اس مرض کے علاج میں کس نے ان کی مدد کی اور کس کس نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ بیماری کے باعث ان کا رات کو دیر تک جاگتے رہنا مضر ہے۔ انہیں ہوٹل میں رات گئے تک بٹھائے رکھنے اور بھوکے پیٹ چائے پلاتے رہنے کا فرض بحسن خوبی ادا کیا۔ ان دونوں میں سے کون قابل صاحب کا دوست تھا اور کون دشمن، اس کا فیصلہ کرنا تو اس وقت مشکل تھا نہ آج—مگر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قابل صاحب مرحوم کی شعری عظمت آج ہر شخص تسلیم کرتا ہے اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ موت ہر شخص کی منزل ہے اور ہمارا تو یہ عقیدہ ہے کہ موت کا ایک دن معین ہوتا ہے چنانچہ ہم کسی پر کسی کی موت کا الزام رکھ کر کوئی نیک کام نہیں کرتے۔

"پاسبان" نے قابل اجمیری مرحوم کی برسی کے موقع پر مضامین اور قابل صاحب کا کلام چھاپ کر اپنا فرض ادا کیا ہے۔ مگر کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس موقع پر محسن بھوپالی کا یہ متنازعہ اور بدنیتی سے تحریر کیا ہوا مضمون شائع نہ کیا جاتا۔ مجھے یقین ہے کہ اب محسن صاحب خود بھی اس مضمون کے مندرجات کو OWN کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔

توصیف چغتائی

بیگم قابل اجمیری

(طبع دوم۔ "طالب علم" ڈائجسٹ۔ قابل نمبر۔ فروری ۷۰ء)

اسرار الحق مجاز اور قابل اجمیری سے میں کبھی نہیں ملا۔ پھر بھی جانے کیوں مجھے ہر لمحہ یہی احساس ہوتا رہا ہے کہ مجاز اور قابل میرے گہرے دوست تھے۔

دراصل مجاز اور قابل اجمیری کی زندگی میں بڑی مماثلت ہے۔ دونوں ایسے تھے جن کے اشعار میں زندگی کی تمام تر تلخیاں اور نفسیات کی باریکیاں سموئی ہوئی ہیں۔ ان کی شاعری میں داخلی زندگی کی جھلکیاں صاف طور پر نظر آتی ہیں۔ اضطراب غم، غم دوراں اور غم جاناں کا درد ان کی شاعری کی روح ہے۔

مجاز اور قابل اردو ادب کے خالص شاعر تھے۔ مجاز پہلے پیدا ہوئے اور پہلے مرے۔ اور قابل مجاز کے بعد ابھرے اور مجاز ہی کی طرح زندگی سے جہاد کرتے ہوئے خاموش ہوگئے۔ دونوں کی زندگی مسلسل جدوجہد تھی۔ دونوں غم جاناں اور غم دوراں کا شکار تھے۔ دونوں ہی ہواؤں کا رخ بدلنے کا عزم رکھتے تھے۔ اس زندگی کے کٹھن سفر میں مجاز اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے اور پھر یوں ہوا کہ ایک شاعر نے شراب خانے کی چھت پر دم توڑ دیا۔ قابل اجمیری حالات سے جنگ کرتے رہے یہاں تک کہ وقت کے آگے انہیں جھکنا ہی پڑا اور خون تھوکتے تھوکتے اسی سمت چلے گئے جہاں سے کوئی نہیں لوٹتا۔

میں نے قابل اور ان کی بیگم کے بارے میں بہت سی باتیں سن رکھی تھیں۔ اور جب بھی کسی نے قابل اجمیری اور ان کی بیگم کا تذکرہ کیا تو نہ جانے کیوں میرا دل چاہا کہ

احتراماً جھک جاؤں۔ دراصل بیگم قابل کے کردار میں عظمت ہے اور یہی وجہ رہی کہ میں دیکھنا یہ چاہتا تھا کہ وہ عورت کیسی ہوسکتی ہے جو اپنی امنگوں اور حسرتوں اور اپنے سنہرے خوابوں کو اردو ادب کے ایک بیمار مفلس شاعر کے لیے قربان کرسکتی ہے۔

میں نے جگہ جگہ انہیں تلاش کیا اور آخرکار میں نے انہیں ملٹری ہوسپٹل میں پا ہی لیا اور اسی لمحہ میرا دل چاہا کہ میں ان سے کہوں "مادام! آپ بہت عظیم ہیں۔ آپ نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنے ہاتھ لہو میں بھر لیے۔ ایک شاعر' وہ بھی اردو ادب کا' پھر ٹی بی کا مریض' اس کے لیے اتنی عظیم قربانی۔ آپ خوب اچھی طرح جانتی تھیں کہ شاعر موت کے جھولے میں جھول رہا ہے۔ اور کون جانے کب تک کا مہمان ہو۔ پھر سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپ نے اسے کیوں اپنا لیا؟

لیکن میں ان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ دراصل وہ قابل کے ذکر میں اتنی کھوئی ہوئی تھیں کہ میں سنتا رہا اور وہ کہتی رہیں۔

قابل صاحب سے ان کی ملاقات کوئٹہ کے ریلوے سینی ٹوریم میں ۱۹۶۰ء میں ہوئی تھی۔ اور جب انہوں نے محسوس کیا کہ شاعر یاس و آس کا شکار ہے اور اس کے حالات نازک ترین ہیں۔ تب انہوں نے شاعر کو موت کے منھ سے بچانے کا پورا عزم کرلیا اور دن رات اس کی صحت یابی کے لیے کوشش کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ شاعر نے کروٹ لی اور محسوس کیا کہ اس کا کھویا ہوا اعتماد پھر واپس آگیا ہے اور یہ کہ زندگی بہت حسین ہے اسے جینا چاہیے۔

جی رہا ہوں اس اعتماد کے ساتھ
زندگی کو مری ضرورت ہے

زندگی کو واقعی قابل جیسے شاعر کی ضرورت تھی۔ لیکن برا ہو حالات کا۔ بھلا حالات نے بھی کسی کا ساتھ دیا ہے۔

قابل اجمیری مرحوم کی بیگم میرے سامنے بیٹھی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں "میں نے محسوس کیا کہ قابل بے حد دکھی انسان ہیں۔ ایسے دکھی جن کے پاس غم اور فکر دوراں

کے علاوہ اور کچھ نہیں۔۔ اسی لیے میں نے سوچا کہ شاید میرا سہارا ان کی مایوس زندگی میں نئے خواب بکھیر دے۔ چنانچہ میں نے ان سے شادی کرلی۔ حالات کسی حد تک خوشگوار ہوگئے۔ ہم لوگ کوئٹہ سے حیدر آباد چلے آئے۔ قابل صاحب کو میں نے گھر ہی پر رکھا اور علاج برابر جاری رکھا۔ اسی عرصے میں ہمارے یہاں ایک بچہ ہوا جس کا نام قابل صاحب نے روشن ضمیر رکھا جو اب تقریباً چھ سال کا ہے۔ اور حیدر آباد میں زیر تعلیم ہے۔"

"قابل صاحب میں ایسی کون سی خاص بات تھی جو آپ ان سے اس حد تک متاثر ہوئیں؟" میں نے پوچھا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔۔"دیکھیے نا، بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو بہت ہی پر کشش ہوتی ہیں۔ یا پھر یوں ہوتا ہے کہ غموں کی پرچھائیاں پڑنے کے بعد بعض چہرے اور بھی نکھر جاتے ہیں۔ میرے اندر بچپن ہی سے قربانی اور ایثار کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسی لیے میں نے اپنے لیے نرس کا پیشہ اختیار کیا۔ اور آج مجھے خوشی ہے کہ میں نے بے انتہا مریضوں کی خدمت کرنے کے ساتھ ایک فنکار کو سہارا دیا ہے۔ اور اب میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ میرا بچہ جو میرے محبوب شاعر کا بچہ ہے، بڑا ہو کر زندگی کے ان حالات کو شکست دے جنہوں نے اس کے باپ کو شکست دی تھی۔ اور بس!"

یہ کہتے کہتے وہ جذباتی ہوگئیں۔ میں نے ان کا موڈ بدلنے کے لیے ان سے کہا۔

"آپ کو قابل صاحب کے جو پسندیدہ اشعار یاد ہوں وہ سنایئے۔"

"آپ کو کیا کیا سناؤں! مجھے تو ان کا سارا کلام زبانی یاد ہے۔ پھر بھی ان کے یہ شعر مجھے خوبصورت لگتے ہیں۔"

جنم جنم کے اندھیروں کو دے رہا ہے شکست
وہ اک چراغ کہ اپنے لہو سے روشن ہے

○

اے آفتاب صبح بہاراں سلام کر
دیوانے آ رہے ہیں شب غم گزار کے

○

ہم بدلتے ہیں رخ ہواؤں کا
آئے دنیا ہمارے ساتھ چلے

○

نہ گھبراؤ تم ہجر کی تیرگی سے
سحر بھی نمودار ہوگی اسی سے

"قابل اجمیری کا نام عبدالرحیم تھا۔ اجمیر شریف میں ۱۹۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ قابل تخلص رکھا اور تپ دق کے مرض میں مبتلا رہے اور آخر۔۔" ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ شاید وہ حال کی دہلیز پھلانگ کر ماضی کے ہولناک اندھیروں کی طرف جا پہنچی تھیں۔ وہ پھر بولیں۔ "قابل صاحب کو میں نے گھر ہی پر رکھا تھا۔ اور اب وہ پہلے کی نسبت اچھے ہوتے جا رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ہمارے بچے کی پہلی سالگرہ تھی۔ میں خوش تھی، وہ بھی خوش تھے۔ لیکن اچانک انہوں نے خون تھوکا۔ میں گھبرا کر ہسپتال کی جانب دوڑی اور ایمبولینس کے لیے کہہ کر آئی۔ لیکن جب گھر پہنچی تو ان کی حالت بہت نازک تھی۔ میں نے فوراً ان کے دوستوں کی مدد سے انہیں اسپتال پہنچانا چاہا۔ جلدی جلدی میں ہم لوگ انہیں لے کر اسپتال کی جانب بڑھے۔ لیکن میرا دل بیٹھا.... جا رہا تھا۔ مجھے ہر لمحہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے لوگ ضرورت سے زیادہ گھبرائے ہوئے ہیں اور قابل صاحب کہیں ان کے ہاتھوں سے گر نہ جائیں۔ اور چند لمحوں بعد یوں ہی ہوا۔ قابل صاحب ان لوگوں سے سنبھل نہ سکے اور زمین پر آ رہے۔ خون کافی مقدار میں پہلے ہی بہہ چکا تھا۔ یہ دیکھ کر میری چیخ نکل گئی۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور دھیمی آواز میں پکارا۔ اور پھر ان کا سر دوسری جانب ڈھلک گیا۔"

یہ شاعر کی موت تھی، ایک ایسے شاعر کی موت جس نے وطن کے گیت الاپے،

حالات سے جہاد کیا' ناکامیوں کو کچلنے کی کوشش کی' اور ہر لمحہ نئے حوصلے' نئے جنون سے جینا چاہا۔ لیکن حالات کے ہاتھوں فنکار شکست کھا گیا۔ اور یوں قابل اجمیری جیسا شاعر ہم لوگوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روٹھ گیا۔

قابل اجمیری مرحوم کی بیگم کا نام نرگس ہے۔ وہ پہلے عیسائی مذہب سے تعلق رکھتی تھیں اور شادی سے پہلے انہوں نے مذہب اسلام اختیار کیا۔ یہ ان کی علم دوستی اور انسانی عظمت کی ایک ٹھوس دلیل ہے۔ ادارۂ یادگار قابل حیدر آباد نے قابل اجمیری کے دو شعری مجموعے "خون رگ جاں" اور "دیدۂ بیدار" ان کی بیگم کے مالی تعاون سے شایع کیے۔

کافی دیر تک وہ قابل صاحب کی باتوں کو دہراتی رہیں۔ اور میں سوچ رہا تھا۔ کون کہتا ہے کہ پیسہ ہی دنیا میں سب کچھ ہے۔ آج بھی اس ترقی یافتہ دنیا میں بے انتہا لوگ ایسے موجود ہیں جو فنکاروں کے لیے بڑی سے بڑی قربانیاں بھی دیتے ہیں اور ہمیشہ ان کے لیے روتے رہتے ہیں۔

جب میں ان سے مل کر لوٹ رہا تھا تب میرا دل چاہا کہ میں ان سے پوچھوں۔ "مادام! آپ نے سب کچھ جانتے ہوئے اتنی بڑی قربانی کیوں دی۔ اور آج بھی آپ رو رہی ہیں۔ جب کہ آجکل ہی کی لڑکیاں گاڑیوں' کوٹھیوں اور عیش و عشرت کے خواب دیکھتی ہیں۔ پھر آپ نے ایسا کیوں کیا۔۔؟ آپ نے کیوں نہ کسی مالدار شہزادے کو اپنا لیا۔" لیکن۔۔ لیکن۔۔ وہ ماضی کی وادیوں میں گم تھیں۔ اور میں باوجود چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ پوچھ سکا۔ اور خاموشی سے سوچتا ہوا واپس لوٹ آیا۔

(بہ شکریہ جنگ ۱۹۶۷ء)

شہزاد احمد

کلیات قابل کا ابتدائیہ)

۱۹۹۲ء

اسے "کلیات قابل" کہنا مناسب نہیں۔ اس کتاب میں قابل صاحب کے "دونوں" مطبوعہ مجموعوں کا کلام بھی پورا نہیں ہے۔(مرتب)

(اقتباسات)

قابل اجمیری ان
شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ جنہوں نے جدید غزل کی صورت گری میں حصّہ لیا تھا، اگرچہ ان کے ہاں روایت کا عنصر بہت مضبوط ہے اور انہوں نے نہ تو غزل کے لئے نا آشنا لفظیات کا استعمال کیا اور نہ ہی ایسے مضامین تلاش کرنے کی کوشش کی جنہیں خالص جدیدیت کے زمرے میں ڈالا جا سکے، مگر جو تبدیلی اس نسل نے

اپنے اندر محسوس کی تھی اس کا اظہار قابل اجمیری کے ہاں بھی اس طرح ہوا کہ لوگوں نے نہ صرف اسے محسوس کیا بلکہ ان کی شاعری سے انکار بھی کیا، اس سے پہلے کہ میں اس حوالے کو مکمل کروں۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہر ادبی حلقے میں خواہ وہ حلقہ ارباب ذوق ہو یا ترقی پسند تحریک، غزل کو روایتی غزل ہی کی صورت میں دیکھنے کوشش کی گئی، جب جدید غزل کو ان حلقوں میں پہلی بار پیش کیا گیا تو یہ سوال بہرحال اٹھایا گیا کہ غزل کی ہیئت میں یہ کوئی مختلف چیز ہے۔

محسن بھوپالی لکھتے ہیں: "مجھے وہ تنقیدی نشست بھی یاد ہے جہاں شہر کے منتخب شعرا اور ادیب جمع تھے، قابل صاحب نے اپنی غزل تنقید کے لئے پیش کی اور ایک شاعر اور ان کے چند ساتھیوں نے تابڑ توڑ حملے کر دیئے"۔

محسن بھوپالی ہی کے حوالے سے دوسرا واقعہ یہ ہے" مجھے اچھی طرح یاد ہے، مشاعرہ شباب پر تھا اچانک صدر مشاعرہ نے مائیک سنبھالا اور ایک رندھی ہوئی آواز نے فضا میں سوگواری کی سی کیفیت پیدا کر دی، حضرات میری صدارت پر میرے ایک ہم عصر شاعر کو اعتراض ہے، اس لئے منتظمین کے کہنے پر میں صدارت سے دست بردار ہوتا ہوں اور اب میں گھر جا رہا ہوں . . . ."

ایسے ہی حوالے قابل اجمیری کے بعض دوسرے نقادوں نے بھی دیئے ہیں اور اس صورت حال کو ادبی سیاست سے تعبیر کیا ہے، یہ سارا مواد اس قدر کم ہے کہ کوئی حتمی رائے قائم کرنا تو شاید ممکن نہ ہو مگر یہ ضرور سمجھا جاسکتا ہے کہ اس نامقبولیت کے پس منظر میں ایک تو یہ بات ہوگی کہ قابل اجمیری کی شاعری کے سامنے اس کے مخالفین کا چراغ نہ جلتا ہوگا مگر دوسری وجہ شاعری کے سلسلے میں ان کا بدلتا ہوا رویہ بھی ہوسکتا ہے۔ جس طرح ریل کے ڈبے میں نئے مسافر کو قبول نہیں کیا جاتا اسی طرح روایت پسند حلقے شاعری کے مواد میں کسی تبدیلی کو بھی قبول نہیں کرتے۔

○

قابل اجمیری کا نام عبدالرحیم تھا، اجمیر شریف میں ۱۹۳۱ء میں پیدا ہوئے قابل تخلص رکھا اور تپ دق کے مرض میں مبتلا ہوئے —— قابل اجمیری کی بیگم کا نام نرگس ہے۔ قابل کے دو شعری مجموعے، رگ جاں اور دیدۂ بیدار، ان کی بیگم کے مالی تعاون سے شائع کئے گئے۔

یہ حیرت کی بات ہے کہ ان کی موت کے بعد بھی کوئی ادارہ یا کوئی فرد ایسا آگے نہ آیا جو ان کے شعری مجموعے ہی شائع کروا سکتا، یہ بوجھ بھی اس عورت کے کاندھے پر ڈالا گیا جو پہلے ہی قابل کے لئے بہت سی قربانیاں کرچکی تھی۔

(پس منظر)

شہزاد احمد اگر حیدر آباد کے ادبی ماحول سے واقف ہوتے تو (بقول سید کاظم رضا) محسن بھوپالی کے "بدنیتی سے تحریر کئے ہوئے مضمون" کی روشنی میں قابل صاحب کی شاعری کا جائزہ نہ لیتے قابل صاحب اپنی نوعمری اور محدود علم و تجربہ کے باوجود اس دور میں بھی بہت مقبول شاعر تھے۔ ان کی شاعری سے کسی

نے انکار نہیں کیا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مقالہ "شاعر سندھ" (مطبوعہ "مشرب" کراچی۔ مئی ۵۵ء) کے حوالے سے "۵۴ء ہی میں حکومت سندھ نے انہیں "شاعر سندھ" کا خطاب دے دیا تھا اور ان کی ادبی خدمات کے صلے میں کئی ہزار روپے سالانہ کا وظیفہ بھی منظور کیا تھا" مگر غالباً حکومت بدل جانے کے سبب یہ فیصلہ کاغذی کارروائی سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ مزید تفصیلات کے لئے پروفیسر ارشد رضا کا مضمون (مطبوعہ "قابل کے سو شعر" مورخہ ۱۲ مارچ ۵۸ء) دیکھا جا سکتا ہے۔ افسوس کے "قابل نمبروں" میں یہ مضمون ہمیشہ "ادھورا" چھاپا گیا۔ حمایت علی شاعر نے اپنے جوابی مضمون "آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے" میں کچھ تفصیلات فراہم کردی ہیں۔ (اسی کتاب میں شامل ہیں) قابل صاحب کی زندگی میں مختلف اہل قلم نے ان کی شاعری پر مضامین لکھے تھے۔ مذکورہ بالا مضامین کے علاوہ حضرت جگر مراد آبادی کے تاثرات (قابل کے سو شعر۔ مطبوعہ ۵۸ء) ڈاکٹر عبادت بریلوی کا مقالہ "جوہر قابل" (مطبوعہ۔ ۷ مئی ۵۸ء) اختر انصاری اکبر آبادی کا مضمون "روح انتخاب" (مطبوعہ مشرب ستمبر ۵۵ء) اور سید فیضی کے رشحات قلم (مطبوعہ۔ "افکار" جون ۶۰ء) اور "قابل کے سو شعر" پر وہ تمام تبصرے جو مختلف ادبی رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے، شاہد ہیں کہ اہل ادب نے ہمیشہ انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ قابل صاحب یقیناً اس "جدید غزل" کے شاعر نہیں تھے جو روایت سے انحراف کر کے وجود میں آئی اور اپنے کھردرے پن کے سبب آج بھی غیر مقبول ہے۔

وہ ایک رجائیت پسند شاعر تھے۔ اسلوب کے اعتبار سے جگر صاحب سے متاثر تھے۔ خیالات کے لحاظ سے مجاز و مجروح کے بھی قریب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سب کو عزیز تھے۔

کاش محسن صاحب حمایت صاحب کی مخالفت میں ایسی تحریروں سے گریز کرتے اور ساجد امجد جیسے غیر متعلق اور حیدر آباد کے ادبی ماحول سے ناواقف شخص کی (قابل اجمیری سے) محبت و عقیدت کو آلہ کار بنا کر ان کی "افسانوی سرگزشت" (مطبوعہ "سرگزشت ڈائجسٹ" اکتوبر ۹۲ء پھر طبع دوم چھ اقساط میں "قومی اخبار" میگزین۔ ۵ مارچ تا ۱۹ اپریل ۹۳ء) کی آڑ میں خود کو "نیک نام" اور دوسرے اہل قلم کو "بدنام" کرنے کی کوششوں کے مرتکب نہ ہوتے۔

ہاں---- بیگم قابل البتہ واقعی قابل احترام خاتون ہیں کہ انہوں نے اپنے مالی تعاون سے قابل صاحب کے دونوں مجموعے شائع کئے اور "مجلس یادگار قابل" کی معرفت (بقول سید ارتضاء عزمی) کچھ لوگوں کو "نیک نامی کے تمغے" عطا کردیئے۔ (مرتب)

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو

(غالب)

حمایت علی شاعر

شکستِ شب

(یہ مضمون "شکست شب" کی تقریب رونمائی (نومبر ۶۱ء) کے لئے لکھا گیا تھا)

(مطبوعہ "فنون" (لاہور) شمارہ اکتوبر نومبر ۶۴ء)

شکست شب' محسن بھوپالی کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے۔ جس میں ۴۸ء سے اب تک کہی ہوئی تمام نظموں' غزلوں اور قطعات کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

محسن بھوپالی اردو کے ان شاعروں میں سے ایک ہیں جو پاکستان کے قیام کے بعد نمایاں ہوئے۔ ان کا کلام ملک کے بیشتر ادبی جرائد میں چھپتا رہا ہے اور کافی ذوق و شوق سے پڑھا جاتا رہا ہے۔ ان کی شاعری کا موضوع ہرچند زندگی کے خارجی حقائق سے متعین ہے لیکن ان کی فنکارانہ صلاحیتوں نے اسے ایک وقتی تخلیق ہونے سے بچا لیا ہے۔ محسن نے ہر بات محسوس کر کے بیان کی ہے' دوسرے الفاظ میں ان کا کلام محض خیالات کی منظوم ترتیب سے عبارت نہیں ہے بلکہ خیال و فکر کو دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ کرنے کی ایک شاعرانہ کوشش ہے۔ "شکست شب" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ محسن فطرتاً" شاعر مزاج واقع ہوئے ہیں اور انہیں خارجی حقیقتوں کو داخلیت کے رنگ میں پیش کرنے کا فن بھی خوب آتا ہے۔ زندگی سے متعلق ان کا ایک شعر ہے۔

زیست ہمسائے سے مانگا ہوا زیور تو نہیں
ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کھو جانے کا

اس شعر میں ایک خارجی حقیقت کو داخلی حقیقت کے آئینے میں دکھایا گیا ہے اور اپنے لفظی دروبست کے ساتھ اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ یہ انفرادی تجربہ ایک جماعتی تجربہ بن گیا ہے۔ ایک اچھے شاعر کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ ذاتی کیفیات کے اظہار میں تنگ دامن نہ رہے۔ اس دامن میں اتنی وسعت ضرور ہونی چاہئے کہ ماورائے ذات بھی اس کے سائے میں سمٹ آئے۔ یہی بات آگے بڑھ کر فنکار کی

شخصیت کا تعین کرتی ہے۔

محسن کی شاعری کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے، لیکن ان کی دس بارہ سال کی مشق سخن سے اتنا ضرور واضح ہو گیا ہے کہ وہ اپنے اندر اچھے شاعر کی تمام تر صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ ان کے موجودہ کلام میں ایسے اشعار کافی تعداد میں ملتے ہیں جو ان کی بنتی ہوئی شخصیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ چند شعر دیکھیے:

دل کے زخموں پہ بھی پھولوں کا گماں ہوتا ہے
یاد آئی ہے تری موج بہاراں کی طرح

میرے سکوت لب پہ بھی الزام آ گئے
میری طرح چمن میں کوئی بے زباں نہ ہو

صرف انداز بیان، طرز ادا کی بات ہے
داستان زندگی واضح بھی ہے مبہم بھی ہے

نہ جانے کتنے حقائق کا ماحصل ہوں گے
زمانہ جن کو سمجھتا رہا ہے افسانے

یوں بھی آتی ہے کبھی دل کے دھڑکنے کی صدا
دیر کا بچھڑا ہوا دوست پکارے جیسے

ان اشعار میں غم جاناں بھی ہے اور غم دوراں بھی، اور ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ انداز بیان، نہ بہت زیادہ روایتی ہے نہ بہت ہی جدید۔ ٹی ایس ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ روایت سے کم سے کم انحراف ہی بڑی شاعری کو جنم دے سکتا ہے اور جب اس خیال کی روشنی میں ہم مختلف شاعروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

آج اردو ادب میں جدیدیت کی رو جس انداز میں ابھری ہے۔ اس کی بنیاد روایت سے کلیتاً "انحراف پر مبنی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بیشتر جدید شعراء کا کلام اس ہمہ گیر

تاثر اور مقبولیت سے محروم ہے جو قدیم اور جدید کا خوشگوار امتزاج رکھنے والے فنکاروں کو نصیب ہوا ہے۔

محسن کے انداز بیان میں یہ نیا پن ایک روایتی التزام کے ساتھ آیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم "مرگ مہتاب" کا یہ بند ملاحظہ کیجئے۔

دامن شب میں نہاں نور سحر ہے کہ نہیں
اپنے انجام پہ خود اپنی نظر ہے کہ نہیں
اے دمکتے ہوئے مہتاب خبر ہے کہ نہیں
کوئی خورشید دبے پاؤں چلا آتا ہے

اس نظم میں محسن نے سحر کی نوید دی ہے جو ظاہر ہے کہ کوئی نیا موضوع نہیں ہے لیکن اس کے انداز بیان نے اسے کسی حد تک نیا بنا دیا ہے۔ اس نظم کی تشکیل سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ شاعر محاکات کی تصویر کشی کا نہ صرف شعور رکھتا ہے بلکہ اس کی تمثیلی ہیئت سے بھی واقف ہے۔ اس نظم میں محسن نے ایک ڈرامائی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

محسن کی شاعری کا مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو ایک بات نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی اکثر نظموں کا خمیر اپنے گرد و پیش کے حالات سے اٹھتا ہے۔ یہ بات اچھی ہے لیکن شاعری بقول غالب۔

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

کے مصداق کچھ اور بلندیاں، کچھ اور وسعتیں چاہتی ہے۔ علامہ اقبال نے عظیم انسان کا نظریہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

عظیم فنکار بھی اپنی دنیا کا ایک عظیم انسان ہوتا ہے۔ وہ بھی اپنے فن کا مومن ہوتا ہے اور اس کی پہچان یہی ہے کہ اس میں آفاق کی وسعتیں گم ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے محسن کو مزید تجربوں سے گزرنا پڑے گا، حیات و کائنات کے

بارے میں مزید علم حاصل کرنا ہوگا، بغیر علم اور تجربے کے بڑی شاعری ممکن نہیں۔ محسن بھوپالی کی موجودہ طرز روش سے اندازہ ہوتا ہے کہ آئندہ اس سے اچھے شعر کہیں گے اس سے اچھی شاعری کریں گے۔

زیر تبصرہ کتاب میں جہاں اچھے شعر اور اچھی نظمیں ملتی ہیں وہیں زبان اور بیان کے اعتبار سے کچھ کمزور چیزیں بھی نظر سے گزرتی ہیں۔ بعض الفاظ کا تلفظ ان کے ذہن میں صحیح نہ ہونے کی وجہ سے کچھ اشعار وزن سے خارج بھی ہوگئے ہیں اور بعض مقامات پر لفظ کو صحیح نشست نہ ملنے یا بعض لفظوں کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے ان کا استعمال غلط ہوگیا ہے۔ مثلاً کچھ اشعار انہوں نے یوں لکھ دیے ہیں۔

بے وجہ مسکرانا کیا معنی
بے سبب اشک بھی نکلتے ہیں

ان حقائق کو سامنے رکھ کر
اپنا ہر لائحہ عمل بدلو

یہ اشعار "بے وجہ" اور "لائحہ عمل" کے غلط تلفظ کی بنا پر وزن سے خارج ہوگئے ہیں۔ اسی طرح۔

آخر اس دشت بلاخیز میں کب تک بھٹکے
دیدۂ شوق غزالوں کی طرح آوارہ

اس شعر میں "دیدۂ شوق" کا بھٹکنا مناسب نہیں ہے۔ اس کے بجائے "نگہ شوق" ہوتا تو بات بن جاتی۔

"شکست شب" میں ایسی خامیاں اکثر جگہ ملتی ہیں جو یقین ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں دور کردی جائیں گی۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب قابل مطالعہ ہے۔

محسن صاحب نے ریڈیو پاکستان حیدر آباد سے اس مضمون کی نقل حاصل کر کے "تنقیدی حصہ" نکال دیا اور ماہنامہ "سات رنگ" (کراچی) شمارہ نومبر ۶۲ء میں (اپنی طرف سے کچھ جملے بڑھا کر) چھپوا دیا۔ حمایت صاحب نے سرزنش کی تو وہ باضابطہ مخالفت پر اتر آئے --- ملاحظہ ہو صفحہ (۴۷) (مرتب)

اس مضمون سے بنایا ہوا فلیپ جو حمایت صاحب کے نام کے بغیر "جستہ جستہ" (۶۹ء) اور "کلیات" (۹۲ء) میں "فنون" کے حوالے سے شائع کیا گیا ہے۔ (مرتب)

● —— محسن نے ہر بات محسوس کر کے بیان کی ہے۔ دوسرے الفاظ میں۔ ان کا کلام محض خیالات کی منظوم ترتیب سے عبارت نہیں بلکہ خیال و فکر کو دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ کرنے کی ایک شاعرانہ کوشش ہے۔ "شکستِ شب" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ محسن فطرتاً شاعر مزاج واقع ہوئے ہیں اور انہیں خارجی حقیقتوں کو داخلیت کے رنگ میں پیش کرنے کا فن بھی خوب آتا ہے۔

فنون، لاہور، شمارہ ۶-۷، نومبر ۶۴ء

"نظمانے" کے سرورق پر مورخہ ۲۴ر نومبر ۷۵ء پر حمایت علی شاعر سے لکھوایا ہوا فلیپ (مرتب)

دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح اُردو میں بھی نظم کے کئی پیرایۂ اظہار ہیں۔ معروف و مخصوص شعری اصناف سے قطعِ نظر منظوم تمثیلیں بھی لکھی گئی ہیں اور منظوم افسانے بھی۔ لیکن ان کا کوئی منفرد نام نہیں رکھا گیا۔ اس لئے کہ بنیادی طور پر یہ تخلیقات تمثیل اور افسانے ہی کی منظوم تشکیل تھیں۔

محسن نے دو مختلف اصناف — افسانے اور نظم کے امتزاج سے ایک نئی شعری اکائی متعین کی ہے اور اس کا نام "نظمانہ" رکھا ہے۔ محسن کے "نظمانے" "منظوم افسانے" نہیں ہیں بلکہ "افسانوی نظمیں" ہیں۔ یوں اصنافِ سخن میں (اس نئی وحدت سے) ایک اہم کا اضافہ ہوا ہے اور ایک بے ترتیب شعری تجربے کو ایک مخصوص ہیئت مل گئی ہے۔

محسن کے افسانہ طراز ذہن نے اس ہیئت کو چیخوف، موپساں، او ہنری اور سعادت حسن منٹو (سیہ حاشیے) کی تکنیک کی روشنی میں اجالا اور اس آئینے میں اپنے عہد کی چہرہ نمائی کی ہے۔

ہیئت میں بے مقصد جدت پسندی اور روایت شکنی کے اس "جنون" میں محسن کا یہ شعوری عمل نہ صرف دو مختلف اصنافِ ادب کی صحت مند روایات کا امین ہے بلکہ اپنی شعری تشکیل کے ضمن میں ایک قابلِ اعتبار تجربہ بھی۔

حمایت علی شاعر

شاعر ایسی چوٹ کھائی ہے بہ فیضِ دوستاں
دوستی کے نام ہی سے اب لرز جاتا ہے دل

(حمایت علی شاعر)

۱۹۶۲ء کا بہترین گیتؔ

(کسی چمن میں رہو تم بہار بن کے رہو)

حمایت علی شاعر سے ایک گفتگو

(مطبوعہ ہفت روزہ "نگار" ۱۱ اگست ۶۳ء)

بشیر نیاز: شاعر صاحب۔ آیئے آپ سے ۱۹۶۲ء کے بہترین گیت کے سلسلے میں کچھ باتیں کریں۔ میرے خیال میں اس گیت کی جو بات پہلی نظر میں متوجہ کرتی ہے اس گیت کا بنیادی خیال ہے۔ سب سے پہلے آپ یہ بتائیں کہ اس گیت کے محرکات کیا تھے؟

شاعر: فلم آنچل میں اگر میری نظم "ان کہی" کا کچھ حصہ نہ لیا جاتا تو میں یہ گیت نہ لکھتا۔ اس فلم کا مرکزی کردار شروع میں میری نظم "ان کہی" پڑھتا ہے بعد میں اس کی محبوبہ چلی جاتی ہے اس سچوایشن کے لئے گیت لکھنا تھا ایسے حالات میں جیسا کہ فلم کا دستور ہے اور رسم ہے 'کچھ زمانہ کا گلہ ہوتا ہے' کچھ قسمت کا شکوہ اور کچھ محبوبہ کی بے وفائی کا ذکر۔۔۔ میں نے فلم ساز سے کہا میں ہیرو سے اس کی محبوبہ کو کوسنے نہیں دلواؤں گا اور نہ ابلے ہوئے جذبات کا اظہار کروں گا۔ اگر میں ہوتا تو چپ ہیرو نہ بنتا اسے دعا دے کر رخصت کرتا۔ ہیرو کو شاعر بنایا گیا ہے تو اس کا وہ مقام ہونا چاہیئے جو اس کے ظرف کے مطابق ہو۔ یہ بنیادی جذبہ تھا جس کے تحت یہ گیت لکھا گیا۔ سطحی جذبات کا اظہار کیا جا سکتا تھا مگر یہ تو آرٹسٹ کے ظرف کی توہین ہوتی۔ ایک آرٹسٹ یہی چاہے گا کہ اس کی محبوبہ خوش ہے تو وہ بھی خوش ہے۔ اسے اپنا غم دفن کر دینا چاہیئے۔ اس نظم کا ایک

ؔ تیکنک کے اعتبار سے "یہ گیت نہیں"، نظم ہے' گیت محض فلمی اصطلاح میں کہا گیا ہے۔

شعر جو دوہے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے (حالانکہ تیکنک کے اعتبار سے دوہا نہیں) اور ریکارڈ میں شامل نہیں ہے اس سے اس نظم کا بنیادی خیال اور واضح ہو جاتا ہے۔

ہمیں تمہاری محبت نہ مل سکی لیکن
خوشی یہ ہے کہ تمہیں تم سا مل گیا کوئی

بشیر نیازؔ: شاعر صاحب! "تمہیں تم سا مل گیا کوئی" سے رقابت کے جذبے کی نفی ہوتی ہے۔ کیا آپ رقابت پر یقین نہیں رکھتے اور محبت میں شراکت کے قائل ہیں؟

شاعر: میں رقابت کو ایک اتھلا جذبہ سمجھتا ہوں۔ رقابت انسان کے سطحی جذبات سے تعلق رکھتی ہے۔ فیض کی وہ نظم۔

آ، کہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا ہے

جس میں اس نے رقیب کو گلے سے لگالیا ہے، محبت کے حقیقی آداب کی آئینہ دار ہے اور ہمیں دوسرے کے جذبات کا احترام کرنا سکھاتی ہے۔ رقیب کو بھی محبت کرنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے، جتنا ہمیں ہے۔ نظم "رقیب سے" فیض کی شاعری کا بہت بڑا موڑ ہے اور فیض صاحب نے یہ روشنی غلام بھیک نیرنگ کے اس خیال سے لی ہے۔

تحسین حسن یار میں میرا ہے ہم خیال
نیرنگ کیوں نہ ہو مجھے الفت رقیب سے

مگر اسے اپنے شاعرانہ رچاؤ اور اپنے مزاج اور ڈکشن کے تحت ادا کیا ہے۔ میں نے ایسی ہی بات کہی ہے۔ اور اپنے لئے سب سے بڑا سرمایہ یہ منتخب کیا ہے کہ۔

تمہارا غم ہے سلامت تو پھر ہمیں کیا غم

بشیر نیاز: حمایت صاحب کیا اپنی متاع عزیز دوسروں کے سپرد کر کے "تمہارا غم ہے سلامت" پہ بسر اوقات کرنا شاعر کی کمزور مردانہ شخصیت کا اظہار نہیں؟

شاعر: محبت جسمانی حدود کی پابند نہیں۔ محبت اگر جسمانی حدود میں حاصل نہیں ہوتی تو ہمیں اس کا غم نہیں کرنا چاہئے۔

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اور یہ راحت "غم کی راحت" ہے اور یہ تہذیب ہمیں ورثے میں ملی ہے۔

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

یہ بات ایک اور انداز سے موجودہ نسل کے نوجوان شاعر ناصر کاظمی نے کہی ہے۔

اے بے.گھنی! گواہ رہنا
میں ہاتھ نہیں اسے لگایا

ادب سے فلم کی طرف جب فنکار آئیں گے تو عشق و خرد کی وہ ساری بصیرت ساتھ لائیں گے جو انہیں بڑے فنکاروں نے دی۔

بشیر نیاز: شاعر صاحب اس مضمون کے تعلق سے مجھے حسرت موہانی کا ایک شعر یاد آتا ہے۔

دیکھنا اور انہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوہ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

اگر "دور بیٹھنے" "ہاتھ نہ لگانے" اور "دور سے دیکھنے" کو بڑے فنکار کی شان یا اس کی شخصیت کا حصہ سمجھ لیں تو کیا ہر بڑے فنکار کے کردار میں مجہولیت ہوتی ہے۔

شاعر: یہ مجہولیت نہیں۔ قوت برداشت اور ضبط کی بات ہے اور ادب اور فن کا مسئلہ ضبط کا ہے۔ ترقی پسند شاعری اور وہ شاعری جو سطحی جذبات کا شکار ہوئی اور ختم ہوگئی اس کی وجہ یہ تھی کہ شاعری کرنے والوں نے اپنے عہد کے غم کو سینے میں اتار کر دل کی دھڑکن نہیں بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شاعری وقت کے ساتھ قدر کھو بیٹھی۔ اس کے برعکس جن فنکاروں نے اس کا لحاظ کیا ان کا شعر موضوعاتی اور مسائلی ہونے کے باوجود آج بھی زندہ اور موثر ہے۔

بشیر نیاز: لیکن عوام جنہیں میر یا حسرت موہانی کا تہذیبی اور ثقافتی مزاج ورثے میں نہیں ملا۔ وہ لوگ جو محبت کرتے ہیں اور محبت میں ناکامی پر محبوبہ کو قتل کردیتے ہیں یا خود کو قتل کر بیٹھتے ہیں۔ انہوں نے آپ کی نظم کے جذبات کو پسند کیا تو اس کی نفسیاتی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

شاعر: ہر تہذیب کی کچھ سطحیں ہوتی ہیں اگر ہم نچلی سطح کی بات کریں تو ہمیں ایسی مثالیں مل جائیں گی جہاں کوئی عاشق اپنی محبوبہ کو قتل کردیتا ہے۔ لیکن وہ سطح بھی ہے کہ عاشق کو جہاں محبوبہ کی "خاطر" عزیز ہوتی ہے وہاں اس کی مجبوریاں بھی۔ اس سطح تک آکر وہ ہر غم حتیٰ کہ موت کو اپنے لئے قبول کرلیتا ہے اور زندگی دوسرے کے لئے۔

اگر عاشق یا محبت کرنے والے کی عزت نفس پر حملہ نہ کیا گیا ہو تو اسے بہرحال ہر غم کو برداشت کرلینا چاہئے۔ اس نظم میں چونکہ ایک طرح سے ایثار اور تہذیب کی بلند سطح کی نمائندگی کی گئی ہے اور عاشق ایثار کی ایک منزل سے گزرا ہے اس لئے عوام نے اسے قبول کرلیا اور ایثار اور عوام میرے نزدیک ایک ہی معنی کے دو لفظ ہیں اور پوری تاریخ شاہد ہے کہ عوام ایثار کرتے آئے ہیں۔

(فلم آنچل (کہانی) ابراہیم جلیس (ہدایات) الحامد (گلوکار) احمد رشدی (موسیقار) خلیل احمد)

سلیم صدیقی (کراچی)

(ایک خط - ایک بحث)

(مطبوعہ "نگار" ۲۵ اگست ۶۳ء)

حمایت علی شاعر صاحب نے ہفت روزہ "نگار" میں مطبوعہ ایک گفتگو میں کہا تھا کہ فیض صاحب نے اپنی مشہور نظم "رقیب" میں غلام بھیک نیرنگ سے روشنی پائی ہے۔ اب کہ نگار کے ایک قاری سلیم صدیقی نے نشاندہی کی ہے کہ خود حمایت علی شاعر اپنے ایوارڈ یافتہ گیت "کسی چمن میں رہو تم" میں حسرت سے متاثر ہیں۔

نگار کے موجودہ شمارے میں یہ خط شائع کر کے ہم ایک ادبی بحث چھیڑتے ہیں--- کیا شاعروں میں دوسروں سے روشنی پانا عیب ہے؟---- اس موضوع پر ہم حمایت علی شاعر صاحب اور دیگر شعر و ادب کا ذوق رکھنے والے اصحاب کو دعوت فکر دیتے ہیں۔

اس موضوع پر لکھے ہوئے مضامین کو ادارہ شکریے کے ساتھ شائع کرے گا۔ (ادارہ)

مکرمی تسلیم!

ہفتہ روزہ "نگار" میں پابندی سے پڑھتا ہوں اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں فلم سے متعلق معلومات کے علاوہ ادبی مواد بھی مل جاتا ہے' اور یہ اس کی خوبی ہے' اس سلسلے میں "نگار" کے گزشتہ شمارے میں "حمایت علی شاعر سے ایک گفتگو" پڑھ کر مسرت ہوئی لیکن اس کا یہ ایک نکتہ محل نظر ہے۔ حمایت علی شاعر نے یہ کہا کہ فیض نے اپنی نظم "رقیب" کا مرکزی خیال غلام بھیک نیرنگ کے اس خیال سے لیا ہے۔

تحسین حسن یار میں' میرا ہے ہم خیال
نیرنگ کیوں نہ ہو مجھے الفت رقیب سے

شاعر کی اس بات کی روشنی میں اگر خود ان کے ایوارڈ یافتہ اور فلم "آنچل" کے مشہور گیت "کسی چمن میں رہو تم بہار بن کے رہو" کو لیا جائے تو کیا اس کا مرکزی تصور بھی مستعار نہیں؟

میرا خیال ہے کہ حمایت علی شاعر صاحب کے اس گیت کا مرکزی تصور حسرت موہانی کے ان اشعار سے متاثر ہے۔

بنے وہ رونق محفل جس انجمن میں رہے
رہے بہار چمن ہو کے جس چمن میں رہے
زہے نصیب جو ہو میرے حال کو بھی نصیب
وہ ابتری جو تری زلف پر شکن میں رہے

مجھے حیرت ہے کہ حمایت علی شاعر صاحب نے جہاں فیض صاحب کی نظم کے مرکزی خیال کا سراغ لگایا ہے وہاں اس بات کا اعتراف نہیں کیا کہ ان کا گیت کس سے متاثر ہے؟

محترمی ایڈیٹر صاحب ---- یہ چند سطور ہفت روزہ "نگار" کے کسی قریبی شمارے میں شائع فرما دیجئے۔ یہ سطور لکھنے کا مقصد کوئی پرخاش نہیں، صرف ایک حقیقت کو منظر عام پر لانا مقصود تھا۔

حمایت علی شاعر (ماخوذ۔ شخص و عکس)

سلیم کے جواب میں

میرے ایوارڈ یافتہ نغمے "کسی چمن میں رہو تم بہارین کے رہو" کے بارے میں میرا ایک انٹرویو ۱۱ اگست ۶۳ء کو نگار میں شائع ہوا تھا اس کے بعد میرے خلاف اور موافقت میں مسلسل تین ماہ تک مختلف حضرات کے مراسلات چھپتے رہے، ان میں بعض نے اپنے اصلی نام کو پس پردہ بھی رکھا تھا۔

"نگار" کے تازہ شمارے میں میری "فلمی نظم" کے تعلق سے آپ نے جو "ادبی" بحث چھیڑی ہے وہ یقیناً فکر افروز نتائج کی حامل ہو گی میں بھی اس سلسلے میں اپنے خیالات کا تفصیلی اظہار کروں گا۔ لیکن فی الحال "سلیم صدیقی" صاحب کا جواب قرض ہے، وہ چکانا چاہوں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے میں یہ غلط فہمی دور کر دوں کہ فیض صاحب کی نظم "رقیب سے" کے بارے میں جو بات میں نے "نگار" میں مطبوعہ اپنے انٹرویو میں کہی تھی، اس میں قطعی یہ جذبہ شامل نہیں تھا کہ خدانخواستہ میں فیض صاحب پر کوئی الزام عائد کر رہا ہوں، میرے دل میں ان کا احترام بہت زیادہ ہے۔ اور نہ صرف ان کا بلکہ اپنے ہر پیشرو کی عزت میرے دل میں ہے، سلیم صاحب مجھے نئی نسل کے اُن شاعروں میں نہ سمجھ لیں جو حفظِ مراتب کو نظر انداز کیے بیٹھے ہیں اور مغرب کی ANGRY YOUNG MEN —— والی تحریک سے خواہ مخواہ اپنے آپ کو وابستہ کرنے کی کوشش میں جامے سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ میرا مزاج مشرقی ہے اور میں اپنی تہذیب پر نازاں ہوں۔

فیض صاحب کی نظم کا ذکر اسی تہذیبی ورثے کے ضمن میں آیا تھا۔ سلیم صاحب نے شاید میرے الفاظ پر غور نہیں کیا۔

ے کیوں کہ مجھے اندازہ ہے کہ ۔ کون معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

میر غلام بھیک نیرنگ، فیض اور ناصر کاظمی وغیرہ کا نام لیتے ہوئے ایک طرح سے میں نے اسی تسلسل کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جو تہذیبی ورثے کے طور پر میرے حصے میں آیا اور میں نے بھی اسی طرح دعا دے کر خندہ پیشانی کے ساتھ "اپنے" محبوب کو رخصت کر دیا جس خندہ پیشانی سے فیض صاحب نے "اپنے" رقیب کو گلے لگا لیا۔ یہ عشق کی اعلیٰ ظرفی ہے اور اعلیٰ ظرفی ہمیں اپنے بزرگوں سے ملی ہے۔ غلام بھیک نیرنگ فیض کے بزرگ ہیں اور فیض میرے۔ اسی طرح حسرت موہانی اور دوسرے اساتذہ کا نام بھی آ سکتا ہے۔

لیکن سلیم صاحب نے مولانا حسرت کے اشعار کا حوالہ دیتے ہوئے جو بات مجھ سے کہنا چاہی ہے اس کا لہجہ کچھ اور ہے۔ کاش وہ میرے جملوں کو ٹھنڈے دل سے پڑھتے۔

انہوں نے جو مسئلہ اٹھایا ہے وہ یقیناً ایک ادبی بحث کا موضوع بن سکتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ادارہ "نگار" نے حسب روایت ذاتیات سے بلند ہو کر اس مسئلہ پر سوچا اور سنجیدہ گفتگو کی ایک راہ نکالی۔ یہ مسئلہ ہر ادیب و شاعر کا مسئلہ ہے، کیونکہ "طرح" میں شعر کہنا، الفاظ کی مطابقت، خیال کا توارد یا استفادہ اور لب و لہجہ سے متعلق ایسی بہت سی باتیں ہیں جو ایک فنکار کو دوسرے فنکار کے قریب لے آتی ہیں۔ شاید ہی کوئی ادیب یا شاعر اس کی زد سے بچ سکا ہو۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری شاعری میں بعض الفاظ اور استعارے اتنے عام ہیں کہ ان سے دامن بچایا ہی نہیں جا سکتا۔ چمن کے ساتھ بہار کا لفظ خود بخود ذہن میں آ جاتا ہے۔ اسی طرح اور بھی لازمات اور مترادفات ہیں جو ہماری شعری لغت کا بنیادی اور مشترکہ سرمایہ ہیں۔ سلیم صاحب نے حسرت موہانی کی جس غزل کا حوالہ دیا ہے اس کا ایک مصرع یہ ہے۔

ع   رہے بہار چمن ہو کے جس چمن میں رہے

اور اسی "زمین" میں مجروح سلطان پوری کی ایک "ادبی" غزل کا مصرع ہے۔

ع   تو اے بہار گریزاں، کسی چمن میں رہے

---

۵ تحسین حسن یار میں میرا ہے ہم خیال   نیرنگ کیوں نہ ہو مجھے الفت رقیب سے

یا پھر اختر شیرانی کا مصرع

ع تم اپنے گھر کے چمن میں بہار بن کے رہو

اور میرا مصرع

ع کسی چمن میں رہو تم بہار بن کے رہو

اسی طرح اگر مزید تلاش کی گئی تو اور بہت سے شعرا کے پاس اس قسم کی مماثلتیں مل جائیں گی۔ یہی حال خیال کی مطابقت کا ہے۔ میرؔ و مصحفیؔ اور مصحفی و حسرت موہانی کو ایک ساتھ پڑھیے۔ حافظؔ، فیضؔ اور سوداؔ کے دیوان قریب قریب رکھ کر مطالعہ کیجیے۔ نظیر اکبرآبادی انیس اور خیام و نظیری کے ساتھ جوش کو پڑھیے۔ نطشے، برگساں، ہیگل، مولانا رومی اور امام غزالی کے بعد علامہ اقبال کا مطالعہ کیجیے۔ اور بیدلؔ اور ناسخؔ کے بعد غالب کو پڑھیے اسی طرح افسانوی ادب میں چیخوف، موپساں، اور او ہنری کے ساتھ سعادت حسن منٹو کا مطالعہ کیجیے۔ میکسم گورکی کے ساتھ کرشن چندر اور کرشن چندر کے ساتھ ابراہیم جلیس اور اے حمید کو پڑھ ڈالیے۔ تنقید میں کاڈویل کے ساتھ ممتاز حسین کو پڑھیے اور فراق کے بعد حسن عسکری اور بعد ازاں "سلیم احمد"۔ سب میں آپ کو خیال اور انداز بیان کا اکتساب نظر آئے گا۔ فکر کی بازگشت اور اکثر الفاظ کی یکسانیت بھی مل جائے گی۔

ظاہر ہے کہ اس کی وجہ کچھ مشترک سماجی عوامل، کچھ مشترک تہذیبی اقدار اور شعری و ادبی اصناف کی کچھ مشترک ہیئتی خصوصیات ہیں اور سب سے بڑی بات فنکار کا اپنا علم جو وقت کے ساتھ ساتھ شعور سے لاشعور میں اترتا جاتا ہے اور دشتِ فراموش گاری میں بگولے کی طرح آوارہ و سرگرداں رہتا ہے

شاعری میں ان آوارہ خیالات کی بازگشت اس لیے نمایاں نظر آتی ہے کہ شعر کی لغت میں الفاظ کی تعداد نثر کی بہ نسبت محدود ہے اور یہی حد بندی شاعر کو مجبور کرتی ہے کہ اس مخصوص دائرے میں رہ کر اپنی بات کہے۔ پچھلے دنوں ترقی پسند شاعروں نے غزل میں کچھ نئے سماجی اور سیاسی الفاظ شامل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر بہت کم الفاظ کو غزل برداشت کر سکی۔ نظم میں البتہ قدرے گنجائش ہے لیکن اس سلسلے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ نئی نسل کے شعرا اس سلسلے میں کچھ جسارت

کرتے ہیں لیکن یہ وقت ہی فیصلہ کرے گا کہ ان میں کتنی نظموں کو بقا نصیب ہوتا ہے۔ بہرحال یہ ایک خالص علمی مسئلہ ہے جس کا فلم سے (فی الحال) دور کا بھی تعلق نہیں۔ اور ہماری فلمی شاعری تو ویسے بھی بڑی پابندیوں کا شکار ہے۔

سلیم صاحب نے میری "فلمی نظم" پر اعتراض کیا ہے۔ میں اسے ضرور قبول کر لیتا اگر شعوری طور پر یہ عمل کیا گیا ہوتا۔ اس تاثر کی نوعیت وہی ہے جو حسرت موہانی، اختر شیرانی اور مجروح سلطان پوری کے مصرعوں میں پائی جاتی ہے۔

سلیم صاحب خود سوچیں کہ اپنے سے بڑے کسی شاعر کو ذہن میں رکھ کر کوئی شعر کہا جا سکتا ہے؟ میرے خیال میں تو یہ بات ممکن ہی نہیں۔ شعر کہتے وقت اگر بھولے سے بھی کسی بڑے شاعر کا خیال آ جائے تو قلم ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور "اندر کا فنکار" بول اٹھتا ہے

یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

اگر سلیم صاحب "ادیب اور شاعر" ہیں تو خود اپنا تجزیہ کر سکتے ہیں۔ دوسری سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ ہزاروں شعر خود کہنے والا شاعر کیا ایک یا دو اشعار کے لیے دوسروں کے سامنے دامن پھیلا دے گا؟

وہ گل کسی بہار کا احسان کیوں اٹھائے
جس کو ملی ہے زخم جگر کی شگفتگی

حمایت علی شاعر

(مطبوعہ نگار، ستمبر ۱۹۶۳ء)

حمایت علی شاعر (ماخوذ۔ شخص و عکس)

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور بھی

(مطبوعہ ہفتہ وار "نگار" (کراچی)، یکم ستمبر ۱۹۶۳ء)

کچھ ہفتوں کی بات ہے جب ہم نے حمایت علی شاعر سے ان کے ایوارڈ یافتہ گیت پر انٹرویو شائع کیا تھا۔ اسی انٹرویو کے حوالے سے ہمیں ایک خط[1] ملا تھا۔ جسے چھاپ کر ہم نے عنوان باندھا تھا "کیا روشنی پانا عیب ہے؟" اس عنوان کے تحت بہت سے اہل فکر نے اظہار خیال کیا۔ اور بڑی قابلِ قدر باتیں ہاتھ آئیں جو ہم نے جوں کی توں نذر قارئین کر دیں۔ اب اسی سلسلے میں حمایت علی شاعر نے ایک طویل شعری مطالعہ بھیجا ہے جو اس وقت آپ کے سامنے ہے۔ یہ باتیں خالص ادب کی ہیں۔ فلم کے پرچے میں ان کے شائع ہونے سے وہ دیوار گر جاتی ہے جو فلم اور ادب کے مابین ہے۔ اسی ضمن میں ایک اور بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ شاید فلم کا یہ پہلا گیت ہے جس پر اس طرح بحث چھڑی۔ ان سطور کے ذریعے ہم پاکستان اور ہندستانی کے ادبا و شعرا کو بھی بحث کی دعوت دیتے ہیں تاکہ ایک مسئلہ پر اور کئی باتیں جمع ہو جائیں۔ (ادارہ "نگار")

اس بحث نے تو طوفان مچا دیا ہے۔ لاہور میں فلمی حلقوں سے لے کر ادبی حلقوں تک یہی بحث تقریباً ہر ٹیبل ٹاک کا موضوع ہے۔ ابھی ابھی ڈھاکہ سے بھی ایک دوست کا خط آیا ہے جس میں لکھا ہے کہ وہاں بھی کچھ لوگ قلم تولے بیٹھے ہیں۔ بہر حال مجھے خوشی ہے

---

[1] مطبوعہ "نگار" ۱۱، اگست ۱۹۶۳ء۔ سلیم صدیقی۔ مطبوعہ ۲۵، اگست ۱۹۶۳ء

کہ ابھی تک یہ بحث ذاتیات سے پاک ہے اور ادبی سنجیدگی کی بھی حامل ہے۔ فلمی رسائل میں ادبی موضوعات پر چونکہ بہت کم لکھا جاتا ہے اس لیے اس بحث کو میں فالِ نیک سمجھتا ہوں کم ازکم اسی بہانے کچھ کام کی باتیں عام لوگوں تک بھی پہنچ جائیں گی اور "نگار" یہ خدمت انجام دے کر ایک طرح سے دیگر فلمی رسائل کی بھی رہنمائی کر رہا ہے۔

میری فلمی نظم "کسی چمن میں رہو" پر بحث چونکہ خالص ادبی رنگ اختیار کر چکی ہے اس لیے اس خط میں ایک دل چسپ ادبی مطالعہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس بحث میں اتفاق سے دو معتبر ادبی شخصیتوں کے نام آ گئے ہیں۔ حسرت، جو ہماری شعری روایات کے ایک اہم نمائندے ہیں۔ اور فیض احمد فیض جن کا نام روایت اور جدیدیت کے حسین امتزاج کا ضامن ہے۔ اب ذرا یہ دیکھئے کہ ان عظیم فنکاروں کے کلام میں اپنے پیشروؤں کا مطالعہ کس طرح نمایاں ہوا ہے اور یہ سلسلہ درجہ بدرجہ کہاں پہنچا ہے۔

مولانا حسرت موہانی نے جن اساتذہ سے شعوری طور پر استفادہ کیا ہے ان کے بیشمار مقطعوں سے ظاہر ہے۔ میں نقل کرتا ہوں ؎

حسرت یہ وہ غزل ہے جسے سن کے سب کہیں
مومن سے اپنے رنگ کو تو نے ملا دیا

شیرینیٔ نسیم ہے سوز و گداز میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لطف سخن تمام

شعر میرے بھی ہیں پُر درد ولیکن حسرت
میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

طرفہ حسرت بہ شوخیٔ انشا
رنگ جرأت میرے بیان میں ہے

مولانا حسرت نے ان استفادوں کا اظہار جس فخر سے کیا ہے وہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارے بزرگ اسے عیب نہیں سمجھتے تھے۔

لیکن شاعر پر اپنے مطالعے کے بعض لاشعوری اثرات بھی ہوتے ہیں۔ اس کی مثال مولانا حسرت کے کلام میں یوں نظر آتی ہے کہ انہوں نے اپنے تمام دیوان میں استفادے کے سلسلہ میں، غالب کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے۔ اگر غالب کا کہیں ذکر آیا بھی ہے تو یوں کہ

ہو کے بے خود کلام حسرت سے
"آج غالب غزل سرا نہ ہوا"

اب ذرا حسرت کے ہاں غالب کی جھلکیاں ملاحظہ کیجئے

ہزاروں بار نکلے اشک لیکن پھر بھی کم نکلے
الٰہی اور کیسے آرزوئے چشمِ نم نکلے — حسرت

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے — غالب

وفا تجھ سے اے بے وفا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ، کیا چاہتا ہوں — حسرت

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے — غالب

آنے لگے نہ پا کے خوار بحسرت انہیں بھی ہم سے عار
جن پہ کہ ہم نے سب نثار، مال و منال کر دیا — حسرت

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں — غالب

مل گیا اچھا سہارا عذرِ مستی کا ہمیں،
لے لیا آغوش میں اس گل کو بیباکانہ آج — حسرت

ہم سے کھل جاؤ، بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن — غالب

مرے بعد گزرے وہ مشقِ ستم سے
ندامت کے پہلو نمایاں ہیں غم سے — حسرت

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا — غالب

شاہِ جنوں نے خلعتِ آزادگی دیا
زنداں میں بھی ہیں خیال کے صحرا بنے ہوئے — حسرت

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال، بیاباں نورد تھا — غالب

پھر لے چلا ہے دل ہمیں تا کوئے ملامت
خطرہ نظر آیا نہ اسے پیش نہ پس کا — حسرت

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے — غالب

چھیڑ ناحق نہ اے نسیم بہار
سیرِ گل کا یہاں کسے ہے دماغ — حسرت

فراقِ یار میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
ہمیں دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا — غالب

تعجب کیا اگر نیکی کے بدلے ہو بدی حاصل
نرالے ہیں یہاں کے قاعدے اے دل نیا ہے — حسرت

کہوں کیا خوبیٔ اوضاعِ ابنائے زماں غالب
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی — غالب

شرحِ بے مہریٔ احباب کروں کیا حسرت
رنج ایسا دلِ مایوس کو کم پہنچا تھا — حسرت

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں — غالب

مصرعے ملاحظہ ہوں :۔

ہے یہ وہ درد جو شرمندۂ درماں نہ ہوا — حسرت
ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا — غالب

کافی تھی مجھے دُردِ تہہ جام بھی حسرت — حسرت
یوں ہے کہ مجھے دُردِ تہہ جام بہت ہے — غالب

کیا پھر جذبۂ بے اختیار شوق نے واپس — حسرت
جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے — غالب

اب وہ ہجوم شوق کی سرمستیاں کہاں — حسرت
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں — غالب

رنگ لائے گی کسی دن یہ گدائی آپ کی — حسرت
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن — غالب

کیا کہوں تم سے مدعا کیا ہے — حسرت
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے — غالب

شکرِ الطاف نہیں، شکوۂ بیداد نہیں — حسرت
ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں — غالب

یہ بھی اچھا ہوا برا نہ ہوا — حسرت
ہیں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا — غالب

مثالیں ان گنت ہیں لیکن طوالت کے خیال سے انہیں پر اکتفا کروں گا۔ اب دوسرے مشاہیر اور ان کے ہمعصروں کی ایک ایک جھلک دیکھیں۔

ع فکرِ امروز ہی رکھیں، غمِ فردا نہ کریں — حسرتؔ
ع فکرِ فردا نہ کروں، محوِ غمِ دوش رہوں — اقبالؔ

ے چھیڑ ناحق نہ اے نسیمِ بہار
سیرِ گل کا یہاں کسے ہے دماغ — حسرتؔ

ے میں اور سیرِ لالہ و گل ہجرِ یار میں
کیسی بہار، آگ لگا دو بہار میں — شادؔ

ے نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں — انشاءؔ

ع دیکھنا وہ نگہہ ناز کہاں ٹھہری ہے — حسرتؔ
ع اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں — حالیؔ

ع کچھ ہمیں تیری تمنّا کے سوا یاد نہیں — حسرتؔ
ع اب کچھ بھی نہیں مجھ کو محبت کے سوا یاد — جگرؔ
ع اب کچھ بھی نہیں سوزِ غمِ دل کے سوا یاد — جگن ناتھ آزاد

آیئے اب ذرا غالبؔ کا مطالعہ کریں۔ غالبؔ نے اپنے پیشروؤں سے استفادے کا اعتراف اس انداز میں کیا ہے۔

ے ریختہ کے تمہی استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

ع طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

ع غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

لیکن غالب نے کہیں بھی ناسخ سے استفادے کا ذکر نہیں کیا۔ (نگار کے پچھلے شمارے میں انور کمال حسرت صاحب نے اس سلسلے میں کافی مثالیں دی ہیں۔ اس میں ان اشعار کے علاوہ کچھ اور شعر نقل کروں گا) یہ مثالیں بھی لاشعوری ردِ عمل کے ذیل میں آتی ہیں۔

ع لاغر ایسا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے — غالب

ع لاغر ایسا ہوں کسی کو میں نظر آتا نہیں
چاہیئے مانی ورق سادہ مری تصویر کا — ناسخ

ع وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار — غالب

ع کون منت کرے دربانِ درِ جاناں کی
ایک دم روؤں تو دیوار بھی در ہو جائے — ناسخ

ع سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دلجو سے جو گلزار میں آئے — غالب

؎ وہ سرد جو ہوتا ہے خراماں روشوں پر
سایہ کی طرح پھرتے ہیں گلشن میں شجر ساتھ — ناسخ

؎ ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا — غالب

؎ اشک تھم جائیں جو فرقت میں تو آہیں نکلیں
خشک ہو جائے جو پانی تو ہوا پیدا ہو — ناسخ

؎ مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اگتی ہے حنا
کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا — غالب

؎ مل گیا خاک میں پس پس کے، حسینوں پر میں
قبر پر بوئیں کوئی چیز، حنا پیدا ہو — ناسخ

؎ لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
دکھلاتا ہوں ہر روز میں اک داغِ نہاں اور — غالب

؎ سر کا شبِ تاریک میں داغوں سے جو چھایا
اک خلق مرے سامنے کھاتی ہے کھڑی دھوپ — ناسخ

ع چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — غالب
ع رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے کوئی — ناسخ

گیرم کہ بہ افشاندنِ الماس میرزم
مشتے نمکِ سودہ بہ زخمِ جگرم ریز غالب

گر سودۂ الماس نہ تھا، لون چھڑکتا
جھردہن زخم کو قاتل سے گلہ ہے ناسخ

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم
گر بہ موج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا غالب

وہ بادل ہیں جو لیں قرض، آب دریا
مروں پیاسا، نہ لوں آبِ بقا قرض ناسخ

اب ذرا ناسخ کو پڑھیں۔ ناسخ نے کھلے الفاظ میں اپنے استفادوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن وہ اپنی شاعری کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں، اس مقطع سے ظاہر ہے

چونک اٹھے خوابِ لحد سے، سن کے سودا یہ غزل
شاعری ہرگز نہیں ناسخ فقط اعجاز ہے

اب یہ دیکھئے کہ اس اعجاز میں کس کس کا فیض شامل ہے۔

مست ناسخ تجھے رکھتا ہے کلامِ حافظ
میرے ساغر میں بجز بادۂ شیراز نہیں

ناسخ کی غزل سن کے کہا کرتے ہیں شاباش
آتی ہے مجھے حافظِ شیراز کی آواز

ہے بیاضِ فکرِ ناسخ کی جو شادابی یہی
لکھنؤ میں آئے گی روحِ غنی کشمیر سے

ناسخ یہ فصاحت و بلاغت
گویا سلمان ساوجی ہے

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب
ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اس مغفور کا

ناسخ ہے میر سلمہ اللہ کی زمین
اک معنیٔ شگفتہ کو باندھا ہزار رنگ

کون سی طرزِ سخن ہے جو اسے آتی نہیں
کیوں نہ ہو شاگرد بے ناسخ ہر اک استاد کا

مضمون طویل ہو جائے گا ورنہ میں ناسخ کے استفادوں کی مثالیں بھی پیش کرتا۔ اب آیئے ذرا فیض صاحب کا مطالعہ کریں، فیض صاحب نے سودا، درد اور غالب کی زمینوں میں نہ صرف غزلیں کہیں، بلکہ پورے پورے شعر اور مصرعے بھی "احتراماً" اپنی غزلوں میں شامل کر لیے ہیں تاکہ لوگ ان اشعار کے رنگ سے فیض صاحب کی غزل کا لطف اٹھا سکیں۔ تازہ مثال خواجہ میر درد کا یہ شعر ہے

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

فیض صاحب نے غلطی سے اسے ذوق کا سمجھا اور "تضمینِ ذوق" ہی کے عنوان سے روزنامہ جنگ میں یہ غزل شائع ہوئی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے بعد

نقوش (لاہور) افکار (کراچی) اور صبا (حیدرآباد دکن) میں بھی یہ غزل نقل ہوئی اور ذوق ہی کے حوالے سے

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ان اساتذہ کے علاوہ فیض صاحب نے جن مغربی شعرا سے فیض اٹھایا ہے ان میں صرف براؤننگ کا حوالہ انہوں نے دیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بعض مغربی شعرا کے اثرات فیض صاحب کے کلام میں ملتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اثرات بھی ان کے مطالعے کے لاشعوری ردّعمل کا نتیجہ ہیں لیکن اس سے پہلے کہ میں کسی مغربی شاعر کی مثال دوں اپنے ادب سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

مئے بہ اندازہ خمار نہیں — فیض
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے — غالب

اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا — فیض
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا — امجد حیدرآبادی

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں — فیض

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں
خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں — داغ

تیرے آزار کا چارہ نہیں نشتر کے سوا
اور یہ سفاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا — فیض

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا — مولانا ظفر علی خاں

اس طرح "چند روز اور میری جان فقط چند ہی روز" میں اختر شیرانی کی نظم "نوید" کے اثرات نمایاں ہیں اور "اب وہی حرفِ جنوں سب کی زبان ٹھہری ہے" میں حسرت موہانی کی اسی زمین میں کہی ہوئی غزل کے کچھ کچھ اثرات نظر آتے ہیں

مضمون خاصا طویل ہوتا جا رہا ہے ورنہ میں مماثلت خیال و الفاظ کی اور بھی مثالیں پیش کرتا۔ اب ایک نظر ان اشعار پر بھی ڈالتے چلیے۔ دیکھیے کہ فیض صاحب نے حافظ سے کتنا اثر قبول کیا ہے۔

ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر
کچھ کچھ سحر کے رنگ پر افشاں ہوئے تو ہیں — فیض

اے دل صبور باش، مخور غم، کہ عاقبت
از شام صبح گردد و از شب سحر شود — حافظ

گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں — فیض

من ارچہ در نظر یار خاکسار شدم
رقیب نیز چنیں محترم نخواہد ماند — حافظ

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے — فیض

سلامتِ ہمہ آفاق در سلامتِ تست
بہ ہیچ عارضہ شخصِ تو دردمند مباد
دریں چمن چو درآید خزاں بہ یغمائی
رہش بہ سروِ سہی قامتِ بلند مباد — حافظ

ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے
منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارہ
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے — فیض

تو عمر خواہ و صبوری کہ چرخِ شعبدہ باز
ہزار بازی ازیں طرفہ تر برانگیزد — حافظ

امید کہ لو جاگا غمِ دل کا نصیبہ
لو شوق کی ترسی ہوئی شب ہو گئی آخر
لو ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے
اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مقدر — فیض

روزِ ہجراں و شبِ فرقتِ یار آخر شد
زدم ایں فال و گذشت اختر و کار آخر شد
آں پریشانیٔ شب ہائے دراز و غمِ دل
ہمہ در سایۂ گیسوئے نگار آخر شد　　　حافظ

جو ترے حسن کے فقیر ہوئے
ان کو تشویشِ روزگار کہاں
درد بیچیں گے گیت گائینگے
ایسا خوش وقت کاروبار کہاں　　　فیض

گدائے کوئے تو از ہشت خلد مستغنی است
اسیرِ بندِ تو از ہر دو عالم آزاد است　　　حافظ

مغربی شعرا میں براؤننگ اور شیلی کے علاوہ ڈبلیو، بی ایٹس (YEATS) کا عکس تو فیض کے کلام میں اتنا واضح ہے کہ بادی النظر میں ان کے بعض اشعار (YEATS) کا ترجمہ محسوس ہوتے ہیں۔ ایک مثال یہ بھی دیکھیے:۔

THIS NIGHT BEATEN MORN,
THIS SPOTED LIGHT.

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر

مولانا حسرت موہانی اور فیض احمد فیض کے سلسلہ بہ سلسلہ مطالعے کی روشنی میں بات حافظ شیرازی تک جا پہنچی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پر کسی شاعر کو کوئی الزام نہیں دیا جا سکتا۔ جن جن شعرا کے نام اس مضمون میں آئے ہیں ان سب کی ادبی حیثیت مسلّم ہے اور

بزرگوں سے جو روشنی انہیں ملی ہے اس کا دوسرا نام ' علم " قرار دیا جائے گا اور ظاہر ہے کہ علم کے بغیر اچھی اور بڑی شاعری ممکن نہیں ہے علم کی یہ روشنی ذہن بہ ذہن اور سینہ بہ سینہ (شعوری اور لاشعوری طور پر) صدیوں سے پھیلتی اور نسل در نسل اترتی آ رہی ہے۔ خود حافظ اپنے بارے میں کہتا ہے کہ اس نے یہ روشنی کہاں سے حاصل کی ہے۔

استادِ غزل سعدیست پیشِ ہمہ کس اما
دارد سخنِ حافظ طرزِ سخنِ خواجو

۵ خواجو کرمانی

لیکن حافظ کے کلام میں کچھ مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ کیجیے۔ سعدی شیرازی کا شعر ہے

اگر دشنام فرمائی وگر نفرین دعا گویم
لبِ لعلِ شکر خارا، جوابِ تلخ می زیبد

اور حافظ شیرازی کا شعر ہے

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خارا

ایک مثال اور

عشق حق ہے کہیں، نبی ہے کہیں — ہے محمد کہیں، علی ہے کہیں
عشق عالی جناب رکھتا ہے — جبرئیل و کتاب رکھتا ہے (میر)

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ — عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام (اقبال)

چودھری اقبال احمد

حمایت علی شاعر کے نام ---- کھلا خط

(مطبوعہ "کردار" ۲۴ راگست ۶۳ء)

محترم حمایت علی شاعر صاحب۔ آداب ونیاز

حال ہی میں آپ کا ایک گیت (نظم) "کسی چمن میں رہو تم بہار بن کے رہو" فلم (آنچل) ۱۹۶۲ء کا بہترین فلمی نغمہ قرار دیا گیا ہے اور امید ہے کہ اس پر آپ نہایت فخر کے ساتھ انعام قبول کرلیں گے۔ مجھے نہایت افسوس کے ساتھ آپ سے پوچھنا پڑ رہا ہے کہ کیا اردو کے مشہور شاعر اختر شیرانی (مرحوم) کی روح آپ کی اس حرکت پر مضطرب نہیں ہوگی۔ مرحوم کی ایک نظم بعنوان "ایک عزیز کی شادی پر" کا مشہور مصرع ہے۔

تم اپنے گھر کے چمن میں بہار بن کے رہو

اور آپ کا مصرع ہے۔

کسی چمن میں رہو تم بہار بن کے رہو

ان دونوں مصرعوں میں کوئی فرق ہے؟ خیال وہی 'لب ولہجہ وہی' مطالب وہی' حتیٰ کے الفاظ بھی وہی۔ آپ ماشاء اللہ خاصے شہرت یافتہ شاعر ہیں۔ آپ کو زیب نہیں دیتا تھا کہ آپ کسی دوسرے شاعر کی نظم کو اپنا بنا کر کسی فلم ساز کے ہاتھ بیچتے پھریں۔ یہ سرقہ آپ کے شایان شان نہیں۔ لوگ آپ کی عزت کرتے ہیں۔ آپ کا مجموعہ کلام بھی چھپ چکا ہے۔ فلمی دنیا میں آپ کا خاصہ طوطی بول رہا ہے۔ آپ کے احباب آپ کو ایوارڈ دے کر مزید شہرت بھی دینا چاہتے ہیں۔ لیکن چوک یہ ہوگئی کہ اس جوش میں غلط گیت منتخب کرلیا گیا ہے۔ آپ کو چاہیے تھا کہ آپ اس گیت پر ایوارڈ لینے کی بجائی کوئی اور گیت تجویز کردیتے۔ بہرحال جو

کچھ ہوا برا ہوا۔ آپ ایسے بڑے اور شہرت یافتہ شاعروں کو فلمی دنیا کے "تک بند" شاعروں کے لئے ایسی مثال قائم نہیں کرنی چاہیے۔ ہو سکتا ہے آپ اس ایک مصرع کی مماثلت کو حسن اتفاق یا توارد کا نام دے کر بات آئی گئی کر دیں۔ اس لئے میں آپ کا پورا گیت ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

کسی چمن میں رہو تم بہار بن کے رہو
خدا کرے کسی دل کا قرار بن کے رہو
ہم اپنے پیار کو دل سے لگا کے جی لیں گے
یہ زہر تم نے دیا ہے تو ہنس کے پی لیں گے
زمانہ دے نہ تمہیں بے وفائی کا الزام
زمانہ بھر میں وفا کا وقار بن کے رہو
کسی چمن میں رہو تم.................
کسی کے ساتھ رہو تم تمہارے ساتھ ہیں ہم
تمہارا غم ہے سلامت تو پھر ہمیں کیا غم
تمہاری راہ چمکتی رہے ستاروں سے
دیار حسن میں حسن دیار بن کے رہو
کسی چمن میں رہو تم.................

پہلے مصرع کے متعلق میں اوپر لکھ چکا ہوں آپ کا دوسرا مصرعہ یہ ہے۔

خدا کرے کسی دل کا قرار بن کے رہو

اختر شیرانی مرحوم کی نظم کا ایک بند ہے۔

دعا ہے سب کی کہ آزاد بامراد رہو
دلوں کو شاد رکھو خود ہمیشہ شاد رہو
قرار جان و دل بے قرار بن کے رہو

اس بند کا آخری مصرعہ مفہوم و معنی کے لحاظ سے آپ کے مصرعے سے قطعی مطابق

ہے۔ اس کے بعد میں اختر شیرانی مرحوم کی مذکورہ بالا نظم کے چند بند نقل کرتا ہوں، جنہیں آپ اپنی نظم یا گیت سے ملا کر پڑھیں اور محسوس کریں کہ آپ نے کیا کارنامہ کر دکھایا ہے۔

زمانے بھر کی خوشی ہو تمہاری قسمت میں
ہمیشہ عمر گزارو سواد راحت میں
تبسم چمن روزگار بن کے رہو

سرور دیدہ ملت کہے تمہیں دنیا
غرور عصمت وعفت کہے تمہیں دنیا
جہاں میں عصمت وعفت مدار بن کے رہو

نئے عزیز ہوں، مسرور و شاداں تم سے
نظر فروز بنے بزم خانداں تم سے
فروغ دیدہ لیل ونہار بن کے رہو

مثال طالع پرویں رہو جہاں بھی رہو
برنگ غنچہ نسریں رہو جہاں بھی رہو
حریف خندہ فصل بہار بن کے رہو

آپ کی نظم (گیت) اور اختر شیرانی کی نظم دونوں کا انداز دعائیہ ہے۔ دونوں میں ایک ہی قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے حتیٰ کے بحر اور موڈ بھی دونوں، نظموں کا ایک ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اختر شیرانی کی نظم میں مخاطب ان کی ایک عزیزہ ہے جس کی شادی ہو رہی ہے۔ اور آپ کی نظم میں مخاطب آپ کی محبوبہ ہے جو دلہن بن کر کسی غیر کے گھر جانے والی ہے۔ آپ نے اسی رعایت سے اپنی نظم میں الفاظ بدل لئے ہیں۔ لیکن جذبات، خیالات اور محسوسات وہی ہیں حتیٰ کہ تشبیہات بھی بیشتر اختر شیرانی ہی کی لی ہیں۔

تم اپنے گھر کے چمن میں بہار بن کے رہو
(اختر شیرانی)

کسی چمن میں رہو تم بہار بن کے رہو
(حمایت علی شاعر)

اختر شیرانی کی یہ نظم مرحوم کے آخری مجموعے "شہرود" میں موجود ہے جو صاحب دیکھنا چاہیں دیکھ سکتے ہیں۔ آخر میں' میں حمایت علی شاعر صاحب سے اور دیگر فلمی شاعروں سے درخواست کروں گا کہ خدارا مرحوم شعرا پر یہ نگاہ کرم نہ ڈالیں۔ وہ بے چارے اس دنیا میں نہیں ہیں کہ فلسازوں سے اپنی نظموں کا معاوضہ وصول کر سکیں یا سرقہ کرنے والوں کا ہاتھ پکڑ سکیں۔

آپ نے اس سال دیدہ دلیری سے ایوارڈ جیت لیا ہے۔ لیکن امید ہے آئندہ آپ احتیاط برتیں گے۔

یہ بحث ہفت روزہ "نگار" اور ہفت روزہ "کردار" (کراچی) میں تقریباً تین ماہ تک چلتی رہی (اگست تا اکتوبر ۶۳ء) سنا ہے کہ بعد ازاں کسی صاحب نے تمام مباحث کو "کسی چمن میں رہو" کے نام سے ایک کتابچے کی صورت میں شائع کردیا تھا۔ (مرتب)

فلم کی تاریخ میں پہلی مثال — پہلی کتاب

کسی چمن میں رہو

وہ نغمہ جس پر

حمایت علی شاعر کو ۱۹۶۲ء کے بہترین گیت پر "نگار" کا ایوارڈ ملا

★ ایک طویل علمی بحث

★ پانچ سو سے زیادہ ہم خیال اشعار کا انتخاب

★ ادب کے طالب علموں کے لیے بہترین ریفرنس بک

(جلد شائع ہو رہی ہے)

مکتبہ آگہی :- ۴۸ - لیاقت شو مارکیٹ حیدر آباد

اشتہار (مطبوعہ - نئی قدریں اپریل ۶۳ء)

نوٹ : "نئی قدریں" کے اس شمارے میں تاریخ اشاعت غلط چھپ گئی تھی۔ صحیح تاریخ اپریل ۶۴ء ہے۔ (مرتب)

حمایت علی شاعر

(ماخوذ۔ شخص و عکس)

کوچۂ طفلاں

(مطبوعہ ہفتہ وار "کردار" (کراچی، ۷ ستمبر ۶۳ء)

کس کوچۂ طفلاں میں چلے آئے ہو شاعر
آوازہ کسے ہے تو کوئی سنگ اٹھائیے

محترم ایڈیٹر صاحب

تسلیمات عرض

پچھلے ہفتے (۲۴ اگست ۶۳ء) "کردار" میں ایک صاحب کا "کھلا خط" میرے نام چھپا ہے۔ مکتوب نگار نے جن "ذہنی تحفظات" کے ساتھ یہ خط لکھا ہے وہ ان جملوں سے روشن ہے۔

"آپ کے "احباب" آپ کو ایوارڈ دے کر مزید شہرت بھی دینا چاہتے ہیں۔ لیکن چوک یہ ہو گئی کہ اس جوش میں غلط گیت منتخب کر لیا گیا ہے۔ آپ کو چاہئے تھا کہ آپ اس گیت پر ایوارڈ لینے کی بجائے کوئی اور گیت "تجویز" کر دیتے۔"

نوٹ:۔ اسی "کھلا خط" کا حوالہ شمیم احمد نے اپنی کتاب "رشِ قلم" ۱۹۸۳ء کے ناشائستہ مضمون میں دیا ہے جو بقول ان کے کتاب کی اشاعت سے بیس برس پہلے (یعنی ۶۳ء میں) لکھا گیا تھا اور کتاب کا واحد غیر مطبوعہ مضمون ہے اس کے علاوہ برادرِ عزیز محسن بھوپالی نے بھی اسی "کھلا خط" کی حمایت میں میرے خلاف ایک مراسلہ ہفتہ وار "کردار" (کراچی) میں لکھا تھا جو ۲۱ ستمبر ۶۳ء کو شائع ہوا تھا جس کا جواب "پہلا پتھر" کے عنوان سے اس کتاب میں شامل ہے۔

دونوں اصحاب کا "ایک مخصوص خط" کے حوالے سے لکھنا اور کم و بیش ایک سے اعتراضات جڑنا اس یک دلی (ملی بھگت) کی طرف اشارہ کرتا ہے جو میرے خلاف عمل میں آئی (حمایت)

اگر مکتوب نگار کی ذہنیت صاف ہوتی

"تو میں" بھی اس کو سمجھاتا مقام "فکر و فن" کیا ہے

خیر مجھے اس بات کا کوئی رنج نہیں ہے۔ کیونکہ جب معاشرہ انحطاط پذیر ہوتا ہے تو زندگی کے ہر شعبے میں ایسے عناصر پیدا ہو جاتے ہیں جو مثبت عناصر کو آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چونکہ وہ خود کچھ نہیں کر پاتے اس لیے دوسروں کو بھی کچھ کرتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ نفسیات کی زبان میں اسے اپنے احساسِ شکست خوردگی کا ردِ عمل کہتے ہیں۔ اگر میرے یہ کرم فرما نفسیاتی طور پر صحت مند ہوتے تو وہ اس ایوارڈ سے پہلے بھی اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کر سکتے تھے۔ یہ نغمہ گزشتہ ایک سال سے زبانِ زد عام و خاص ہے۔ بس معلوم ہوا کہ

یہ بھی ہے ماہتاب پرستی کی اک ادا

جب اس کو چھو نہ پائے تو خاک اس پہ پھینک دی   شاعر

بہر حال۔ میں پھر بھی ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری نظم کے ساتھ اختر شیرانی کی نظم بھی پیش کر دی۔ اہلِ فکر و نظر خود ہی تقابلی مطالعہ کر کے اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ میرے "انتروں" کے اشعار انفرادی طور پر کس حد تک میرے اپنے ہیں اور فنی اعتبار سے ان کا معیار کیا ہے۔ ان میں الفاظ کی نشست، مصرعوں کی بندش اور رعایتِ لفظی کا اہتمام کس حد تک کامیاب ہے۔ ایک مصرعہ مکتوب نگار نے غلط لکھا ہے۔ اصل مصرعہ یہ ہے۔

زمانے بھر میں وفا کا وقار بن کے رہو

واضح رہے کہ یہ ایک فلمی نغمہ ہے۔ اور فلمی شاعری کی عمومی روش اہلِ نظر کے سامنے ہے۔ اب میں نظم کے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ نظم بلاشبہ دعائیہ ہے اور (شعوری یا غیر شعوری طور پر) اسی "طرح" میں لکھی گئی ہے جس میں اختر شیرانی نے لکھی ہے۔

میں صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا "طرح" میں شعر کہنا جرم ہے؟ کیا اب کوئی دعائیہ نظم نہیں لکھی جانی چاہیے؟ کیا "محبوبہ" اور "بہن" میں کوئی فرق نہیں ہے؟

اگر یہ فرق موجود ہے تو ظاہر ہے کہ دعا کے لب و لہجہ میں بھی فرق آجائے گا اور یہی فرق دو دعائیہ نظموں کو ایک دوسرے سے مختلف کر دے گا۔

مکتوب نگار نے ایک مجرمانہ غلط بیانی سے بھی کام لیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ "بیشتر تشبیہات" میں نے "وہی استعمال کی ہیں"۔

میرے اشعار ایک بار پھر پڑھ لیجے۔

ہم اپنے پیار کو دل سے لگا کے جی لیں گے
یہ زہر تم نے دیا ہے تو ہنس کے پی لیں گے
زمانہ دے نہ تمہیں بے وفائی کا الزام
زمانے بھر میں وفا کا وقار بن کے رہو

کسی کے ساتھ رہو تم، تمہارے ساتھ ہیں ہم
تمہارا غم ہے سلامت تو پھر ہمیں کیا غم
تمہاری راہ چمکتی رہے ستاروں سے
دیارِ حسن میں جشنِ دیار بن کے رہو

اب خود فیصلہ کر لیجے کہ اس بیان میں کتنی صداقت ہے!

رہی "طرح" میں شعر کہنے کی بات تو اپنے مکتوب نگار کی اطلاع کے لیے عرض کروں گا کہ یہ بھی ایک بڑا فن ہے۔ اس سے شاعر کی فنی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے اور اساتذہ کے نزدیک یہ عمل ہمیشہ سے مستحسن رہا ہے۔ میر سے لے کر موجودہ شعرا تک جن کے دل میں روایت کا احترام ہے، سب نے اس فن میں مہارت کا مظاہرہ کیا ہے اور بصد افتخار کیا ہے۔ اساتذہ نے نہ صرف "طرح" میں شعر کہے ہیں بلکہ دوسروں کے مصرعوں پر "گرہ" بھی لگائی ہے اور اسے بھی کمالِ فن سمجھا ہے۔ مجھ سے تو گرہ لگانے کا گناہ بھی سرزد نہیں ہوا۔ حالانکہ اسی فلمی دنیا میں ایسی ان گنت مثالیں موجود ہیں۔ چند ملاحظہ ہوں۔

نگری مری کب تک یونہی برباد رہے گی
"دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی"

دوسرا مصرعہ یگانہ چنگیزی کا ہے لیکن جوش ملیح آبادی نے فلم "من کی جیت" میں اسے استعمال کر لیا۔

آپ آئے تو خیالِ دلِ ناشاد آیا
آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا

یہ مطلع ریاض خیر آبادی کا ہے" لیکن پہلے مصرعے کو ساحر لدھیانوی نے فلم "گمراہ" اور دوسرے مصرعے کو مجروح سلطان پوری نے فلم "آرتی" میں اپنے مصرعوں کے ساتھ بطور ٹکھڑوں کے استعمال کیا ہے۔

اس کے علاوہ ساحر کے یہ ٹکھڑے" دیکھیے۔ فلم "داستان" اور فلم "بھائی بہن" میں علامہ اقبال کے مصرعے استعمال کیے گئے ہیں۔

۱۔ نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
۲۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

"پھر صبح ہو گی" میں مجید لاہوری کی پیروڈی کا یہ مطلع استعمال کیا ہے۔

"چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا"
رہنے کو گھر نہیں ہے، سارا جہاں ہمارا

دوسروں کی طرف آیئے۔
نخشب نے نہ صرف نظام رامپوری کی غزل تضمین کے طور پر اپنی فلم میں شامل کر لی بلکہ خواجہ میر درد کی غزل پر فلم کا نام رکھ کر پورا مطلع ہی "مکھڑے" کے طور پر استعمال کر لیا۔

۱۔ انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا مجھے تو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ — نظام

۲۔ زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے — درد

شکیل بدایونی نے میرا بائی کے اکثر دوہوں کو مکھڑا بنا کر گیت لکھے اور بیدم اور داغ کے اشعار سے اپنے نغمات مرتب کیے۔

سینے میں دل ہے دل میں داغ ، داغ میں سوز و سازِ عشق
پردہ بہ پردہ ہے نہاں ، پردہ نشیں کا رازِ عشق

جہاں بجتا ہے نقارہ ، وہاں ماتم بھی ہوتا ہے
جہاں بجتی ہے شہنائی ، وہاں ماتم بھی ہوتا ہے

اب کچھ "ہم طرح" اشعار کی مثالیں پیش کروں۔

ہم کو تو گردشِ حالات پہ رونا آیا
رونے والے تجھے کس بات پہ رونا آیا — سیف

بات نکلی تو ہر اک بات پہ رونا آیا — ساحر

زیست مانگی تھی، خدائی تو نہیں مانگی تھی — یگانہ

پیار مانگا تھا، جدائی تو نہیں مانگی تھی — (حسرت جے پوری)

چند استفادوں کے نمونے بھی دیکھ لیجیے۔

لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے
الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے — نامعلوم

ڈر کے بجلی سے یکایک وہ لپٹنا اس کا
اور پھر شرم سے بل کھا کے سمٹنا اس کا — ساحر

ریشمی شلوار ، کرتا جالی دا — (ایک پنجابی لوک گیت)
ریشمی شلوار ، کرتا جالی کا — ساحر

مثالیں بہت طویل ہو جائیں گی ورنہ پاکستانی شعراء کے استفادے اور گریں بھی نقل کرتا ۔ لیکن خیر

تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

اب میں مماثلت لفظی کی طرف آتا ہوں ۔ اس سے خیال کی یکسانیت کا جواز بھی واضح ہو جائے گا ۔ خط چونکہ خاصہ طویل ہو گیا ہے ، اس لیے اختصار سے کام لوں گا ۔

اختر شیرانی کا مصرعہ پڑھیے ۔

تم اپنے گھر کے چمن میں بہار بن کے رہو

مولانا حسرت موہانی کہتے ہیں ۔

رہے بہارِ چمن ہو کے جس چمن میں رہے

مجروح سلطان پوری کی ایک غزل کا مصرعہ ہے ۔

تو اے بہار گریزاں کسی چمن میں رہے

اور اب اس حقیر ، فقیر ، پُرتقصیر ، قابلِ صد تعزیر کا مصرعہ ملاحظہ فرمائیے ۔

کسی چمن میں رہو تم ، بہار بن کے رہو

سبھی دعائیہ مصرعے ہیں ، بہار اور چمن کا التزام بھی ہے ۔ کہیے کسے کیا الزام دیا جائے ۔ کیا ان محترم شخصیتوں کی شان میں کوئی گستاخی کی جا سکتی ہے ۔ اور اگر کوئی دریدہ دہن گستاخی کر بھی جائے تو کیا اس کی زبان سے نکلے ہوئے تمام الفاظ پلٹ کر اس کی اپنی ذات کا اشتہار نہیں بن جائیں گے ۔ ؟

میری نظم کے دوسرے مصرعے پر بھی الزام عائد کیا گیا ہے ۔ حالانکہ وہ سہل ممتنع کی ایک اچھی مثال ہے ۔

خدا کرے کسی دل کا قرار بن کے رہو

اختر شیرانی کا مصرعہ ہے ۔

قرارِ جان و دلِ بے قرار بن کے رہو

اگر ایسی مماثلتوں پر الزامات عائد کیے جانے لگیں تو تمام شعرائے کرام (خاص طور پر

اردو کے) مجرم ٹھیریں گے۔ اور انیس و دبیر کو تو ایک دوسرے کی کاربن کاپی کہنا پڑے گا۔ اسی طرح اگر موضوع و خیال کی یکسانیت کو بہانہ بنایا جائے تو ہر شاعر اپنے پیشرو کی ذات میں سے ابھرتا آئے گا۔ علامہ اقبال۔ نطشے، برگساں، ہیگل اور مولانا روم کا عکس ہو کر رہ جائیں گے۔ اور نئی نسل کے بیشتر شعرا، فرانسیسی اور انگریزی شاعروں کے چربے' خط ویسے ہی کافی طویل ہو گیا ہے ورنہ موصوف کو ادب کے اس کوچے کی بھی سیر کرا لاتا۔

لیکن۔ میرے خیال میں یہ انداز نظر ہی غلط ہے۔ ادب میں خیال سے زیادہ انداز بیان کی اہمیت ہوتی ہے۔ شعرا کے صحیح مقام کا تعین اسی کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ خیال' شاعر کے علم کی نمائندگی کرتا ہے اور اندازِ بیان اس کی فنّی تہذیب کی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ اور انوکھے سے انوکھا خیال' صحیح فنّی تہذیب کے ساتھ پیش نہ کیا جا سکے تو دو کوڑی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کا اعزاز (کریڈٹ) ہمیشہ اس شخص کو ملے گا جس نے اسے شستگی و آراستگی کے ساتھ لوگوں کے دل میں اتار دیا ہو۔

لیکن ہمارے ملک میں تو ہر کس و ناکس' ہر موضوع پر بول پڑتا ہے۔ بلکہ حفیظ جالندھری کے الفاظ میں' منہ آئی بک جاتا ہے۔

جینا بھی اک الزام ہے' مرنا بھی اک الزام
اے کاش ہم اس ملک کے فنکار نہ ہوتے

حمایت علی شاعر

محسن بھوپالی

ایک مراسلہ

(ایوارڈ یافتہ نغمے کے بارے میں)

(مطبوعہ فلمی ہفتہ وار "کردار" کراچی مورخہ ۱۲؍ ستمبر ۱۹۶۳ء)

خلیل جبران کا قول ہے کہ اگر کسی بات کو الجھانا ہو تو اس کی جس قدر تشریحات ممکن ہو سکیں، کردو۔ یہ قول حمایت علی شاعر صاحب کے "بیان صفائی" پر سو فیصدی صادق آتا ہے۔ موصوف نے چودھری اقبال احمد صاحب ○ کو ان کی برمحل اور بھرپور تنقید کے جواب میں ہر کوچے کی سیر کرادی لیکن اپنی "دکان" پر اقبال صاحب کو دو گھڑی کے لئے بھی نہیں لائے کہ کہیں وہ دوسرے "مال" کی بات نہ پوچھ بیٹھیں کہ صاحب یہ مال کہاں سے آیا ہے یا یہ تو فلاں دکان کا "مال" ہے ("کوچے" کا استعمال حمایت صاحب اپنے مکتوب میں کر چکے ہیں) ہاں تو حمایت صاحب نے اعتراف (Confess) کرنے کے بجائے اپنے سے بزرگ اور بے داغ ادبی حیثیت رکھنے والے شعراء کو صف آرا کر کے ایک ایک پر وہ الزام دھرے ہیں کہ بس! شعرا کی صفیں بنانے میں بھی انتہائی دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے سوائے دو ایک کے کسی پاکستانی شاعر کو (Touch) چھوا نہیں ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہو کہ وہ ابھی نئے نئے فلمی صنعت میں آئے ہیں اور کسی پاکستانی شاعر کو برگشتہ نہیں کرنا چاہتے، اسی لئے انہیں "معاف" کرتے ہوئے ان کے لئے یہ جملہ استعمال کیا ہے۔

"مثالیں بہت طویل ہو جائیں گی ورنہ پاکستانی شعرا کے استفادے اور گرہیں بھی نقل کرتا لیکن خیر ــــــــ"

ویسے یہ اور بات ہے کہ کر بھی کیا سکتے تھے جب کہ بقول حالی

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل

اپنے مکتوب میں جو انہوں نے پہلی توجہ طلب بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ "اگر میرے یہ

کرم فرما نفسیاتی طور پر صحت مند ہوتے (شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر صاحب ماہر نفسیات نہ جانے کب سے ہوئے ہیں) تو وہ اس ایوارڈ سے پہلے بھی اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کر سکتے تھے کہ "یہ نغمہ گزشتہ ایک سال سے زبان زد خاص و عام ہے" (اس جملے میں لفظ "خاص" زائد ہے) اس سلسلے میں عرض ہے کہ سمجھنے والے جب بھی سمجھتے تھے اور اب بھی سمجھتے ہیں اور اسے ایک عام فلمی گیت سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے لیکن جب اسی گیت کو منیر نیازی کی غزل۔

جا اپنی حسرتوں پر آنسو بہا کے سو جا

فیض کی نظم

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

قتیل کی غزل

نگاہیں ملا کر بدل جانے والے۔۔۔۔

اور دیگر اچھی تخلیقات پر اپنے احباب کے ذریعے فوقیت دلوائی گئی تو یہی گیت موضوع بحث بن گیا غالباً اب آپ وجہ تنقید سمجھ گئے ہوں گے۔ آپ نے اپنے مکتوب میں اپنے ہی ایک شعر کا مخاطب اقبال صاحب کو بنایا ہے' حالانکہ وہ آپ کے مقابل نہیں تھے اور نہ ہی وہ شاعر ہیں کہ آپ سے بازی نہ لے جاسکے تو آپ کو ہدف ملامت بنالیا۔ یہ شعر کسی اور موقع پر استعمال کیا جاتا تو شائد مفہوم واضح ہوتا۔ بہرحال آپ نے بات یہاں تک تو مان لی ہے کہ آپ کا گیت اختر شیرانی کی نظم کی "طرح" میں ہے۔ مفہوم اور مرکزی خیال کے لحاظ سے بھی ایک ہی ہے۔ اختر شیرانی کی نظم بھی دعائیہ ہے اور آپ کی "تخلیق" بھی دعائیہ ہے اگر آپ یہ اور مان لیں کہ اختر شیرانی کی مذکورہ نظم پڑھنے اور ہضم کرنے کے بعد اسی مفہوم کو اپنے انداز بیان اور اپنی "فنی تہذیب" میں ڈھالا ہے تو ساری بحث ہی ختم ہو جائے اور پھر کوئی "حرف گیری" کی جسارت ہی نہیں کرے گا۔

آپ نے گرہ لگانے کی مثالوں میں حضرت جوش کا مطلع پیش کیا ہے۔ گزارش ہے کہ

دوسرا مصرعہ

دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

واقعی یگانہ کا ہے جو کہ انکی زندگی میں ہی استعمال کیا گیا تھا اور جس کے بارے میں یگانہ بھی کہہ چکے تھے کہ "جوش خاں میرا مصرعہ لے اڑا ہے" لیکن جوش نے آج تک تردید کی جسارت نہیں کی۔ انہوں نے گرہ لگائی ہے، مصرعہ کو اپنا نہیں کہا ہے۔ ریاض خیر آبادی کا شعر بے حد مشہور شعر ہے اور مجروح اور ساحر نے اس کا ایک ایک مصرعہ مکھڑے کے طور پر استعمال ضرور کیا ہے لیکن انہیں بھی آپ کی طرح دعویٰ نہیں ہے کہ وہ ان کی اپنی تخلیق ہے۔ نخشب پر نظام رامپوری کا پورا مطلع استعمال کرنے کا الزام کم علمی پر دلالت کرتا ہے نخشب نے مطلع استعمال نہیں کیا ہے بلکہ نظام کی غزل پر تضمین کہی ہے۔ پورا ریکارڈ دوبارہ سنئے گا تو اس میں مقطع بھی سماعت فرمایئے گا۔

دنیا کسی کا ساغر مئے یاد ہے نظام
منہ پھیر ادھر کو، ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

نخشب نے نظام کا تخلص تضمین میں رہنے دیا ہے اور یہی ادبی دیانت داری کا تقاضہ بھی تھا○ کہاں تک تردید کئے جاؤں ـــــ کردار کے صفحات متحمل نہ ہو سکیں گے۔

آپ نے آخر میں جھنجھلا کر اختر شیرانی کے خیال کو بھی ورڈز ورتھ سے مستعار گردانا ہے۔ نہ جانے آپ نے جنت کو بہار کا اور زمین کو گھر کا مماثل کس لغت سے دیکھا ہے۔

حمایت صاحب یورپ بائی نائٹ کے مشہور گانے "You know you never know" کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟ کیا آپ کی ایک "تخلیق" ـــــ تجھ کو معلوم نہیں، تجھ کو بھلا کیا معلوم اس کا لفظی ترجمہ نہیں ہے۔○

آپ کی اپنی تخلیقات پر تو نظر ڈالئے۔ دوسروں کا کلام پھر دیکھا جائے گا۔ مختصراً چند ہی مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

یہی زندگی حقیقت، یہی زندگی فسانہ (جذبی)○ (یہ مصرعہ جذبی کا نہیں ہے اطلاعاً عرض ہے۔)
یہی زندگی حقیقت، یہی زندگی فسانہ (شاعر)
ڈوبتے جات ہیں تارے، بیٹھتا جاتا ہے دل (شعری)
اٹھتے جاتے ہیں قدم اور بیٹھتا جاتا ہے دل (شاعر)

قلزم نیلگوں تری وسعت (مدنی)
قلزم نیلگوں ترا پھیلاؤ (شاعر)
ممکن نہیں کہ آگ جلے اور دھواں نہ ہو (نامعلوم)
ممکن نہیں آگ لگے اور دھواں نہ ہو (شاعر)
آئینہ خانہ تصور میں (مصطفیٰ زیدی)
آئینہ خانہ تصور میں (شاعر)
اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا (فیض)
اور بھی غم ہیں زمانے میں غم دل کے سوا ○
محفلیں اور بھی ہیں عشق کی محفل کے سوا (شاعر)

آخر میں ایک اور گیت "کھڑی کڑی میں مکھی پڑی" کے بارے میں بھی سن لیجئے۔ یہ جنوبی ہند کا لوک گیت ہے۔ جس کے دو مصرے آپ نے ویسے کے ویسے استعمال کر لئے ہیں۔"

کھٹی کڑھی میں مکھی پڑی ---- ہائے میری اماں
کام کا نہ کاج کا' ڈھائی سیر اناج کا

پتہ نہیں اسے فلمایا کس طرح گیا ہے۔ ویسے بادی النظر میں قاری بہت کراہت محسوس کرتا ہے۔ میں جان کر آپ کی ادبی تخلیقات مثلاً "بنگال سے کوریا تک" وغیرہ پر کچھ نہیں لکھ رہا کہ پھر کبھی دیکھا جائے گا۔ سردست مجھے آپ سے صرف اتنی گزارش کرنا ہے کہ آپ ٹھنڈے دل سے ان معروضات پر غور فرمائیں اور آئندہ ایوارڈ (جس کی حیثیت خود مشکوک ہے) حاصل کرنے کے سلسلے میں احتیاط سے کام لیں تاکہ بعد میں جگ ہنسائی نہ ہو۔

محسن صاحب کے اس مراسلے کا جواب قاضی سلیم نے ۱۶ اکتوبر ۶۳ء کے "نگار" میں دلائل کے ساتھ دیدیا تھا۔ ۸۳ء میں دوبارہ محسن صاحب نے یہ مسئلہ چھیڑ دیا تو مجبوراً حمایت صاحب کو بھی "جوابی مضمون" لکھنا پڑا عنوان ہے "پہلا پتھر" (مرتب)

حمایت علی شاعر (ماخوذ۔ شخص و عکس)

پہلا پتھر

یہ سنگ زنی میرے لیے بارشِ گل ہے
تھک جاؤ تو کچھ سنگ بدستِ دگراں اور

(مطبوعہ روزنامہ "کلیم" ۱۱، نومبر ۸۳ء)

بھائی شمسی صاحب

سلام خلوص

کچھ عرصہ ہوا برادرِ عزیز محسن بھوپالی نے اپنے ایک مضمون میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ

"قمر جمیل اور شمیم احمد نے حمایت علی شاعر پر جو الزامات لگائے ہیں، دراصل وہ الزامات سب سے پہلے انہوں نے لگائے تھے۔"

(مطبوعہ، روزنامہ "جسارت" ۲۶، اگست ۸۳ء۔ روزنامہ "کلیم" ۲، ستمبر ۸۳ء)

میں یہ تو نہیں جانتا کہ "پہل کاری" کا شرف کسے حاصل ہے۔ ہاں، یہ ضرور جانتا ہوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب میں فلم انڈسٹری سے وابستہ تھا اور مجھے "بہترین نغمہ نگاری" کے ایوارڈ مسلسل تین سال تک ملتے رہے۔ پہلے ایوارڈ کے اعلان پر (۶۳ء میں) میرے خلاف اور میری حمایت میں، فلمی اخبارات میں جو مراسلے شائع ہوتے ان میں ایک مراسلہ[1] برادرِ عزیز محسن بھوپالی کا بھی تھا جو ہفتہ وار "کردار" (کراچی) میں ۱۲، ستمبر ۶۳ء کو اشاعت پذیر ہوا۔ جس میں موصوف نے میرے تین چار فلمی اور غیر فلمی مصرعوں پر (لفظی تصرفات کے ساتھ) کچھ الزامات عائد کرتے ہوئے دوسرے شعراء کے مصرعے نقل کیے تھے۔ ملاحظہ ہوں۔

یہی زندگی حقیقت، یہی زندگی فسانہ (جذبی)
یہی زندگی حقیقت، یہی زندگی فسانہ (شاعر)

---

[1] محسن نے یہ مراسلہ کسی "چودھری" اقبال احمد کے "کھلا خط" کی حمایت میں میرے خلاف لکھا تھا

(جبکہ میرے فلمی نغمے کا مصرعہ تھا' ابھی زندگی حقیقت' ابھی زندگی فسانہ)

ڈوبتے جاتے ہیں تارے' بیٹھتا جاتا ہے دل[1] (شوری بھوپالی)

اٹھتے جاتے ہیں قدم اور بیٹھتا جاتا ہے دل (شاعر)

(یہ غزل "آگ میں پھول" میں شامل ہے۔ اصل شعر بھی پڑھ لیجیے)

پھر نہ لٹ جائیں کہیں منزل پہ اہلِ کارواں

اٹھتے جاتے ہیں قدم اور بیٹھتا جاتا ہے دل

قلزمِ نیلگوں تری وسعت (مدنی)

قلزمِ نیلگوں ترا پھیلاؤ (شاعر)

(حالانکہ مدنی صاحب کا اصل مصرعہ یوں ہے "قلزمِ نیلگوں ترے گرداب"۔ محسن کا نقل کردہ مصرعہ میری نظم "سمندر اور انسان" کا پہلا مصرعہ ہے جو پہلی بار ۵۹ء میں "ادبِ لطیف" کے سالنامے میں شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں، سمندر کے لیے "قلزمِ نیلگوں" کی ترکیب کو غلط محسوس کرتے ہوئے میں نے "قلزمِ بیکراں" کر دیا تھا۔ اس کے بعد جب بھی یہ نظم شائع ہوئی "قلزمِ بیکراں" ہی چھپا۔)

ممکن نہیں کہ آگ جلے اور دھواں نہ ہو (نامعلوم)

ممکن نہیں کہ آگ لگے اور دھواں نہ ہو (شاعر)

(یہ میری ایک غزل کا مطلع ہے اور یوں ہے)

روتا ہے دل تو روئے لبوں پر فغاں نہ ہو

یہ حکم ہے کہ آگ جلے اور دھواں نہ ہو (مٹی کا قرض)

آئینہ خانۂ تصوّر ہیں (مصطفیٰ زیدی)

آئینہ خانۂ تصوّر ہیں (شاعر)

اس مماثلت میں موصوف نے یہ جاننے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی میری نظم

---

[1] حالانکہ شوری کا مصرعہ ہے۔ ڈوبتے جاتے ہیں تارے' ڈوبتا جاتا ہے دل

"بنگال سے کوریا تک" ۵۲ء سے چھپ رہی ہے اور ان کی نظم بہت بعد کی ہے اور پھر ایسی مماثلتوں پر سرقے کا الزام لگانا کہاں تک درست ہے۔ میں نے توزیدی کے بارے میں ایسا کبھی نہیں سوچا۔ (یہ مصرعہ "بنگال سے کوریا تک" کا پہلا مصرعہ ہے۔ ملاحظہ ہو "تشنگی کا سفر")

اس کے بعد صدارتی ایوارڈ یافتہ فلم "اور بھی غم ہیں" میں میرے لکھے ہوئے تھیم سانگ کا بھی حوالہ دیا حالانکہ یہ نظم (تھیم سانگ) "نئی قدریں" (حیدرآباد) کے سالنامہ فروری ۶۳ء میں شائع ہو چکی تھی اور متعلقہ مصرعے پر (INVERTED COMMAS) بھی لگے ہوئے تھے۔ پھر بھی موصوف نے فیض صاحب کے شعر سے اس کا "ربط" دریافت فرمالیا۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا (فیض)

اور میرے مصرعے یوں نقل کیے۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں غمِ دل کے سوا
محفلیں اور بھی ہیں حسن کی محفل کے سوا (شاعر)

میرے فلمی نغمے کا ابتدائیہ تین مصرعوں پر مشتمل تھا۔

محفلیں اور بھی ہیں حُسن کی محفل کے سوا
منزلیں اور بھی ہیں عشق کی منزل کے سوا
" اور بھی غم ہیں زمانے میں غمِ دل کے سوا "

نظم طویل ہے۔ پوری نظم کی فوٹو کاپی "چراغِ بکف" میں منسلک ہے اور میری زیرِ طبع کتاب "شخص و عکس" میں بھی دے دی گئی ہے

ہاں ایک اور دلچسپ اعتراض دکنی زبان کے ایک لوک گیت

کھٹی کیری میں مکھی پڑی

کے بارے میں بھی کیا گیا تھا جب کہ انھیں اس گیت کے اصل بولوں کا قطعی علم نہیں۔ میں

---

۵۱ شمیم احمد نے بھی یہی کام کیا ہے اور ساتھ ہی محسن کا "حق رفاقت" بھی ادا کیا ہے

نے اس عوامی گیت کا مکھڑا لے کر اردو کے محاوروں سے انترون کے مصرعے ڈھالے تھے اور فلم کی سچویشن کے مطابق مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی تھی جیسے

١- کام کا نہ کاج کا، ڈھائی سیر اناج کا

٢- چھوٹا منہ اور بات بڑی۔

٣- عقل بڑی یا بھینس بڑی

٤- باتیں بنانا بڑی بڑی (وغیرہ وغیرہ)

موصوف نے اسے بھی سرقہ قرار دیا اور آخر میں یہ "احسان" فرمایا کہ

"میں جان کر آپ کی ادبی تخلیقات مثلاً "بنگال سے کوریا تک" وغیرہ پر کچھ نہیں لکھ رہا کہ پھر کبھی دیکھا جائے گا۔" (مطبوعہ "کردار" کراچی ۲۱ ستمبر ۶۳ء)

اس کے علاوہ ستمبر ۶۳ء ہی کے "الشجاع" میں بھی ان کا ایک اور مراسلہ شائع ہوا جس میں یہ سراغ دیا گیا تھا کہ میری تین مصرعوں والی نظم "تثلیث" (اس وقت تک "ثلاثی" نام نہیں دیا گیا تھا) خود ان سے یا ظہیر کاشمیری سے یا قمر جمیل سے یا پھر جاپانی صنف سخن ہائیکو سے متاثر ہو کر لکھی جا رہی ہے۔ اس مراسلے کا تفصیلی جواب میں "الشجاع" (نومبر ۶۳ء) کے شمارے میں دے چکا ہوں اور اب "شخص و عکس" میں بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

یہ ہیں وہ مراسلے۔ جن کی روشنی میں الزام آرائی میں "پہل کاری" کا دعویٰ برادر عزیز محسن بھوپالی نے کیا ہے۔ اور "بالو نی" کے الفاظ ہیں

"جن لوگوں نے شاعر کے خلاف لکھا ہے، میرے (محسن کے) ایسے اور میرے ہی (محسن کے) لگتے ہوتے تو اوں کو لگا ہے" (مطبوعہ "کلیم" ۱۴ اکتوبر ۸۳ء)

محسن کا اشارہ قمر جمیل اور شمیم احمد کی طرف ہے۔ مگر قمر جمیل نے تو یہ کہہ کر معذرت چاہ لی کہ

"وہ جو سلیم احمد کے بھائی شمیم احمد ہیں نا۔ انہوں نے اپنے مقالات کا ایک

مجموعہ چھپوایا ہے اس میں انہوں نے حمایت علی شاعر کی شخصیت اور فن پر ایک مقالہ شامل کیا ہے اور بظاہر بت شکن بننے کی کوشش کی ہے۔ میں نے غلطی سے اسے پڑھ لیا۔ اس کے کچھ دھندلے سے نقوش میرے ذہن میں رہ گئے تھے۔ وہ کسی طرح میرے کالموں میں راہ پا گئے۔ قصور وار میں نہیں ہوں بلکہ سارا قصور اس کتاب کا ہے جس نے مجھے گمراہ کیا۔" (مطبوعہ "حریت" ۳، جون ۸۳ء)

میرا خیال تھا کہ برادر عزیز محسن بھوپالی کو بھی اسی مقالے نے گمراہ کیا ہوگا، کیونکہ بقول شمیم احمد یہ مضمون انہوں نے ۶۳ء میں لکھا تھا اور ان کی کتاب کا واحد غیر مطبوعہ مضمون ہے (حوالہ روزنامہ "جسارت" ۲۴، جون ۸۳ء۔ شمیم احمد کا خط)

خیر۔ اب محسن مُصر ہیں کہ یہ پہل انہوں نے کی تھی تو یہ اعزاز انہیں مبارک۔ جہاں تک شمیم احمد کا معاملہ ہے، انھیں آپ نے یوں آئینہ دکھا دیا کہ (نظریاتی اختلافات کے باوجود) میری تعریف میں انھیں کا لکھا ہوا ایک مضمون جو پچیس سال پہلے "نیا دور ۱۲-۱۱" میں شائع ہوا تھا۔ ۲۴، جون ۸۳ء کو دوبارہ (یعنی عین اسی دن جب ان کا گالیوں بھرا خط روزنامہ "جسارت" میں شائع ہوا تھا) "کلیم" میں چھاپ دیا۔ اور وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

اب برادر عزیز محسن بھوپالی کا مضمون "ایک تازہ دم شاعر" کے عنوان سے ۱۴، اکتوبر ۸۳ء کو "کلیم" کے ادبی صفحے میں شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون بھی آج سے گیارہ سال پہلے مجھ پر لکھا گیا تھا۔ اور پہلی بار ۱۵، دسمبر ۷۲ء کو روزنامہ "جنگ" (راولپنڈی) میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں خود محسن نے ایک حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔

"چند کوتاہ نظر شاعروں نے جو بر بنائے حسد ناک لگائے بیٹھے تھے اس مسئلہ (بنگال سے کوریا تک) کو رسائل اور نجی محفلوں میں خوب اچھالا اور شاعر پر سرقے تک کا الزام لگایا مگر قابلِ ذکر نقاد اور ادیب خاموش رہے۔"

ان جملوں کی روشنی میں سارے الزامات کا پس منظر نمایاں ہو جاتا ہے۔ جہاں تک محسن کا میرے خلاف لکھنے کا معاملہ ہے۔ اس کی وضاحت انہوں نے خود اپنے مضمون میں کر دی ہے۔

"میری کتاب "شکستِ شب" پر ان کے (حمایت کے) تبصرے سے غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی یا پیدا کر دی گئی تھی۔ بقول کسے یہ الگ داستان ہے۔ بہر حال جلد ہی ربط و ضبط بحال ہوگیا"

اس میں "جلد" کا لفظ تو محسن نے تکلفاً ہی لکھا ہے۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ مجھے اس تبصرے کا خمیازہ کب تک بھگتنا پڑا۔ خیر، بقول محسن۔ یہ الگ داستان ہے۔ میں صرف اتنا عرض کر دوں کہ اس تبصرے میں مجموعی طور پر میں نے محسن کی شاعری کی تعریف ہی کی تھی۔ البتہ آخری چند سطروں میں زبان کی کچھ غلطیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا تھا کہ اگلے ایڈیشن میں انہیں درست کر لیا جائے تو مناسب ہے۔ اصل عبارت یہ تھی۔

"زیرِ تبصرہ کتاب میں جہاں اچھے شعر اور اچھی نظمیں ملتی ہیں، وہیں زبان اور بیان کے اعتبار سے کچھ کمزور چیزیں بھی نظر سے گزرتی ہیں۔ بعض الفاظ کا تلفظ ان کے ذہن میں صحیح نہ ہونے کی وجہ سے کچھ اشعار، وزن سے خارج بھی ہو گئے ہیں اور بعض مقامات پر لفظ کو صحیح نشست نہ ملنے یا بعض لفظوں کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے ان کا استعمال غلط ہو گیا ہے۔ مثلاً کچھ اشعار انہوں نے یوں لکھ دیے ہیں۔

بے وجہ مسکرانا کیا معنی
بے سبب اشک بھی نکلتے ہیں

ان حقائق کو سامنے رکھ کر
اپنا ہر لائحہ عمل بدلو

یہ اشعار "بے وجہ" اور "لائحہ عمل" کے غلط تلفظ کی بنا پر وزن سے خارج ہو گئے ہیں۔ اسی طرح

آخر اس دشت بلاخیز میں کب تک بھٹکے
دیدۂ شوق غزالوں کی طرح آوارہ

اس شعر میں "دیدۂ شوق" کا کھٹکنا مناسب نہیں ہے۔ اس کی بجائے "نگہِ شوق" ہوتا تو بات بن جاتی۔ "شکستِ شب" میں ایسی خامیاں اکثر جگہ ملتی ہیں جو یقیناً دوسرے ایڈیشن میں دور کر دی جائیں گی۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب قابلِ مطالعہ ہے۔"

یہ تبصرہ میں نے "شکستِ شب" کی تقریبِ رونمائی[1] میں پڑھا تھا مگر "رونمائی کے ماحول کا" خیال کرتے ہوئے خامیوں کی نشاندھی سے گریز کیا تھا۔ البتہ ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے اسی رات پورا تبصرہ نشر ہوا اور بعدازاں "فنون" (لاہور) کے شمارہ اکتوبر، نومبر ۱۹۶۴ء میں بھی پورا تبصرہ شائع کیا گیا۔ اور اب میرے مجموعہ مضامین "شخص و عکس" میں بھی شامل ہے۔ سنا ہے کہ تقریبِ رونمائی کے بعد "سات رنگ" (کراچی) میں بھی اس تبصرے کا توصیفی حصہ[2] شائع ہوا تھا، جسے دیکھنے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا۔ شاید ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے اس کی نقل حاصل کر کے کسی صاحب نے اسے "سات رنگ" میں بھیج دیا ہو۔ واللہ علم۔

خیر۔ بقول محسن جب "ربط و ضبط" بحال ہو گیا تو میں نے بھی ان کے اگلائے ہوئے تمام الزامات کو نوجوانی کا جذباتی ردِّ عمل سمجھتے ہوئے نظرانداز کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء میں ابراہیم جلیس کے زیرِ صدارت جب بزمِ ادب اے ڈی اے (کراچی) نے میرے ساتھ ایک شام منائی تو مسلم ضیائی، مرزا ظفرالحسن، سرور بارہ بنکوی، سحر انصاری، مجیب خیرآبادی اور احمد رئیس جیسے بزرگوں اور دوستوں کی طرح محسن بھوپالی نے بھی میرے بارے میں ایک مضمون پڑھا۔

یہ مضمون "ایک تازہ دم شاعر" اسی تاریخی شام کی یادگار ہے جس میں انہوں نے کھلے دل سے لکھا تھا کہ

---

[1] نومبر ۱۹۶۱ء
[2] "سات رنگ" نومبر ۱۹۶۲ء (اب یہ شمارہ میری نظر سے گزر چکا ہے) اس "توصیفی حصے" کے کچھ جملے محسن نے اپنی کتاب "جستہ جستہ" (مطبوعہ ۱۹۶۹ء) کے صفحہ ۴۷ پر بھی دیئے ہیں۔ لیکن میرا نام نہیں دیا۔ شاعر۔

"حمایت مجھ سے عمر میں دو سال بڑے ہیں اور میں نے اس بڑائی کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔"

میں محسن کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے کسی عنوان سہی ۔ میرا لحاظ کیا ہے اور ان کی اس اعلیٰ ظرفی کی بھی داد دوں گا کہ انہوں نے چند بنیادی سچائیوں کی طرف اشارہ کر کے ایک طرح سے یہ بھی اعتراف کر لیا کہ مجھ پر لگائے ہوئے الزامات "چند کوتاہ نظر شاعروں نے بر بنائے حسد لگائے تھے اور انہیں رسائل اور نجی محفلوں میں خوب اچھالا تھا۔"

اُن دنوں یعنی ۶۳ء سے ۶۵ء کے دوران (جب میں نغمہ نگاری اور مکالمہ نگاری کے ساتھ فلمسازی بھی شروع کر چکا تھا) ادبی اور فلمی رسائل میں میرے خلاف بہت کچھ لکھا گیا۔ میں نے بھی جواب میں اپنے قلم کی نوک تیز کر لی تھی مگر کبھی کوئی ایسی بات نہیں لکھی جو ناشائستہ یا معیار سے گری ہوئی ہو ایسی تحریریں وہی شخص لکھ سکتا ہے جو کینہ پرور ہو اور جس کا دل حسد کی آگ میں پھنکتا رہتا ہو، ظاہر ہے کہ محسن ایسے لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں میں وہ "کرم فرما" شامل ہیں جو بیس سال تک دل میں کدورت چھپائے رہے اور بالآخر جامے سے باہر ہو گئے۔

ایسے ہی کرم فرماؤں کو نظر میں رکھتے ہوئے ۶۵ء میں، میں نے ایک نظم بھی لکھی تھی جو انھیں دنوں ایک فلمی رسالے میں شائع ہوئی تھی۔ اب چونکہ پرانی باتیں تازہ ہو گئی ہیں اس لیے "قند مکرر" کے طور پر آپ کو بھی بھیج رہا ہوں تاکہ ادبی حلقوں کی نظر سے بھی گزر جائے۔ عنوان ہے "واویلا"۔ امید کہ آپ اس خط کے ساتھ نظم بھی شائع کر دیں گے۔ شکریہ۔

آپ کا

حمایت علی شاعر

حمایت علی شاعر (ماخوذ۔ شخص و عکس)

واویلا

(۱۹۶۵ء کی ایک نظم اپنے محسنوں کے نام)

اٹھا سا قیا ساغرِ واژگوں	کہ کچھ سر پھروں کو کریں سرنگوں
کچھ اتنی پلا دے کہ اڑ جائیں ہوش	وگرنہ یہ ہوں گے نہیں یوں خموش
ہر اک اپنے نشے میں مخمور ہے	جو ہے سر کشیدہ ہے مغرور ہے
کسی کو ہے ناز اپنے اشعار پر	کسی کو ہے فخر اپنے افکار پر
کوئی ہے گلوکار خود ساختہ	اڑائے دھنوں میں کوئی فاختہ
کوئی بن گیا ہے کہانی نویس	سمجھتا ہے خود کو قلم کا رئیس
سنا ہے کہ کہتے ہیں سب گویاں	ابوجہل کی ہیں یہ پرچھائیاں
لیے کاغذی پیرہن زیبِ تن	بنے پھر رہے ہیں یہ سب اہلِ فن
یہ شاعر کہیں ایک جاہل جسے	علی کی حمایت نے حاصل جسے
بھلا یوں کوئی مانتا ہے کہیں	تخلص سے شاعر تو ہوتا نہیں
یہ فلموں میں نغمہ نگاری کرے	کسی طرح سے پیٹ اپنا بھرے
اسے کون کہتا ہے نغمہ نگار	یہ جو کچھ ہے صورت سے ہے آشکار
وہ آنچل کہ تھی اس کی پہلی ہی فلم	ایوارڈ اس کو دے بیٹھے اربابِ علم
وہ "آنچل" بھلا کوئی تصویر تھی	سنا ہے کہ شاعر کی تقدیر تھی
کوئی ڈھنگ کا اس میں نغمہ نہ تھا	اگر تھا تو وہ اس کا اپنا نہ تھا
ایوارڈ اس کو دے بیٹھے "اہلِ نگار"	بنامِ عوامِ حقیقت شعار
بڑھا دی یونہی مفت میں آبرو	"تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو"
کوئی بھول سکتا ہے وہ سانحہ	پڑھی تھی جب اس پر بہت فاتحہ
ہر اخبار میں ایک مضمون تھا	کہ شاعر کے اشعار کا خون تھا
بہت اس کا دامن کیا داغدار	سرِ عام اس کو کیا سنگسار
مگر اس میں تھی اتنی غیرت کہاں	وہ کرتا رہا یوں ہی تک بندیاں
کہ اک سال پر دوسرا آ گیا	وہ "دامن" پہ ایوارڈ پھر پا گیا
یہ سب کیا ہے بس مکر و فن ہی تو ہے	سیاست کا طرفہ چلن ہی تو ہے
فقط دوست داری کا انداز ہے	ہمیں ہے خبر اس میں کیا راز ہے

---

۱ احمد رشدی ۲ موسیقیہ خیام ۳ مسعود ۴ اکرحسین ۵ حمایت علی شاعر ۶ نگار ایوارڈ ۷ بہترین نغمہ نگار

جو اس کی کتاب "آگ میں پھول" ہے — گدھے پر وہ اطلس کی اک جھول ہے
خدا جانے کیا صدر کا ہے یہ راز — کیا اس کو انعام[۸] سے سرفراز
نہ انشاء درست اور نہ املا درست — بتائے کوئی اس میں ہے کیا درست
فقط چند لفظوں کا اک ڈھیر ہے — یہاں دن دہاڑے یہ اندھیر ہے
اندھیرے میں چکر چلاتا ہے وہ — اور اپنی دکاں جگمگاتا ہے وہ
سنا ہے کہ اچھا گلے باز ہے — خدا کے کرم سے خوش آواز ہے
یہ شاعر بھی ہے اور اداکار بھی — کوئی ہوگا ایسا ریاکار بھی
کہیں تان پلٹے، کہیں گھن گرج — عجب اس کی سج اور عجب اس کی دھج
غرض اچھا خاصا مداری ہے وہ — جو سوچو تو ہر شے سے عاری ہے وہ
بنانے لگا ہے یہ اک فلم[۹] بھی — اسے فلمسازی کا ہے علم بھی ؟
ہیں ساتھ اس کے دو ایک منکر نکیر — کہ ہیں مکر و فن میں یہ سب بے نظیر
یہ کل کیا تھا اور آج کیا بن گیا — یہ مٹی کا مادھو خدا[۱۰] بن گیا

(اشاعت مکرر۔ روزنامہ "کلیم" ۱۱ رنومبر ۱۹۸۳ء)

(حمایت علی شاعر کے مقبول فلمی نغمے)

۳۳- جب رات ڈھلی، تم یاد آئے (مالا - احمد رشدی)
۳۴- کوئی پروانہ ادھر آئے تو کچھ بات بنے (مالا - احمد رشدی)
۳۵- بھولی دنیا کا جیا لہرائے (آئرین پروین - کورس)
۳۶- تالی بجے بھئی تالی بجے (احمد رشدی - کورس)
۳۷- ایک تارا انگلو تارا (احمد رشدی - کورس)
۳۸- اپنے پرچم تلے، ہر سپاہی چلے (مالا - کورس)
۳۹- ہم نے تو محبت میں تم کو بھی خدا جانا (ناہید نیازی)
۴۰- رایت الصبحا علی قصرا (ناہید نیازی - کورس)
۴۱- مکڑی کڑی میں مکھی پڑی (احمد رشدی - آئرین پروین)
۴۲- جو پیسہ ہم بچاتے ہیں، وطن کے کام آتا ہے (اخلاق احمد)
(برائے نیشنل سیونگس)

---

۶ فلمی اخباروں میں ۱۹۶۳ء ۷ نگار ایوارڈ (بہترین نغمہ نگار) ۱۹۶۳ء ۸ صدارتی انعام ۱۹۵۹ء
۹ لوری ۱۰ "لوری کے خالق" ۹ مارچ ۱۹۶۵ء (اشتہار)

حمایت علی شاعر (تھیم سانگ) (ماخوذ۔ شخص و عکس)

اور بھی غم ہیں

(صدارتی ایوارڈ یافتہ فلم "اور بھی غم ہیں" کا ایک نغمہ)

مطبوعہ۔ نئی قدریں۔ وسالنامہ۔ فروری ۱۹۶۳ء

محفلیں اور بھی ہیں حسن کی محفل کے سوا
منزلیں اور بھی ہیں عشق کی منزل کے سوا
"اور بھی غم ہیں زمانے میں غمِ دل کے سوا"

آنکھ رکھتے ہو تو آؤ یہ تماشا دیکھو
آدمیت کا سسکتا ہوا لاشہ دیکھو

نیلے آکاش تلے خاک میں پلتے ہوئے لوگ
اونچے محلوں کی گھنی چھاؤں میں جلتے ہوئے لوگ
بھوک کی آگ میں چپ چاپ پگھلتے ہوئے لوگ

سوچتے چہروں پہ جمتی ہوئی حالات کی دھول
جسم سوکھے ہوئے جیسے کوئی ویران ببول
میلے دامن میں سمیٹے ہوئے مسلے ہوئے پھول

بھوک کی گود میں افلاس کے گہوارے ہیں
روشنی ڈھونڈتے ہیں جہل کے اندھیارے ہیں

موت کے ہاتھ سے جینے کا صلہ پاتے ہیں
اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا پاتے ہیں

یہ وہ راہی ہیں کہ جن کی نہیں منزل کوئی
یہ وہ موجیں ہیں کہ جن کا نہیں ساحل کوئی
یہ وہ لاشیں ہیں کہ جن کا نہیں قاتل کوئی

علم کے نور سے جو دل ہیں ازل سے محروم
جہل کی گود میں پروان چڑھے جو معصوم
زندگی کیا ہے، خدا کیا ہے انہیں کیا معلوم

کتنے نادان ہیں مر مر کے جیئے جاتے ہیں
زہر کو شہد سمجھتے ہیں پیئے جاتے ہیں

ان کے سینوں کی بھی آگ جو روشن ہو جائے
یہ جہاں ایک مہکتا ہوا گلشن ہو جائے

فلم "اور بھی غم ہیں" کی کہانی، اسکرین پلے اور مکالمے مشہور ادیب اور فلم ساز دانش دیروی کے تحریر کردہ تھے اور اس کا تھیم سانگ حمایت علی شاعر نے لکھا تھا۔ مرکزی کردار (ایک انقلابی شاعر) مشہور صحافی اسد جعفری نے ادا کیا تھا۔ ہدایت کاری کے فرائض اے ایچ صدیقی نے انجام دیئے تھے۔ یہ فلم ایسٹرن اسٹوڈیو۔ کراچی میں بنائی گئی تھی اور ۱۵ اگست ۱۹۶۰ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ "اور بھی غم ہیں" پاکستان کی پہلی فلم تھی جسے صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ (مرتب)

حمایت علی شاعر کے مقبول نغمے

(فلم)

۱- اے حبیب کبریا اے رحمت اللعالمین (نور جہاں)
۲- دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ (نور جہاں)
۳- نہ چھڑا سکو گے دامن (نور جہاں)
۴- کلی مسکرائی جو گھونگھٹ اٹھا کے (نور جہاں)
۵- زندگی کی ہر مسرت آپ کے پہلو میں ہے (نور جہاں)
۶- سوجا میری گڑیا (نور جہاں)
۷- چندا کے ہنڈولے میں (نور جہاں)
۸- خداوندا یہ کیسی آگ سی جلتی ہے سینے میں (مہدی حسن)
۹- نوازش، کرم، شکریہ، مہربانی (مہدی حسن)
۱۰- زیست مشکل ہے اسے اور بھی مشکل نہ بنا (مہدی حسن)
۱۱- اے جانِ وفا، دل میں تری یاد رہے گی (مہدی حسن)
۱۲- تجھکو معلوم نہیں، تجھکو بھلا کیا معلوم (سلیم رضا)
۱۳- جب سے دیکھا ہے تمہیں دل کا عجب عالم ہے (سلیم رضا)
۱۴- کسی چمن میں رہو تم، بہار بن کر رہو (احمد رشدی)
۱۵- واللہ سر سے پاؤں تلک موج نور ہو (احمد رشدی)
۱۶- گل کہوں، خوشبو کہوں، ساغر کہوں، مینا کہوں (احمد رشدی)
۱۷- تو حسیں، تیرا جہاں حسیں (احمد رشدی)
۱۸- تم سا حسیں کوئی نہیں کائنات میں (احمد رشدی)
۱۹- مانا کہ حضور آپ ہزاروں میں حسیں ہیں (احمد رشدی)
۲۰- پیار میں ہم اے جانِ تمنا، جان سے جائیں تو مانو گے (احمد رشدی)
۲۱- دونوں طرف ہے آج برابر خوشی ہوئی (احمد رشدی)
۲۲- یہ خوشی عجب خوشی ہے، اسے جانے کیا زمانہ (احمد رشدی)
۲۳- ماہ لقا- محبوبہ (احمد رشدی)
۲۴- ہمت سے ہر قدم بڑھانا تو ہے پاکستانی (احمد رشدی)
۲۵- ہوا نے چپکے سے کہدیا کیا کہ پھول لہرا کے ہنس پڑے ہیں (مالا)
۲۶- میں نے تو پریت نبھائی سانوریا رے نکلا تو ہرجائی (مالا)
۲۷- اے خدا تو ہی بتا، جرم کیا میں نے کیا (مالا)
۲۸- سامنے رشک قمر ہو تو غزل کیوں نہ کہوں (مسعود رانا)
۲۹- جاگ اٹھا ہے سارا وطن ساتھیو- مجاہدو (مسعود رانا- کورس)
۳۰- ہم بھی مسافر، تم بھی مسافر (مسعود رانا)
۳۱- میں خوشی سے کیوں نہ گاؤں، مرا دل بھی گا رہا ہے (مجیب عالم)
۳۲- چندا کے ہنڈولے میں (ثریا حیدر آبادی)

(باقی صفحہ نمبر ۱۹۶ پر)

(حمایت علی شاعر کے شعری ادب میں تجربے)

(ماخوذ۔ شخص و عکس)

حمایت علی شاعر

تین نظمیں

(ایک مصرع ۔۔۔ ایک نظم)

دوشیزگی

نہ مسکرائے تو گلزار مسکرائے تو پھول

مستقبل

رات کی گود میں سویا ہے ماہتاب کا خواب

عوام

رات سورج کو نگل سکتی ہے تاروں کو نہیں

(ادب لطیف، لاہور فروری ۱۹۵۲ء ———————— (عکس)

(ایک تصویری نظم)

حمایت علی شاعر

اردو اور بابائے اردو

جیسے آغوشِ محبت میں ہمکتی ہوئی ننھی بچی
اپنے بابا کو کسی فکر میں ڈوبا ہوا پا کر — خود بھی
کھیلتے کھیلتے چپ چاپ کسی سوچ میں کھو کر رہ جائے
— اور پھر باپ کی پلکوں پہ لرزتا ہوا اِک قطرۂ اشک
اپنی بچی کے کھِلے پھول سے رخسار پہ گر کر بہہ جائے

یک رکنی غزل

حمایت علی شاعر / ساقی فاروقی

(فاعلاتن)

جو کرم ہے
اک ستم ہے

*

تجھ سے مل کر
آنکھ نم ہے

*

قطرۂ اشک
یم بہ یم ہے

*

تیرا غم تھا
تیرا غم ہے

*

سیرِ حق میں
مے بھی سم ہے

*

کوئے عشرت
شہرِ غم ہے

*

درد کی رات
کوئی دم ہے

(مطبوعہ "لیل و نہار" لاہور ماہ جولائی ۵۹ء)

حمایت علی شاعر

(ایک اضافی بحر)

تاک دھنا دھن

(تین بار)

آج کی شب جیسے بھی ہو ممکن، جاگتے رہنا
کوئی نہیں ہے، جان کا ضامن، جاگتے رہنا

قزاقوں کے دشت میں جب تک قافلہ ٹھہرے
قافلے والو، رات ہو یا دن، جاگتے رہنا

تاریکی میں لپٹی ہوئی پُر ہول خموشی
اس عالم میں کیا نہیں ممکن، جاگتے رہنا

آہٹ آہٹ پر جانے کیوں دل دھڑکے ہے
کوئی نہیں اطراف میں لیکن، جاگتے رہنا

ٹھنڈی ہواؤں کا اے دل، احساں نہ اٹھانا
کوئی یہاں ہمدرد نہ محسن، جاگتے رہنا

راہنما سب دوست ہیں لیکن اے ہم سفرو
دوست کا کیا ظاہر، کیا باطن، جاگتے رہنا

(مطبوعہ — افکار — فروری ۶۰ء)

(ماخوذ — شخص و عکس)

شکست کی آواز

حمایت علی شاعر

(یک کرداری منظوم تمثیل)

کردار

پروفیسر = ہم زاد

(سرگوشیاں۔ قہقہے۔ گنگناہٹ۔ سسکیاں)

پروفیسر کے علاوہ تمام کردار صرف صوتی اثرات سے نمایاں ہوتے ہیں۔(حمایت علی شاعر)

نوٹ:- یہ منظوم تمثیل جو (٦٠٠) مصرعوں پر مشتمل ہے ٦٢ء میں پہلی بار ریڈیو پاکستان حیدر آباد سے سید رضی ترمذی نے پیش کی تھی۔ پوری تمثیل پہلی بار "فنون" لاہور کے اگست ٦٥ء کے شمارے میں شائع ہوئی اور ٨٨ء میں سرسید کالج (راولپنڈی) کے مجلّہ "پاکستانی ادب" (مرتبہ رشید امجد) کی چھٹی جلد (ڈرامہ) کے حصہ اول میں ۴۷ء سے ۸۷ء تک کے منتخب ڈراموں میں شامل ہے۔(مرتب)

حمایت علی شاعر (ایک تمثیلی نظم)

خوف

سہمی سہمی کھل رہی تھی اک کلی
میں نے پوچھا کیا خزاں کا خوف ہے؟
جی نہیں! اک دن خزاں تو آئے گی
پھر؟ سنا ہے اُس نے چپکے سے کہا
اس چمن کا باغباں، گلچیں بھی ہے

ادبِ لطیف سالنامہ ۶۲ء

حمایت علی شاعر (ماخوذ۔ شخص و عکس)

پتھر

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت سنوار دے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت تراش لے تو یہی خدا ہے

(مطبوعہ "نئی قدریں" سالنامہ۔ جنوری، فروری ۱۹۶۲ء)

تثلیث

[میرے خیال میں مختصر ترین نظم تین ہی مصرعوں پر مشتمل ہو سکتی ہے اس لیے میں نے اس نئی صنف کا نام دوہے اور ثلاثیات سے قطع نظر، مثلث کی رعایت سے "تثلیث" مناسب سمجھا ہے۔ شاعر]

شاعری۔ پیغمبری

پھر کوئی فرمان۔ اے ربِّ جلیل
ذہن کے غارِ حرا میں کب سے ہے
فکر ـــــ محوِ انتظارِ جبرئیل

(عکس، نئی قدریں سالنامہ۔ فروری ۱۹۶۳ء)

(ماخوذ۔ شخص و عکس)

اثر فاروقی

تثلیث
(اردو نظم میں نیا تجربہ)

(مطبوعہ ماہنامہ "الشجاع" جون ۱۹۶۳ء)

ادب زندگی کے ہر شعبہ پر صرف اثر انداز ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ انسانی زندگی اور ماحول کو مناسب طریقے پر بدلنے اور اسے ارتقائی منزلوں سے گزرنے میں مدد بھی دیتا ہے۔ اور فطرت کے تقاضوں کی تکمیل میں بھی پوری طرح اعانت کرتا ہے۔ اچھی تخلیقات دوامی ادب کی تخلیق کا باعث ہوتی ہیں۔ اور وہ اچھے ادب کی تاریخ بھی بناتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ادب کو قدامت شکن اور دور جدید کا ترجمان نہ کہا جاتا۔ بقول اختر انصاری "ادب زندگی کی تفسیر بھی ہے اور تنقید بھی۔ وہ زندگی کی ترجمانی کے ساتھ زندگی کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے سماجی، سیاسی اور معاشی ماحول کی صرف عکاسی ہی نہیں کرتا بلکہ اس میں رنگ بھی بھرتا ہے۔" مختصر یہ کہ وہ زندگی سے اثر پذیر بھی ہوتا ہے اور زندگی پر اثر انداز بھی۔ ادب کو زندگی کی تفسیر بنانے کے لئے یہ بات لازمی ہے کہ ہر فنکار اپنے زمانے کے حالات اور واقعات پر نہ صرف گہری نظر رکھے بلکہ وہ اپنے اطراف کے ماحول کو پرکھنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہوں تاکہ اس کے بعد وہ جس ذریعے کو آسان اور سہل سمجھے اسے اپناتے ہوئے موثر طریقے پر احساسات اور جذبات کے ذریعے عوام تک پہنچا سکے اور اگر اس کی بات میں تاثیر نہ ہو تو یہ سمجھ لینا ہوگا کہ وہ اپنے طریقہ کار میں کامیاب نہ ہو سکا جس کے بعد اسے کسی اور راستہ کو اپنانا ہوگا۔ ادب میں تبدیلی، تغیر اور لب لہجہ کی تبدیلی کی خاطر تجربے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بالخصوص اردو ادب کی تاریخ تجربوں سے بھری پڑی ہے۔ ہر دور میں فنکار نے ادب کو زندگی سے قریب کرنے اور اسے عوام کا ترجمان بنانے کی خاطر بعض نئے

باتیں ـــــ اور بعض تجربے کئے۔ بنیادی طور پر ترقی پذیر ادب کے لئے تجربے ناگزیر ہیں۔ ورنہ ادب کی ترقی کی رفتار نہ صرف متاثر ہو سکتی ہے بلکہ اس میں اضافہ بھی نہیں ہو سکتا۔ تجربوں کے دوران اس بات کو پیش نظر رکھنا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تجربے کسی پیش بندی یا محض کسی تبدیلی یا تغیر کی خاطر نہ کئے جائیں۔ چونکہ ایسی حالت میں ادب کے بنیادی اقدار کے متاثر ہونے کا شدید خدشہ ہے۔ اردو نثر میں جس طرح محمد حسین آزاد‘ پنڈت رتن ناتھ سرشار سے لے کر موجودہ دور کے نثر نگاروں نے وقت کے تقاضوں کی خاطر اور اردو ادب میں ترقی یافتہ اصناف کے اضافوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نئے اسلوب نگارش کو اپنایا‘ اسی طرح شاعری میں بھی ہزارہا تبدیلیاں اور تجربے ہوئے ہیں۔ بالخصوص اردو نظم میں اقبال‘ حالی‘ جوش‘ اخترالایمان‘ احمد ندیم قاسمی‘ فیض وغیرہ کو جدت طرازی اور تغیر و تبدیلی کی حد تک امتیازی مقام حاصل ہے۔ اسی طرح غزل میں بھی قدیم شعراء سے لے کر اب تک کئی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں۔ جو ضروری اور ناگزیر تھیں۔ اور جن کے بغیر اردو ادب میں اضافے ممکن نہیں تھے۔ ان تبدیلیوں کو عوام نے بھی قبول کیا اور ان کو اپنی زندگی اور اپنے ماحول کے مطابق پایا۔ اسی بات کا نتیجہ ہے کہ کسی بھی قدیم استاد و شاعر خواہ وہ غالب ہوں یا میر ان کے اشعار کا اثر فوری طور پر ایک معمولی سوجھ بوجھ کے آدمی پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ اور چاہے وہ اس کی تمام نزاکتوں کو بخوبی نہ سمجھ پایا ہو مگر اس کا ذہن و قلب اس کے اثر کو فوری قبول کر لیتا ہے۔ اردو نظم میں تجربوں کے دوران اکثر و بیشتر ایسی باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں جو نہ صرف گنجلک ادب کے پیداوار کا باعث بنی ہیں بلکہ ان کے اثر کو عوام نے بھی کسی طرح قبول نہیں کیا۔ چنانچہ ایسے تجربوں کو وہ حیثیت حاصل نہ ہو سکی جو زندہ اور جاندار ادب کی تخلیق کا باعث بنتے۔ جدید اردو نظم میں میراجی‘ ن۔م۔راشد کے تجربوں نے بلاشبہ اردو نظم کے لئے ایک ایسا میدان مہیا کیا جس میں کامیاب اور خوبصورت آزاد نظموں نے اردو ادب میں جگہ پائی۔ مگر باوجود اس کے اکثر "SOMETHING NEW" کے فارمولے پر عمل کرنے والے شعراء نے اس تجربے کو بھی بڑی حد تک غیر موثر بنا کر رکھ دیا۔ ہمارے بعض نقاد‘ شاعر اور ادیب‘ انگریزی یا کسی

بھی غیر ملکی زبان کے اسلوب، لب و لہجہ سے اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ انہوں نے من و عن ان چیزوں کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ جو یہاں آکر ایک "عیب" کا درجہ حاصل کرگئی۔ حالانکہ یہی بات اس زبان میں خوبصورتی اور ندرت کا باعث ہے لیکن بنیادی طور پر اس بات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ادب کو ترقی پذیر رکھنے اور اس میں اضافوں کے لئے "تجربوں" کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ حال ہی میں حمایت علی شاعر نے اردو نظم میں "تثلیث" کے عنوان سے ایک نئے فارم کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اس خصوص میں حمایت علی شاعر کا ادعا یہ ہے کہ وہ کم سے کم الفاظ میں کہنا چاہتے ہیں کیونکہ اس سائنسی دور میں فنکار کو عوام تک مختصر و مفید کے پیمانے کو اپناتے ہوئے اپنی بات پہنچانی چاہئے۔ اردو ادب میں اس طرح کی کئی مثالیں موجود ہیں کہ اکثر فنکاروں نے کامیاب طریقہ پر مختصراً اپنا ادعا عوام تک پہنچایا ہے۔ خود اردو ادب میں اس کی واضح مثال رباعی ہے۔ اور حالی، جوش و امجد کی رباعیات اردو ادب میں نہ صرف اضافہ کا درجہ رکھتی ہیں بلکہ ان کا انداز بیان کامیاب اور متاثر کن ہے۔ یہی نہیں بلکہ غزل کا ایک کامیاب شعر بھی اس بات کی دلیل بن سکتا ہے مگر تجربوں کے دوران ہم ادب کے بنیادی اقدام کو نظرانداز نہیں کرسکتے۔ جدید اردو نظم کے ساتھ یہ بڑے ٹریجڈی ہے کہ اسے بار بار پڑھنا پڑتا ہے یا پھر اس کے مفہوم سے صرف شاعر ہی واقف ہوتا ہے اور وہ کسی طرح عوام کے پلے نہیں پڑتی۔ جدید اردو نظم میں ابہام اسی بات کا نتیجہ ہے۔ ممکن ہے ہمارے شعراء ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے اس نظریے سے متاثر ہوں "یہ ضروری نہیں کہ شاعر جو کچھ کہے وہ سب کی سمجھ میں آسکے۔" مگر جب پڑھا لکھا طبقہ ان تخلیقات کو سمجھنے سے قاصر ہو تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو نسبتاً کم شعور رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہی طبقہ غالب یا میر کے کسی بھی اچھے شعر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ حمایت علی شاعر اردو ادب میں نئے اقدار کے حامی ہیں اور ان کی تخلیقات اپنے ماحول کی عکاس و ترجمان بھی ہیں۔ اس لحاظ سے اگر وہ رباعی کو پیش نظر رکھتے ہوئے تثلیث کو رواج دینا چاہتے ہیں تو یہ بات صرف اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہے جبکہ اس میں احساسات اور جذبات کو متاثر کرنے والی بات ہو۔ اور اسے عوام قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔ ان کی بعض

ثلیثات پیش ہیں تاکہ رائے قائم کرنے میں آسانی ہو۔

(۱) پتھر

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت سنوار دے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت تراش لے تو یہی خدا ہے

(۲) سایہ

شب میں سورج کہاں نکلتا ہے
اس جہاں میں تو اپنا سایہ بھی
روشنی ہو تو ساتھ چلتا ہے

(۳) شاعری پیغمبری

پھر کوئی فرمان اے رب جلیل
ذہن کے غار حرا میں دیر سے
روح کو ہے انتظار جبریل

ان ثلیثات کے گہرے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں تاثر کی بھرپور چاشنی ہے اور یہ قارئین کو متاثر کرنے کی قدرت رکھتی ہیں۔ ایسی صورت میں شاعر کے اس تجربے کی کامیابی کے امکانات موجود ہیں' مگر صرف شرط یہ ہے کہ اس تجربے کو بھی کسی پابندی یا پیش بندی کی خاطر نہ کیا جائے۔ جس کی وجہ سے اس میں روکھاپن اور بے کیفی پیدا ہونے کے امکانات ہیں۔ حمایت علی شاعر ایک ذہین فنکار ہیں۔ وہ یقیناً اس تجربے کی کامیابی کے لئے راہیں ہموار کرسکتے ہیں۔ اب صرف سوال یہ رہ جاتا ہے کہ یہ تجربہ اردو ادب میں "ضرورت" کی پیداوار ہے یا نہیں۔ یقیناً اردو ادب میں تجربوں نے انحطاط پیدا کیا ہے مگر جہاں تک شاعر کے نکتہ نظر کا سوال ہے' وہ اس تجربے میں ضرورت کو پیش نظر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اسے پوری طرح ثابت نہیں کرسکتے ہیں۔

ورنہ وہ مختصر نظمیں اور قطعات کی تخلیق کو "تثلیث" کے ساتھ ساتھ جاری نہ رکھتے۔
بہرحال حمایت علی شاعر کے اس تجربے کو جس کو مذہبی عقیدے "تثلیث" سے محفوظ رکھنے کے لئے رباعی کے وزن میں "ثلاثی" بھی کہا جا سکتا ہے۔ اسی وقت دوامی یا مستقل شکل حاصل ہو سکتی ہے جب وہ اس قول پر "اچھی تخلیق کا یہ معجزہ ہوتا ہے کہ وہ پڑھنے والے کو نہ صرف متاثر کرتی ہے بلکہ اس میں تغیر پیدا کرتی ہے اور جب کسی شئے یا انسان میں تغیر پیدا ہو جائے تو اس کا لازمی اثر خارجی چیزوں مثلاً ماحول وغیرہ پر پڑے گا۔ اور اگر ایسا نہ ہو اور اندرونی تغیر کے بعد ماحول کو بدلنے کی کوشش نہ کی گئی تو سمجھئے کہ پڑھنے والے نے صحیح طور پر اسے سمجھا نہیں۔ اور لکھنے والا اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا" پوری اترے۔ حمایت علی شاعر اردو نظم کے مزاج اور اس کے ماحول سے پوری طرح واقف ہیں۔ اس لئے تثلیث کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار ان کے فنی خلوص، لگاؤ اور فن سے گہری وابستگی پر ہے۔ بصورت دیگر ان کا شمار بھی ان شعراء میں ہوگا جنہوں نے جدت طرازی کے نام پر مبہم نظموں کی تخلیق کی اور اردو ادب کو گنجلک و ناقابل فہم بنانے کا باعث ہوئے۔

بنتی گئی کہانی

(ڈرامے کی تاریخ میں ایک انوکھا تجربہ)

ریڈیو پاکستان کے قیام کے بعد حیدر آباد کی ادبی زندگی میں ایک نئی توانائی آ گئی تھی۔ ریڈیو پر بھی نئے نئے تخلیقی تجربے کیے گئے۔ اسی سلسلے میں ایک ڈرامہ ایسا بھی لکھا گیا جس کا پلاٹ (کہانی) پہلے سے طے شدہ نہیں تھا۔ ایک گھنٹے کے دورانیئے کی تمثیل کے لیے چار ادیبوں نے قرعہ ڈالا۔ پہلے پندرہ منٹ کا حصہ ڈاکٹر الیاس عشقی کے سپرد ہوا، اور کہانی جہاں بھی پہنچی --- وہاں سے محمد عمر مہاجر نے اسے آگے بڑھایا اور اپنے حصے کی تکمیل کے بعد احمد عبدالقیوم نے اسے کسی نئی منزل پر پہنچا کر چھوڑ دیا --- قرعے کے مطابق چوتھا حصہ، حمایت علی شاعر نے لکھا اور بکھری ہوئی کہانی کو سمیٹتے ہوئے ڈرامے کو اختتام تک پہنچایا۔

اس طرح ریڈیو ڈرامے کی دنیا میں ایک انوکھا تجربہ کیا گیا اور یہ ڈرامہ "بنتی گئی کہانی" کے عنوان سے ۱۴ر جون ۵۷ء کو رات کے سوا آٹھ بجے ریڈیو پاکستان حیدر آباد سے نشر کیا گیا --- ادب کی دنیا میں بھی غالباً یہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا --- کاش اسے شائع کر دیا جاتا۔ یہ ڈرامہ حمایت علی شاعر کے پاس محفوظ ہے (مرتب)

محسن بھوپالی

ایک مراسلہ
(تثلیث یا ثلاثی کے بارے میں)

(مطبوعہ ماہنامہ "الشجاع" کراچی ستمبر ۱۹۶۳ء)

اگست کا شمارہ نظرنواز ہوا۔ شاد عارفی، پروفیسر شور اور وقار خلیل کی تخلیقات بے حد پسند آئیں۔ کوثر چاندپوری کا افسانہ "مہکتا نوٹ" خوب ہے! نظر کامرانی کا ترجمہ بڑا ہی شستہ اور رواں ہے۔ حمایت علی شاعر کا مکتوب بھی نظر سے گزرا۔ اثر فاروقی صاحب نے اپنے مضمون "تثلیث" میں نظم کے فارم کو تبدیل کردینے کا نام تجربہ رکھا ہے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ تین مصرعوں میں نظم کہہ دینا کس لحاظ سے تجربے کی ذیل میں آتا ہے۔ کم از کم شاعر صاحب کو تو ایسی غلط بات کی تائید نہیں کرنا چاہئے تھی لیکن ان کی تائید سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس "ایجاد بندہ" کو تجربہ ہی سمجھ رہے ہیں۔ ادب کے قاری کو اردو میں بہت سی ایسی نظمیں مل جائیں گی جو اس طرح کہے ہوئے بندوں پر مشتمل ہیں۔ مثال کے طور پر ظہیر کاشمیری کی نظم "شکست زنداں" اسی فارم پر کہی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر سے نہیں گزری۔ میری ایک نظم "عشرت یک لحہ" بھی انہی خطوط پر کہی گئی ہے۔۔۔ ممکن ہے کہ وہ ان نظموں سے متاثر ہوئے ہوں اور طوالت سے گریز کرتے ہوئے ایک ہی بند پر نظم ختم کردینے میں انہیں جدت کی جھلک نظر آئی ہو! مجھے اس کا اندازہ یوں بھی ہوا کہ انہوں نے متذکرہ نظم شائع ہونے کے کافی عرصے بعد اس قسم کی نظمیں کہنی شروع کی ہیں! میں یا ظہیر صاحب ہی نہیں بلکہ ان سے پہلے قمر جمیل بھی ایسی نظمیں کہہ چکے ہیں۔ اور بالخصوص صرف تین مصرعوں پر مشتمل نظمیں (میرے اس دعوے کی تصدیق سلیم احمد بھی کریں گے) حمایت علی شاعر صاحب کو یہ حقیقت مان لینی چاہئے کہ اس قسم کی مختصر نظمیں کہنے کا خیال انہیں

ہ محسن بھوپالی کی نظم "عشرت یک لحہ" ان کے "کلیات" میں بھی نہیں ملی۔ اب سنا ہے کہ یہ نظم "نئی قدریں" (جون ۶۱ء) میں شائع ہوئی تھی (مرتب)

جاپانی مختصر نظمیں "ہائیکو" کے ترجمے دیکھ کر آیا ہوگا جو گزشتہ دور میں وقتاً فوقتاً ہوتے رہے۔ کوئی تین سال قبل یوسف جمال انصاری نے اس طرف توجہ دی تھی۔ اور بڑی خوبصورت ترجمے کئے تھے۔ جو ادبی حلقوں میں پسند کئے گئے تھے۔۔ توقع ہے کہ ان حقائق کے پیش نظر شاعر صاحب اپنے "تجربے" کے دعوے پر نظر ثانی فرمائیں گے۔

شاید کہ بہار آئی

حمایت علی شاعر

آج بھی گرچہ غمِ دہر کا عالم ہے وہی
دل سوزاں ہے وہی، دیدۂ پُرنم ہے وہی
روح میں گھلتے ہوئے زہر کا عالم ہے وہی

میں کہاں اور مرے دل کی تگ و تازکہاں
رہ گئی چھنتی ماحول کی زنجیرِ گراں
لے کے آئی مجھے تخئیل کی پرواز کہاں

فکر چُپ چُپ ہے، پریشان نہیں ہے لیکن
ذہن پر بار نہیں آج کا ڈھلتا ہوا دن
شام خاموش ہے، ویران نہیں ہے لیکن

ایسا عالم ہے کہ نظروں میں سماتا ہی نہیں
اور حدِ نگہِ شوق سے جاتا بھی نہیں
اتنی روشن ہے نظر۔ کچھ نظر آتا ہی نہیں

وقت نے کس لئے بے جرعنایت کی ہے
میرے ہونٹوں کو تبسم کی اجازت دی ہے
ایک ناگفتہ تمنا کی حمایت کی ہے

میرا احساس دروں ہے کہ فضا ہے مخمور
ذرہ ذرہ متبسم ہے، ہراک شے مسرور
نشہ و کیف سے ہو جیسے یہ دنیا معمور

دل کا اصرار۔ بہت دور نکل جاؤں کہیں
کوئی وادیِ سمن پوش ہو اور میری جبیں
کسی گل میں نہ سہی۔ خار میں ڈھل جاؤں کہیں

جانے کس قاف کی وادی میں نکل آیا ہوں
پاؤں دھرتی پہ ہیں اور آپ اڑا جاتا ہوں
ہر نظر مجھ پہ ہے۔ کس کس کا میں سرمایہ ہوں

لاکھ پہرے ہوں مگر دل پہ کوئی قید نہیں
اس چمن میں کوئی صیاد نہیں، صید نہیں
زندگی کی اسی منزل پہ کوئی قید نہیں

سبزہ تکتا ہے اٹھائے ہوئے بھیگی پلکیں
ندیاں ہیں کہ بچھائے ہوئے راہیں آنکھیں
اور گھٹائیں کہ مئے ناب کے ساغر چھلکیں

حمایت علی شاعر کی طویل نظم "شاید کہ بہار آئی" کے حصہ اول سے اقتباس (مطبوعہ ماہ نو کراچی فروری ۵۶ء) پھر یہی حصہ "ٹھہرا ہوا لمحہ" کے عنوان سے "ادب لطیف" لاہور (اکتوبر ۵۶ء) میں شائع ہوا۔۔۔ (مرتب)

حمایت علی شاعر (ماخوذ۔ شخص و عکس)

تثلیث یا ثلاثی

(مطبوعہ ماہنامہ "الشجاع" (کراچی) نومبر ۱۹۶۳ء)

"الشجاع" کے ستمبر کے شمارے میں محسن بھوپالی نے اثر فاروقی صاحب کے مضمون[1] "تثلیث" کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے مجھ سے متعلق کچھ ایسے جملے لکھے ہیں جن سے کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ "تثلیث" (جس کا نام اب میں نے "ثلاثی" رکھ دیا ہے) لکھنے کا خیال میرے ذہن میں آج سے دو یا تین سال پہلے آیا تھا اور اس سلسلے کی پہلی نظم "پتھر" میں نے انہیں دنوں کہی تھی۔ سب سے پہلے یہ نظم میں نے قمر جمیل اور صہبا اختر کو سنائی تھی اور بعد ازاں سلیم احمد اور امید[2] بابری کو بھی۔ مکتوب نگار نے قمر جمیل کی جس نظم کا حوالہ دیا ہے، ہو سکتا ہے انہوں نے وہ نظم مجھ سے پہلے کہی ہو لیکن نہ انہوں نے کبھی وہ نظم مجھے سنائی اور نہ میں نے کہیں پڑھی۔ قمر جمیل چونکہ میرے بہت قریبی دوست ہیں، اس لیے مجھے یقین ہے کہ وہ میرے بارے میں کوئی غلط بات سوچیں گے نہ کہیں گے۔ رہی سلیم احمد کی گواہی۔ تو میرے خیال میں یہ بات ہی بڑی مضحکہ خیز ہے اور شاید سلیم احمد کی "طبع سلیم" بھی اسے گوارا نہ کرے، ویسے ان کے بارے میں، میں کسی خوش فہمی میں مبتلا بھی نہیں ہوں۔

مکتوب نگار نے دوسری بات ظہیر کاشمیری اور ان کے ساتھ اپنی کسی نظم کے بارے میں کہی ہے۔ میں ان کی اطلاع کے لیے عرض کرتا ہوں کہ تین مصرعوں کے بند والی نظمیں بہت سے شعرا نے کہی ہیں۔ خود میری اپنی کئی ایسی نظمیں برسوں پہلے ادب لطیف، نقوش اور نیا دور وغیرہ میں چھپ چکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کا حوالہ دینا ضروری ہو۔ اگر مکتوب نگار تھوڑے سے بھی وسیع النظر ہوتے تو ان چھوٹی مثالوں کے بجائے "مثلث" کا حوالہ دیتے

---

[1] مطبوعہ "الشجاع" جون ۶۳ء۔ [2] امید فاضلی

اور الزام آرائی کے انداز سے ہٹ کر علمی انداز میں بات کرتے۔ تیسری بات مکتوب نگار نے جاپانی صنفِ سخن "ہائیکو" کے بارے میں کہی ہے میرے خیال میں یہ مثال ذہنی کم مائیگی کی دلیل ہے، ہمارے یہاں یہ روش عام ہو گئی ہے کہ ہر بات کا جواز اپنے ادب کے بجائے غیر ملکی زبانوں کے ادب میں تلاش کیا جاتا ہے۔ "ہائیکو" کے بارے میں جو کچھ ہمارے علم میں آیا ہے وہ بھی انگریزی کی معرفت۔ اور پھر مکتوب نگار نے تو اسے بھی یوسف جمال انصاری کے ترجموں کے ذریعے جانا ہے خیر، اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ مجھے "ثلاثی" کہنے کا خیال "ہائیکو" سے آیا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آزاد نظم کا خیال عبدالحلیم شرر کے ذہن میں کہاں سے آیا تھا؟ اور پھر یہ نظم ن م راشد سے کیوں منسوب ہو گئی؟ "سانیٹ" کا خیال اختر شیرانی کے ذہن میں کہاں سے آیا تھا؟ اور پھر یہ صنف تخ۔ ضمنی سے کیوں متعلق ہو گئی "قطعات" کیا پروفیسر اختر انصاری سے پہلے کسی نے نہیں کہے تھے؟ پھر کیوں قطعات کو ان کی شاعری کی خصوصیت قرار دیا جاتا ہے؟ اچھا انہیں بھی چھوڑیئے، ہماری شاعری کی تمام اصناف سخن کس زبان سے آئی ہیں؟

اگر میرے ذہن میں بھی (بالفرض محال) "ثلاثی" کا خیال "ہائیکو" سے آیا ہے تو مکتوب نگار اسے منوانے پر کیوں تلے ہوئے ہیں یا اسے "ایجاد بندہ" کہہ کر کوئی الزام تراشنے کی فکر میں کیوں غلطاں ہیں؟

دراصل موصوف کو یہ فکر پریشان کر رہی ہے کہ لوگ اس ایجاد کا سہرا میرے سر نہ باندھ دیں۔ میں ان کا غم غلط کرنے کی خاطر عرض کر دوں گا کہ شعر و ادب کی دنیا میں یہ ایجادیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں، کسے یاد ہے کہ رباعی، غزل وغیرہ کس نے ایجاد کی تھی، بات صرف اتنی ہے کہ جو کامیاب شعر کہے گا وہی زندہ رہے گا، اگر "ثلاثی" کو میں کامیابی کے ساتھ برت سکا تو لوگ مجھے یاد رکھیں گے ورنہ ہو سکتا ہے کسی اور کے سر یہ سہرا بندھ جائے۔ بہر حال فی الحال تو میں کہہ رہا ہوں اور پابندی کے ساتھ اور بہت جلد "ثلاثی" کے نام سے ایک مجموعہ بھی شائع کرنے والا ہوں۔

اچھا۔ اب "ثلاثی" کی اصل حقیقت ظاہر کر دوں، اس کی محرک نہ ہائیکو ہے، نہ ظہیر کاشمیری کی شکست زنداں اور نہ اپنے بعد آنے والے کسی نومشق شاعر کی کوئی نظم "ثلاثی" کہنے کا خیال میرے ذہن میں "رباعی" سے پیدا ہوا۔

رباعی ہماری سب سے مختصر اور شاید سب سے مشکل[1] صنف سخن ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت کم شعرا اس پر طبع آزمائی کرتے ہیں (اس کی ایک وجہ چند مخصوص بحروں کی پابندی بھی ہے) غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ اکثر رباعیوں میں دوسرا مصرعہ اضافی ہوتا ہے اور محض ہیئت کی پابندی کی خاطر کہا جاتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر پہلا مصرعہ ہی ہر طرح مکمل ہو تو دوسرے مصرع کا احسان اٹھانا نہیں پڑے گا اور خیال بھی کم سے کم الفاظ میں سمٹ آئے گا اس طرح میں نے اپنے تئیں الفاظ کی "فضول خرچی" سے دامن بچانے کی کوشش کی ہے اور ان مصرعوں کو ان بحروں کا پابند نہیں رکھا جو رباعی کے لیے مخصوص ہیں، ہیئت میں اس تھوڑی سی تبدیلی سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ بحروں کے انتخاب میں شاعر کو آزادی مل گئی اور دوسرا یہ کہ ایک مختصر ترین صنف سخن وجود میں آئی، جس میں خیال کو اور بھی احتیاط کے ساتھ نظم کرنے کی ذمہ داری شاعر پر عائد ہوتی ہے۔ آخر میں مکتوب نگار نے لکھا ہے، کہ

"توقع ہے کہ ان حقائق (جو حقائق بھی نہیں) کے پیش نظر شاعر صاحب اپنے تجربے کے دعوے پر نظر ثانی فرمائیں گے"، معلوم ہوتا ہے مکتوب نگار کے ذہن میں تجربے کے معنی واضح نہیں ہیں، وہ تجربے کو ایجاد کا ہم معنی سمجھ رہے ہیں، ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ تجربہ ایجاد سے پہلے کے عمل کو کہتے ہیں، تجربہ ہر شخص کر سکتا ہے، کوئی ناکام رہ جاتا ہے اور کوئی کامیاب ہو جاتا ہے، جو کامیاب ہو جاتا ہے ایجاد اسی سے منسوب ہوتی ہے کیونکہ تجربے کی کامیابی ہی کا نام ایجاد ہے۔ کاش مکتوب نگار اتنے صاحب علم ہوتے کہ اتنی معمولی باتوں کو پہلے سے جان لیتے اور میرے تجربے پر حاشیہ آرائی کرنے کی بجائے یہ دیکھتے کہ میں اپنی کوششوں میں کس حد کامیاب ہوں، خیر

ناقدری ارباب زمانہ کا گلہ کیا
آئینے کی قسمت میں ہے پتھر کے سوا کیا

حمایت علی شاعر

1. علامہ اقبال بھی لڑکھڑا گئے۔ (مرتب)

ثلاثی

علامہ نیاز فتح پوری

"......عالیہ (ڈاکٹر عالیہ امام) کے گھر میں آپ نے جو ثلاثیاں مجھے سنائی تھیں۔ ان میں دو تین بہتے ہی اچھی تھیں، خاص طور سے وہ جس میں ذہن کو غار حرا سے تشبیہ دی گئی ہے۔۔۔۔۔ آپ کا یہ صنفی تجربہ مجھے پسند آیا۔ میرے خیال میں اس کا نام "ثلاثی" ہی بہتر ہے۔ "تثلیث" سے ذہن، دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ یہ صنف، اس ہیئت کے ساتھ اردو میں پہلی بار آئی ہے اس لئے آپ ہی سے منسوب ہوگی۔ ویسے قدرے ہیئتی فرق کے ساتھ یہ نام فارسی میں بھی کہیں استعمال ہوا ہے۔ فی الحال یاد نہیں آرہا ہے۔ آپ شعر العجم دیکھ لیں۔"

(ماخوذ۔۔۔ "ایک خط سے اقتباس" مطبوعہ سوویز "مٹی کا قرض" ۷۴ء)

اثر لکھنوی۔۔۔۔(۲۷؍دسمبر ۶۲ء)

"..... پاکستان کے نئے شعرا میں جن کا کلام میں توجہ سے پڑھتا ہوں، ان میں آپ کا نام بھی شامل ہے۔ "ثلاثی" کے بارے میں، میں بھی نیاز صاحب کا ہم خیال ہوں، کبھی تفصیل سے آپ کو لکھوں گا۔ جو "ثلاثیاں" آپ نے مجھے بھیجی ہیں، ان میں "پتھر" بہت خوب ہے۔ ایک ثلاثی میں یہ مصرعہ کھٹکا۔

"پاؤں" زمیں گاڑ کے سوئے فلک چلو

آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔ بدل دیں تو بہتر ہے۔ "چلو" بھی غور طلب ہے۔

(ماخوذ۔۔ "ایک خط سے اقتباس" مطبوعہ۔ سوویز۔ مٹی کا قرض ۷۴ء)

احمد ندیم قاسمی

"...... رہیں حمایت علی شاعر کی "ثلاثیاں" تو مختصر ترین نظم کہنے کی یہ اچھی کوشش ہے اور

اس صنف سخن میں صرف کامیاب غزل گو ہی کامیاب رہ سکتے ہیں۔ غزل کا شاعر ایک مکمل بات دو مصرعوں میں کہتا ہے۔ حمایت نے ان دو میں ایک اور مصرعے کا اضافہ کر کے اسے "ثلاثی" بنا دیا ہے۔ میں جب بھی حمایت کی ثلاثیاں سنتا اور پڑھتا ہوں تو مجھے غزل گو شعراء کے دواوین کے آخر میں درج "فردیات" یاد آتے ہیں۔ یہ وہ شعر ہوتے ہیں جو غزل نہ بن سکے مگر اس آزاد صورت میں بھی وہ قائم بالذات ہوتے ہیں "ثلاثیاں" بھی ایک طرح سے یہی فردیات ہیں۔ حمایت علی شاعر نے اپچ کام لے کر انہیں صنف سخن بنا لیا تو وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اظہار فن کے لئے ہمارے پاس جتنی زیادہ اصناف ہوں گی اتنی ہی اظہار میں وسعت پیدا ہوگی۔"

(ماخوذ ـــــ ماہنامہ "کتاب" لاہور ـــــ فروری ۱۹۷۵ء)

ڈاکٹر سید عبداللہ

"..... حمایت علی شاعر کی "ثلاثیاں" عام مثلثات سے یوں مختلف ہیں کہ ان میں رباعی کی طرح ایک مصرعہ برجستہ ایسا موجود ہے جس پر Stress دینے سے ثلاثی کا مرکزی نکتہ سامنے آجاتا ہے۔ لیکن فنی ذوقیات کے عتبار سے ثلاثی سے ایسا نکتہ برامد کرنا۔ جو چونکا دینے والا ثابت ہو۔ بہ مقابلہ رباعی مشکل ہوتا ہے۔"

(ماخوذ۔ سالنامہ "اوراق" لاہور۔ اپریل، مئی ۱۹۷۵ء)

مرزا ادیب

حمایت علی شاعر نے اردو ادب کو زندہ و پائندہ شاعری دی ہے۔ بہت ہی خوبصورت نظموں کا بہت خوبصورت شاعر۔

شاعر کی بڑی مختصر نظم کا عنوان ہے "زاویہ نگاہ" مگر یہ زاویہ نگاہ پتھر ہی کے کردار' سے متعین ہوتا ہے۔ اس لئے اس نظم میں پتھر کی بڑی اہمیت ہے۔

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت تراش لے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت نواز دے تو یہی خدا ہے

کتنی بڑی، کتنی واضح اور کتنی گہری حقیقت۔ ایک ایک لفظ بولتا ہوا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر بلاغت کی انتہائی بلندیوں کو چھو لیتا ہے۔ اس نظم کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ شاعر نے جس انداز سے انکشاف حقیقت کیا ہے اس کی وضاحت کے لئے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔

شاعر نے تین مصرعوں میں جو بات کہہ دی ہے اس کی متحمل طویل سے طویل نظم بھی نہیں ہو سکتی۔

یہ نظم ''ثلاثی'' کی تیکنک میں ہے۔ اور یہ طرز خاص ایجاد ہے حمایت علی شاعر کی۔ مثلث ہمارے یہاں رائج ہے۔ مثلث ایک ایسی نظم ہوتی ہے جس کے ہر بند میں تین مصرعے ہوتے ہیں مگر شاعر نے تین مصرعوں کو پوری نظم بنا دیا ہے۔

ہمارے ہاں آجکل ہائیکو کا بڑا زور ہے۔ میں اس وقت صرف یہی بات عرض کروں گا کہ کوئی صنف ـــــ دنیا کے کسی بھی ادب سے آئے، اگر وہ ہمارے شعری مذاق سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت سے محروم ہے تو وہ ہمارے ادب میں اجنبی ہی رہے گی۔ اجنبیت سے اس صنف کا وہی حال ہوگا جو سانیٹ کا ہوا ہے۔ ہائیکو کو ہمارے شعری ادب کا حصہ بننے کے لئے ہمارے شعری مزاج کا حصہ بننا پڑے گا اور اس مزاج آفرینی کا انحصار ان شاعروں پر ہے جو ہائیکو کی طرف بطور خاص توجہ کر رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ''ثلاثی'' ہماری اپنی ایک صنف سے پھوٹی ہے اور نتیجتاً ''ہماری اپنی ہے۔ شاعر نے اس کی وساطت سے جو تخلیقی تجربہ کیا ہے وہ بہت کامیاب اور بہت موثر ہے۔

ماخوذ

(اذکار و افکار)

اردو شاعری میں ''پتھر'' کا استعارہ

(مطبوعہ ''نوائے وقت'' لاہور۔ ۷ر ستمبر ۸۵ء)

سنہ ۱۹۵۶
جون، جولائی

شعور

خالدہ اسما
حلیمہ حسنہ
اور
حمایت علی شاعر نے ترتیب دیا
آذر زوبی نے سنوارا
مجیب یوسف نے لکھا

سالانہ دس روپے	حلقۂ ارباب شعور روبرو نیاز منزل اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن	فی جلد [illegible]

(شعور کا پہلا شمارہ)

(عکس سرورق) شعور (۵-۶) حیدرآباد ۱۹۵۷ء

شمیم احمد

آگ میں پھول

حمایت علی شاعر کا پہلا مجموعہ کلام

(مطبوعہ "نیا دور" (۱۱-۱۲) کراچی ۵۸ءیا ۵۹ء)

شاعری کی کوئی ایک تعریف متعین کرنے والے حضرات مجھے خاصے مضحکہ خیز چیز معلوم ہوتے ہیں' ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ حضرات زندگی کی کوئی ایک تعریف متعین کرنے پر مصر ہوں۔ یہ کوئی ایسی بری بات بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ کچھ اس طرح سوچتے ہیں کہ ہم نے جس طرح زندگی بسر کی ہے وہی اصل زندگی ہے' اول تو ایسی زندگی کسی نے بسر نہیں کی اور اگر بسر کی بھی ہے تو وہ زندگی فضول سطحی اور کم سواد ہوگی۔ یہ نقطہ نظر احساس کمتری کا نتیجہ ہے یا انا کا' یہ تو نفسیات والے جانیں مگر ایسے لوگ زندگی کو صرف ایک ہی رخ سے دیکھتے ہیں۔ یہ ایک رخی احساس اگر اجتماعی طور پر اثر انداز ہو جائے تو ادب اور شعر کی بات تو بعد کی ہے' عوامل زندگی کے ساتھ ساتھ تہذیب بھی زوال پذیر ہونے لگتی ہے۔

مجھے کیونکہ بات شاعری تک ہی رکھنی ہے لہٰذا میں یہ کہوں گا کہ ہمارا نیا شعری ادب بھی کسی ایک ہی رخ کا شکار ہو گیا ہے۔ ۱۹۳۶ء کے بعد جو شاعری اجتماعی طور پر تخلیق ہوئی تھی اس میں ایک ہی رخ اور ایک ہی نظریہ کی کارفرمائی ملتی ہے۔ یہ نظریہ کچھ اس طرح مقبول ہوا تھا کہ پوری نسل نے زندگی کو ایک ہی رخ سے دیکھنا شروع کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس تیزی سے یہ نام شہرت کی انتہا تک پہنچ گئے تھے اسی تیزی سے زوال کا شکار بھی ہو گئے وجہ اس کی وہی تھی کہ زندگی بحیثیت مجموعی ان کے سامنے نہیں رہی تھی اور یہ نظریہ سازی کا کھیلا ترقی پسند شاعر تو الگ رہے اقبال تک کر گئے ہیں دونوں کا نتیجہ ایک ہی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

نہ جانے یہ بات لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ بڑھتی ہوئی زندگی اپنے لیے نئے نئے زاویہ نظر اور راہیں تلاش کرتی ہے نہ کہ کوئی نظریہ زندگی بناتا یا بگاڑتا ہے۔ دنیا کی تمام تحریکیں اور مذاہب زندگی کی اس بدلتی ہوئی کروٹ سے ظہور میں آتے تھے اور ۱۹۳۶ء والی نسل کا حشر تو آپ کے سامنے ہے۔ بات مجھے اتنی کہنی ہے کہ شاعری میں کوئی مخصوص طرز فکر اور نظریہ سازی اس کی عمر کو گھٹاتی ہی ہے بڑھاتی نہیں کیونکہ جہاں زندگی نے کوئی دوسرا رخ اختیار کیا پہلا نظریہ زمین بوس ہو جاتا ہے اور بیسویں صدی میں تو زمانے کو گویا پر لگ گئے ہیں۔ اب اگر کوئی شاعر زندہ رہے تو وہی رہے گا جس نے زندگی کو ایک رخ سے نہ دیکھا ہو۔ بلکہ زندگی کے متنوع پہلوؤں پر اس کی گرفت مضبوط ہو۔ اس نے زندگی کو کسی ایک اخلاقی یا معاشی زاویہ نظر سے نہ قبول کیا ہو۔ بلکہ اس کی اچھائیوں اور برائیوں کے ہر امکان کو قبول کیا ہو اور یہ قبول کرنے والا رویہ پٹے ہوئے سپاہی کا رویہ نہ ہو بلکہ وسعت قلب و نظر سے پیدا ہوا ہو۔

جفائیں دیکھ لیاں کج ادائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

مجھے نہیں معلوم کہ میں اپنا ماضی الضمیر ظاہر کرسکا ہوں یا نہیں۔ لیکن ترقی پسند شاعری کی ساری رسوائی کا راز اسی میں پنہاں ہے اس تمہید کے بعد حمایت علی شاعر پر لکھتے ہوئے کچھ ڈر رہا ہوں کیونکہ ان کا شمار بھی ترقی پسند گروپ میں ہوتا ہے جبکہ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ حمایت علی شاعر نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اس کو اسی طرح من وعن شعر میں منتقل کردیا ہے۔ اس نے کسی نظریہ کی چڑھتی ہوئی موج کا ساتھ نہیں دیا ہے بلکہ وہ اب بھی ہر اعتبار سے اس دور سے گزر رہا ہے جس سے ۳۶ء کے فوراً بعد کی نسل گزری تھی اور یہ بات اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اسے معلوم ہے کہ شاعری صرف نظریہ ہی نہیں کچھ اور بھی ہے اور اس نے حتی الامکان اس بات کی کوشش کی ہے کہ اپنی شاعری کو نظریہ کی ثقالت سے بچاکر ہلکے اور نرم الفاظ کی شاعری بنادے۔ وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے اس کا صحیح فیصلہ تو قارئین ہی کرسکیں گے لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی فطرت کی

معصومیت اور سچائی اس کے اشعار میں پوری طرح جھلکتی ہے اور یہی اس کی وہ معصومانہ اور بے لاگ فطرت ہے جس نے اس کو اب بھی ترقی پسند گروپ سے متعلق کر رکھا ہے کیونکہ اس کی زندگی جس طرح گزر رہی ہے اور جس طرح معاشرے کے ایک حساس اور پر خلوص فرد کو محسوس کرنا چاہیے' اس نے محسوس کیا ہے کہ زندگی کے دکھ درد کا تھوڑا بہت ازالہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو اسی گروہ کی ہمنوائی ہے۔

اقبال کی شاعری جس نے بیسویں صدی کی طرف سے پیٹھ موڑ رکھی ہے' میراجی اور ن-م-راشد کی شاعری جس نے زندگی کا مفہوم اعصابی تشنج سمجھ رکھا ہے' اس جیسے مزاج کے آدمی کے لیے ایک طوق لعنت بن جاتی۔ وہ بیسویں صدی کا ایک حساس ذمہ دار اور ہمدرد نوجوان ہے جو خود کو اسی معاشرے کا ایک فرد سمجھتا ہے جو سڑ رہا ہے' مر رہا ہے اور اس صورت میں اس کے لیے بہترین لائحہ عمل یہی تھا۔ ترقی پسند شاعری کے زوال کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ وہ نئے زمانے کے مطابق خود میں تبدیلیاں پیدا نہیں کر سکی۔

حمایت علی شاعر کے پاس ایک لہجہ ہے بہت شفاف اور معصوم' جس میں کوئی لاگ لپٹ نہیں' کاریگری نہیں' شہرت کا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں۔ گو کہ اس کی فطرت بہت محدود اور جذبات میں گہرائی نہیں لیکن پھر بھی اس نے زندگی کو جس طرح دیکھا ہے اس کو پیش کردیا ہے' اس کے لہجہ سے کسی نظریہ بازی کا احساس نہیں ہوتا اور نہ وہ اس کا مظاہرہ کرتا ہے۔ نظریہ کی انتہا پسندی سے بچنے کی جو شعوری کوشش اس کے یہاں ملتی ہے اس نے اس کے کلام کے ایک بڑے حصہ کو بیانیہ اور منظر نگاری کے قریب قریب پہنچا دیا ہے اور کہیں کہیں وہ خطابت تک پہنچ جاتا ہے لیکن پھر بھی بحیثیت مجموعی اس کی شاعری میں ایک حسن ہے۔

قومی و ملکی مسائل اور زندگی کے عام حالات میں اکثر غیر معمولی واقعات پیش آتے ہی رہتے ہیں' شاعر کی حساس فطرت اس کو نظم کی گرفت میں لے آتی ہے جو شعری تسکین سے زیادہ وقتی اہمیت کی غماز ہوتی ہے اور یہ ہر صورت اس کی شعری صلاحیتوں کے لیے نقصان دہ ہے۔

میں نے پچھلے سالوں سے دیکھا ہے کہ اچھے خاصے شاعر اپنے کلام کے مجموعے پیش کرتے ہی ذہن سے محو ہونے لگتے ہیں کہیں حمایت علی شاعر کے ساتھ بھی یہی نہ ہو۔ یہ زمانہ ادب کے لیے بڑا پر آشوب ہے لیکن یہ تو پڑھنے والوں کے مزاج سے تعلق رکھتا ہے کہ وہ کسے یاد رکھیں گے اور کسے بھول جائیں گے۔ آخر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ حمایت علی شاعر کی شاعری میں وہ خلوص ہے جس سے آپ محض اس لیے ضرور متاثر ہوں گے کہ اس میں اس دور کی تلخیاں، ناکامیاں، ذاتی دکھ درد اور زندگی کی زہرناکی ملتی ہے اور یہی خلوص اس کی کمزوری بھی ہے اور اس کا حسن بھی۔

سخن در سخن

خامہ بگوش کے قلم سے

لے طفل خود معاملہ قد سے عصا بلند!

(شمیم احمد کے ایک اور مضمون سے اقتباس)

"......بھائی، یہ ایک ایسا ہی تبصرہ تھا جسے اب بھی "نیا دور" میں تبصرے کے لئے آنے والی ہر کتاب پر شائع ہوتے ہیں اور جس کے چند نمونے خود "برش قلم" میں بھی موجود ہیں اور ہم نے ان کی تالیف قلب کے لئے ان کو ایک جدید ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا۔ یہاں ہم اتنی وضاحت اور کردیں کہ ۱۹۵۶ء تک ہم بقول شاعر..... کے محض میٹرک اور ادیب فاضل تھے جس کو...... ام۔اے کی ڈگری...... والے شاعر وادی مہران ہماری جہالت کا زمانہ قرار دیتے ہیں اور ہم کو یہ بھی اعتراف ہے کہ ہم خود بھی اس وقت تک ترقی پسندی کی جہالت سے نہیں نکل سکے تھے۔ گویا دو دو جہالتوں کا شکار تھے......"

(ماخوذ---- روزنامہ "جسارت" کراچی۔ ۲۴ر جون ۸۳ء)

شمیم احمد کا سال پیدائش بحوالہ کتاب "۲ + ۲ = ۵" (۱۹۳۳ء) ہے۔ ۵۷ء میں وہ رسالہ "شعور" میں حمایت صاحب کے معاون مدیر اور خود ادب میں نووارد تھے۔ (مرتب)

سلطان جمیل نسیم

ایک خط

اختر انصاری اکبر آبادی کے نام

(مطبوعہ ''نئی قدریں'' حیدر آباد ستمبر ۶۳ء)

محترم اختر صاحب تسلیم!

عرصہ دراز کے بعد ''نئی قدریں'' کا جولائی اور اگست کا خاص نمبر ملا اس عنایت کا شکریہ۔ ''نئی قدریں'' میں بڑی خوشگوار تبدیلیاں محسوس کیں۔ آپ کی محنت کا تو میں ہمیشہ معترف رہا ہوں اور اب آپ کا رسالہ بھی شاہد بن گیا ہے ان دونوں شماروں میں بہت سی چیزیں پڑھنے کے قابل ہیں۔ لیکن اس خط کے لکھوانے والے تین خط ہیں۔

شمیم احمد صاحب سے ایک مرتبہ حیدر آباد ہی میں میرے بزرگ اور محترم دوست حمایت علی شاعر صاحب نے تعارف کرایا تھا۔ لیکن وہ اتنی سرسری سی ملاقات تھی کہ میرے ذہن پر اس کا سایہ باقی رہ گیا ہے۔ شمیم صاحب کے ذہن میں تو یہ سایہ بھی نہیں ہوگا۔ یہ بات اس زمانے کی ہے جب حمایت علی شاعر صاحب حیدر آباد سے ''شعور'' نکالتے تھے اور ان کا اور شمیم احمد صاحب کا نام ادارہ میں ایک ساتھ بلکہ تلے اوپر شائع ہوتا تھا۔

کریم الدین احمد سے میں بالکل واقف نہیں ہوں اور نہ کسی ادبی رسالے میں ان کا نام دیکھا اور نہ ادبی محفلوں میں سنا۔ ان خطوط سے معلوم ہوا کہ موصوف ایم۔اے پاس ہیں‘ اور کسی کالج میں لیکچرار ہیں مگر خود کو پروفیسر کہلوا کر خوش ہوتے ہیں۔

حمایت علی شاعر صاحب کے متعلق کیا عرض کروں۔ میں تو ان کا معتقد ہوں۔ ان تینوں حضرات کے خطوط پڑھے۔ اور یہ خط لکھنے بیٹھ گیا۔

کریم الدین احمد نے اپنے خط میں گالیاں دی ہیں۔ شرفاء سرِعام گالی سے پرہیز کرتے ہیں اس لئے میں ان کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

ایک بات ذہن میں آئی۔ کریم الدین احمد، شمیم احمد اور حمایت علی شاعر۔ یہ ایک تثلیث بنی یا نہیں۔ مگر اس تثلیث کا ایک زاویہ (یعنی کریم الدین احمد) مجھے زاویہ ہی نہیں معلوم ہوئے اس لئے تیسرا زاویہ سلیم احمد کی شاعری کو بنالیا جائے تو بہتر ہے۔

سلیم احمد ہوں یا شمیم احمد --- انتظار حسین ہوں یا پیرومرشد عسکری صاحب۔ ان کے متعلق ایک بات ضرور کہی جائے گی اور ان کا ہر مخالف یہ بات بلا تکلف کہے گا کہ یہ سب ذہین ہیں اور بلا کے ذہین --- ایک ذہین بچے کو اگر حالات وماحول سازگار میسر نہ آئیں تو غلط راہوں میں قلابازیاں کھانے لگتا ہے اس لئے اگر سلیم احمد کو ایسے اشعار پر

کس انجمن گل کی لگن ہے کہ چمن میں
نکلتا ہی نہیں پاؤں نسیم سحری کا

کوئی درخو اعتنا نہ سمجھے تو ظاہر ہے ان کی ذہانت --- اور نام ونمود کی ہوس ---- انہیں "چرکین" کے برابر لا کھڑا کردے گی۔

میرے نزدیک ایک سلیم احمد کا کوئی قصور نہیں ہے قصور ان ایڈیٹروں کا ہے جو ادب کے نام پر "واہی وہانوی" کی سی چیزیں چھاپ رہے ہیں اور فروخت کررہے ہیں۔ آج کے ذہن کو سلیم کی ذہنی گندگی اس وقت خراب کردے گی جب ان کا فرمایا ہوا، ادب کے نام پر پڑھنے کے لئے دیا جائے گا۔

کسی زمانے میں جاسوسی ناولوں کی بھرمار ہوتی تھی پھر "واہی وہانوی" کی قسم لکھنے والے پیدا ہوگئے مگر ان کا بروقت علاج کرلیا گیا۔ لیکن سلیم احمد صاحب اب جو کچھ ادب کے نام پر دے رہے ہیں۔ وہ گندے انڈے ہیں۔ لیکن ان گندے انڈوں کو جو مدیران کرام پڑھنے والوں کے سر پر پھوڑ رہے ہیں وہ زیادہ مجرم ہیں۔ سلیم احمد صاحب کی شاعری کے بارے میں محترم حمایت علی شاعر نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے میں اس سے حرف بحرف متفق ہوں۔

شمیم احمد صاحب نے اپنے خط میں جلدی جلدی دو چار الزام جناب حمایت علی شاعر صاحب پر لگادیئے۔ ایک دو تضحیک آمیز جملے عتیق احمد صاحب پر کسے۔ اور خط ختم کردیا۔

شمیم احمد ---- اگر اپنے بڑے بھیا کی پیروی کرنا چاہتے ہیں تو بات دوسری ہے۔ ورنہ

ان کو سنجیدگی کے ساتھ ادبی موضوعات پر قلم اٹھانا چاہئے۔ ان سے ہم بہت سی توقعات وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ذاتیات سے بلند ہو کر محض ادبیات پر خامہ فرسائی کریں تو زیادہ بہتر ہے۔ یوں کسی کی پگڑی اچھال دینے سے سستی شہرت ضرور مل جاتی ہے مگر یہ شہرت دیرپا نہیں ہوتی بلکہ یہ مشہوری تو ایسی ہوتی ہے جیسی ہمارے آج کل کے شاعر جدید نظم "تخلیق کرکے" حاصل کررہے ہیں۔

سلیم احمد کی شاعری، شمیم احمد اور حمایت علی شاعر صاحبان کے خطوط سے ذہن میں ایک تثلیث اور بنتی ہے (تثلیث حمایت علی شاعر صاحب کی زبان میں اور "ثلاثی" مدیر فنون کی رائے میں) بہرحال ایک مثلث بنا ہے۔ جس کا ایک زاویہ ہے بقراط، دوسرے کا نام ادب رکھئے اور تیسرے کو ڈگری کہہ لیجئے۔ یہ مثلث ہمارے آج کل کے ادب کا ترجمان ہے۔

اگر آدمی بقراط ہے اور ادب کے نام سے کچھ لکھتا ہے اور اس کے پاس ڈگری نہیں ہے تو وہ صرف زاویے بنا سکتا ہے۔ مثلث یا تثلیث یا ثلاثی قسم کی کوئی چیز نہیں بن سکتی۔ محترم حمایت علی شاعر نے بھی ڈگری لینے کے بعد ہی تثلیث تخلیق کی ہے۔

مثال کے طور پر شمیم احمد یا سلیم احمد کی تحریر اس زاویے کی روشنی میں ادبی تثلیث نہیں بنتی اس لئے کہ محترم حمایت علی شاعر یا جناب کریم الدین احمد کے خیال میں یہ لوگ دسویں پاس ہیں، یعنی ڈگری سے محروم چنانچہ وہ ادیب یا شاعر نہیں ہوسکتے۔

اس کسوٹی پر پرکھئے تو کریم الدین احمد صاحب کا خط ادب کا شاہکار ۔۔۔ حمایت علی شاعر صاحب کے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ بلکہ ہر حرف ادبی شہ پارہ بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ ادب میں دسویں کلاس پاس لوگوں کا گزر نہیں۔ یہ کریم الدین احمد کا فرمان ہے۔ جسے حمایت علی شاعر کی تائید حاصل ہے۔ اس لئے کہ کریم الدین احمد پروفیسر ہیں اور حمایت علی شاعر صاحب ایم۔اے کے طالب علم۔ اور میں حمایت علی شاعر صاحب کا معتقد بھی اور مقلد بھی۔ جب وہ کریم الدین احمد کے خیال سے متفق ہیں تو میری کیا مجال کہ میں اتفاق نہ کروں۔ مگر جس طرح خدا کے وجود کے متعلق آدمی غور و فکر کرتا ہے اور ذہن میں ہزار سوالات جنم لیتے ہیں۔ اسی طرح جب میں حمایت علی شاعر صاحب سے متفق ہونے کے باوجود ان کی تائید سے

اتفاق کرتا ہوں تو بہت سے لاجواب قسم کے سوالات ذہن میں بیدار ہوتے ہیں' ان سوالات کو میں نے لاکھ تھپک تھپک کر سلادینے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہا بہرحال کوشش کروں گا کہ وہ سوال ذہن سے خارج ہو جائیں۔

شمیم احمد صاحب نے محترم حمایت علی شاعر پر سنگ الزام اور تیرِ دشنام کی جو بارش کی ہے اور ان پر ادھر ادھر سے مصرعے اچک لینے کی جو تہمت لگائی ہے وہ بیکار محض ہے اس لئے کہ محترم حمایت علی شاعر کا مجموعہ جب "زیور طبع" سے آراستہ ہوا تھا اس وقت موصوف دسویں پاس تھے۔ اور اب ڈگری لینے کے بعد جو ان کے خیالات میں تبدیلی رونما ہوئی ہے' اس تبدیلی کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جناب شاعر اپنی اس شاعری کو جو ایک دسویں پاس شاعر کے ذہن کا نچوڑ ہے اپنے دامن سے جھٹک کر کنارہ کرلیں گے۔

اختر صاحب --- میں جناب حمایت علی شاعر کا معتقد اور مقلد خوامخواہ نہیں ہوں۔ میں نے موصوف میں بڑی خوبیاں دیکھی ہیں' سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ وہ دوربیں ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ شاعری جو ان کے مجموعے میں "آگ میں پھول" کی صورت بکھری ہے اس پر بھی یار لوگ ادھر ادھر سے خیال یا مصرعہ اچک لینے کا الزام لگاتے ہیں۔ حمایت صاحب کے ذہن میں یقیناً یہ بات ہوگی کہ ایک نہ ایک دن اس شاعری کو "ڈگری برو" کرنا ہے۔ اسی لئے انہوں نے ادھر ادھر سے آنے والے خیال اور مصرعوں پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ اب وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں (علاوہ فلمی شاعری کے) اس پر شمیم احمد صاحب ایسا کوئی الزام نہیں لگاسکتے۔

. میں چونکہ معتقد بھی ہوں اور مقلد بھی' اس لئے کہ دوربینی --- کچھ کچھ میرے حصے میں بھی آگئی ہے۔ مثلاً آج سے چار سال پہلے حمایت علی شاعر صاحب نے میرے لئے ایک تعارفی مضمون (میرے ہی اصرار پر) لکھا تھا اس زمانے میں حمایت علی شاعر صاحب کے پاس دسویں کلاس کے سرٹیفکیٹ کے علاوہ شاید کوئی ڈگری نہیں تھی۔ چنانچہ وہ تعارفی مضمون میں نے اس آس میں سینت کر رکھ دیا ہے کہ کبھی تو حمایت علی شاعر صاحب ڈگری یافتہ شاعر کہلائیں گے اس وقت وہ مضمون اشاعت کے لئے نکالوں گا۔ لیکن میری بدقسمتی کہ اب جو

تلاش کرتا ہوں تو کہیں ملتا ہی نہیں۔ بہرحال حمایت علی شاعر کا خط پڑھ کر جہاں اور بہت سی باتیں ذہن میں تقلید کے لئے محفوظ کی ہیں وہاں یہ ارادہ بھی کرلیا ہے کہ فرسٹ ایئر میں داخلہ لے کر پڑھائی شروع کردوں شاید کبھی ڈگری مل جائے۔ یعنی ادب میں برتری۔ میرؔ غالبؔ، نظیرؔ، آتشؔ، مصحفیؔ، جامیؔ، آزاد وغیرہ وغیرہ یہ سب دریا برد ہونے والے ہیں اس لئے کہ یہ سب جاہل مطلق تھے۔ غیر ڈگری یافتہ۔ دو کوڑی کے شاعر۔

اختر صاحب --- آخر میں آپ سے ایک بات اور پوچھوں گا کہ یہ کریم الدین احمد صاحب کس کالج میں پروفیسر ہیں؟ یہ میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ مجھے داخلہ لینا ہے، اس کالج سے گریز کروں۔

اتنا طویل خط لکھنے کے بعد یہ بات کہنی کہ اس قسم کے خطوط کی اشاعت سے پڑھنے والوں کا وقت "نئی قدریں" کے صفحات اور لکھنے والوں کی صلاحیت کا زیاں ہو رہا ہے۔ کچھ مسخرہ پن سا معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال اتنی گزارش ضرور ہے کہ آپ ان لوگوں سے جو آپس میں ہی دست و گریباں ہو رہے ہیں کسی ٹھوس ادبی موضوع پر لکھوایئے تاکہ پڑھنے والوں کو کچھ تو ملے --- اس گالم گلوچ سے تو لکھنے والے بھی کوئی انفرادیت قائم نہیں کرسکتے، ذاتی تسکین کی بات دوسری ہے۔

باقی خیریت

آپ کا --- سلطان جمیل نسیم

مورخہ ۹ ستمبر ۶۳ء

(ٹنڈو آدم)

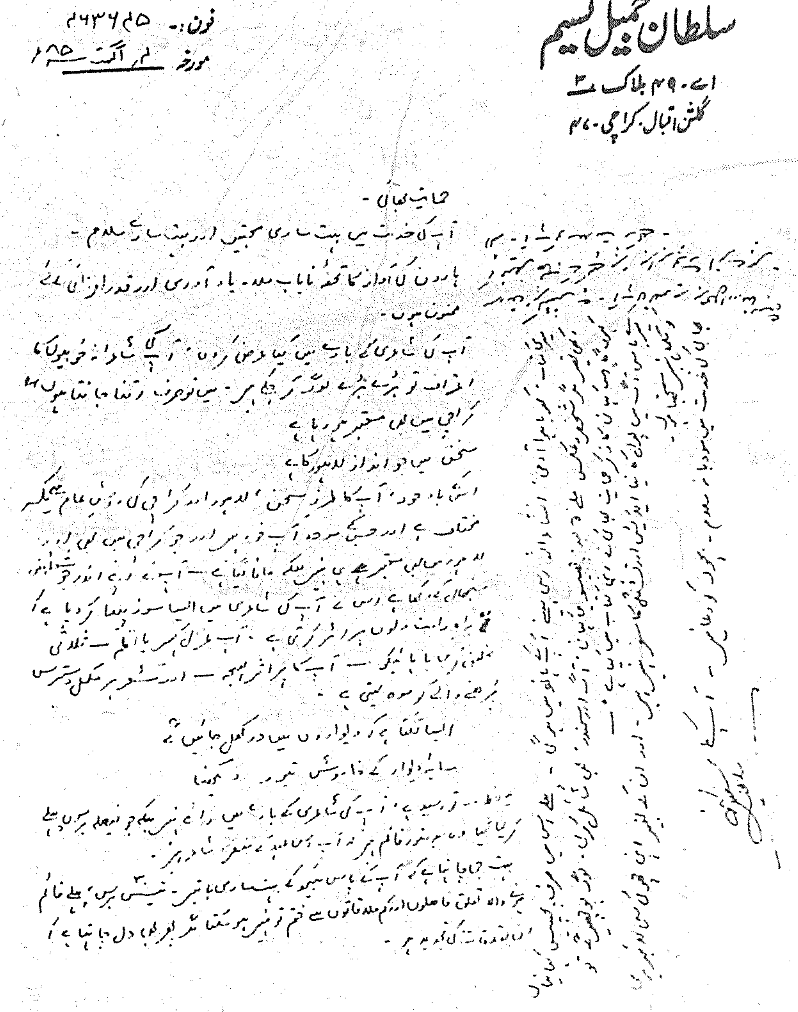

سلطان جمیل نسیم
اے-۴۹۰ بلاک ۳
گلشن اقبال، کراچی-۴۷

فون:- ۴۶۳۶۴۵
مورخہ ۴ر اگست ۸۵ء

حمایت بھائی۔
آپ کی خدمت میں بہت ساری محبتیں اور بہت سارے سلام۔
ہارون کی آواز کا تحفہ نایاب ملا۔ یاد آوری اور قدر افزائی کے لئے ممنون ہوں۔

سلطان جمیل نسیم کا خط

(حمایت علی شاعر کے نام)

حمایت بھائی۔

آپ کی خدمت میں بہت ساری محبتیں اور بہت سارے سلام۔

"ہارون کی آواز" کا تحفہ نایاب ملا۔ یاد آوری اور قدر افزائی کے لئے ممنون ہوں۔

آپ کی شاعری کے بارے میں کیا عرض کروں۔ آپ کی شاعرانہ خوبیوں کا اعتراف تو بڑے بڑے لوگ کر چکے ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں۔

کراچی میں بھی معتبر ہو رہا ہے
سخن میں جو انداز لاہور کا ہے

اس کے باوجود آپ کا طرزِ سخن' لاہور اور کراچی کی روشِ عام سے یکسر مختلف ہے اور جس کے موجد آپ خود ہیں اور جو کراچی میں بھی اور لاہور میں بھی معتبر ہے ہی نہیں بلکہ مانا گیا ہے--- آپ نے اپنے اندر جو شعلہ منور سنبھال کے رکھا ہے اس نے آپ کی شاعری میں ایسا سوز پیدا کر دیا ہے کہ وہ براہ راست دلوں پر اثر کرتی ہے۔ آپ غزل کہیں یا نظم--- ثلاثی تخلیق کریں یا ہائیکو--- آپ کا پُراثر لہجہ--- اور شعر پر مکمل دسترس پڑھنے والے کو موہ لیتی ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ دیواروں میں در کھل جائیں گے
سایہ دیوار کے خاموش تیور دیکھنا

یہ خط--- تو رسید ہے' آپ کی شاعری کے بارے میں رائے نہیں بلکہ جو فیصلہ برسوں پہلے کر لیا گیا وہ بدستور قائم ہے کہ آپ اس عہد کے منفرد شاعر ہیں۔

بہت جی چاہتا ہے کہ آپ کے پاس بیٹھ کے بہت ساری باتیں' تیس برس پہلے قائم ہونے والا تعلق فاصلوں اور کم ملاقاتوں سے ختم تو نہیں ہو سکتا مگر پھر بھی دل چاہتا ہے کہ ان تعلقات کی تجدید ہو۔

میری کتاب' کھویا ہوا آدمی' انشاء اللہ اسی مہینے آپ کے ہاتھ میں ہوگی۔ پہلے اس میں صرف پچیس کہانیاں رکھی تھیں مگر ''شخص و عکس'' ملنے کے بعد' چھبیسویں کہانی' آگ اور سمندر' بھی شامل کر لی۔ لوگ پوچھیں گے تو کہوں گا اس کہانی کا ذکر حمایت بھائی نے اپنی کتاب میں کیا ہے---

میرے پاس ''آگ میں پھول'' کا نیا ایڈیشن اور ''تشنگی کا سفر'' نہیں ہیں۔ اور ان کے بغیر اپنی چھوٹی سی لائبریری کو مکمل نہیں سمجھتا ہوں۔

بھابی کی خدمت میں مودبانہ سلام۔ بچوں کو دعائیں۔ آپ کا

سلطان جمیل نسیم

مشہود انور

میرا گلیمر ـــــ میرا شاعر

(مطبوعہ مجلّہ "نیساں" ۱۹۶۵ء۔ سٹی کالج میگزین۔ حیدر آباد' سندھ)

لاکھ کوشش کی مگر نہ ہم دوست بن سکے اور نہ دشمن۔

دوستی اور دشمنی ہمارے لئے ندی کے دو کنارے بنے رہے۔ ہم دونوں تک نہ پہنچ سکے۔ ہم بیچ بھنور میں ہی رہے۔ جانے کیا بات تھی' حالانکہ ہم دونوں ہی نفرت کرنا بھی جانتے تھے اور اتنے رواداربھی تھے کہ ایک دوسرے کو دوست' کہہ تو سکتے ہی تھے۔

میں انہیں "آپ" سے مخاطب کرتا تھا' اور بے تکلفی کے باوجود' میں آگے نہ بڑھ سکا' "آپ" سے "تو" تک نہ آسکا۔ حالانکہ میرے جذباتی رشتوں کا افق' جو حمایت علی شاعر کی طرف پھیلا ہوا تھا' سارا کا سارا "تو" کی روشنی سے ہی جگمگا رہا تھا' شروع سے' بالکل ابتدا سے۔

ہم دونوں تو' کنارے پر نہیں بھنور میں ملے تھے! جامعہ عربیہ ہائی اسکول میں ایک مشاعرہ تھا' نہ جانے کب کی بات ہے' وہاں نویں یا دسویں جماعت' میں پڑھتا تھا اور بڑا اتراتا تھا کہ اسکول کا مقبول ترین طالب علم ہوں۔ اس زمانے میں میرے ذہن پر اللہ میاں کے چاند اور ابن انشاء کے چاند نگر کا خاصہ اثر تھا (عمر ہی ایسی تھی) اور اس مشاعرہ میں شریک ہونے والوں میں' بڑے بڑے پوسٹروں نے بتلایا تھا کہ ابن انشاء بھی ہیں۔ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے ایک سانولے بڑے بڑے بھونرا جیسے بالوں والے' شاعر پر جو بار بار نہ جانے کیوں اپنی بغلوں میں ہاتھ دبا رہا تھا پتہ نہیں' اس کے ہاتھوں میں کچھ خرابی تھی یا اس کے کوٹ میں' سولہ آنے یقین تھا کہ یہی ابن انشاء ہیں۔

کچھ دیر بعد مائیک سے اعلان ہوا --- "حمایت علی شاعر" اور وہ ابن انشاء اٹھ کر کھڑے ہو گئے، ایک ہاتھ بالوں کو سنوار رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ سینے کو ناپ رہے تھے۔ "حمایت علی شاعر" ہونہہ، ہوں گے کوئی --- تخلص سے رعب جھاڑنا چاہتے ہیں --" میں نے سوچا --- انہوں نے پڑھنا شروع کیا۔ "نیپیر روڈ" -- "بنگال سے کوریا تک" -- "مہاجر بستیاں" -- اور کئی نظمیں۔

وہ ایسے آئے کہ جانے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ کوشش بھی کرتے تو کوئی جانے کب دیتا۔ چاند، نیپیر روڈ پر اتر آیا، چاند نگر، بنگال سے کوریا تک کے سناٹوں میں گم ہو گیا اور ابن انشاء، حمایت علی شاعر بن گئے۔

حمایت علی شاعر!!

"کراچی میں آپ کہاں رہتے ہیں؟"

"ڈرگ روڈ ---"

"اس کاغذ پر اپنا پتہ لکھ دیجئے ---"

"بس ریڈیو پاکستان --- کراچی"

"اوہ --- شکریہ ---" میں ان کے آٹوگراف ایک کاغذ پر نظم "نیپیر روڈ" کی شکل میں پہلے ہی حاصل کر چکا تھا اور اب مشاعرے کے خاتمے پر، اپنے اندر کے غیر رسمی ہیجان کو رسمی سوالات کے پردے میں چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

وہ لمحے گزر گئے --- مگر وہ تاثر نہیں گیا۔ میری آواز غالباً پہلی آواز تھی، جس نے حیدر آباد میں حمایت علی شاعر کی پیشانی چومی تھی۔

پھر ایک یا ڈیڑھ سال گزر گیا۔ میں نے کئی خط لکھے، ان کا جواب بھی آیا، ایک دفعہ میں کراچی ان سے ملنے بھی گیا مگر وہ ہاتھ نہ آئے۔ اور حیدر آباد کی قسمت جاگی، یہاں بھی آوازوں کا شہر آباد ہو گیا، حمایت علی شاعر کو دیکھا، ملا، اور کئی بار ملا، مگر ہمت نہ ہوئی کہ کہتا --- "میری آواز نے آپ کی پیشانی چومی تھی ---" کیونکہ اب ان کی پیشانی ان گنت بوسوں کے نور سے چمک رہی تھی، --- وہ اب کئی آوازوں کے درمیان تھے۔ میری آواز کہاں پہچانی

جاتی۔

ایسی ہی اجنبی ملاقاتوں کے درمیان' جب ہر بار' تعارف کرایا جاتا۔۔"ان سے ملئے' یہ مشہود انور ہیں۔ اور یہ حمایت علی شاعر" اور ہر بار "پہلی دفعہ" کے سے انداز سے مصافحہ کرنا پڑتا'۔۔ ایک دن کیفے تہران میں کہ وہی ان دنوں ریڈیو والوں کا دیوان خانہ تھا' حمایت علی شاعر نے کہا۔۔"یار میں ایک صاحب کی تلاش میں ہوں۔۔' وہ اتنے پیار بھرے خط لکھتے تھے کہ میری بیوی کو رقابت ہونے لگتی تھی۔۔" میرا دل دھڑکا۔ مگر میں خاموش بیٹھا رہا' ارشاد علی نے اپنی خوبصورت ریڈیو وائس میں پوچھا۔۔"کیا نام تھا؟"

"مشہود انور تھے کوئی صاحب۔ کسی اسکول میں پڑھتے تھے۔۔" حمایت نے حسب معمول اپنی پیشانی کے بالوں کو ہٹایا اور سر کو لطیف سے جھٹکا دیا کہ وہ بال پھر پیشانی چومنے لگے۔

ارشاد نے مجھے گھورا' جیسے اسکول میں پڑھنے کا گناہ میں ہی کر سکتا تھا۔

میں نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا۔۔"میں ہی ہوں وہ گنہگار۔۔"

حمایت نے میرا ہاتھ تھام لیا۔۔"یار تم سے تو ہم گلے ملیں گے۔"

اور ہم دونوں گلے' گلے جذبات کے بھنور میں اتر گئے۔

سقراط پر الزام تھا کہ وہ نوجوانوں کو خراب کرتا تھا' اپنے عالمانہ اور انقلابی خیالات سے' حمایت علی شاعر کی گفتگو میں بھی کچھ ایسا ہی سحر تھا جو زہر کی سی کاٹ رکھتا تھا۔ ہمارا سارا گروپ نوجوان ہی تھا۔ ارشاد علی' محمد علی' طاہر رضوی' خالد وہاب' سلطان جمیل نسیم' ہم سب اکثر و بیشتر ملتے۔ کبھی ریڈیو اسٹیشن' کبھی گاڑی کھاتہ' کبھی رٹز ہوٹل' کبھی کیفے ٹیریا' کبھی حلقہ ارباب شعور کی نشستیں' ملنے ملانے کے بہانے ملتے ہی رہتے۔ ریڈیو ڈرامہ' اسٹیج ڈرامہ' فلم اور ادب کے سمندر کھنگالا کرتے' کسی کے ہاتھ موتی لگتے' اور کسی کے ہاتھ ریت۔

ان دنوں مجھ میں سیمابیت کچھ زیادہ ہی تھی' اور زندگی مجھ سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ کبھی میں کراچی بھاگ جاتا اور کبھی حیدر آباد لوٹ آتا۔ لیکن حمایت علی شاعر سے

ملاقاتوں کا تار ٹوٹنے نہ پاتا۔ البتہ کبھی کبھی اتنا وقفہ ضرور حائل ہو جاتا کہ ہم دوسرے کو بہ آسانی بھول سکتے تھے۔ مگر نہ جانے کیوں ہم نے ان اتفاقات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

۱۹۵۹ء میں' میں نے انٹر کا امتحان دیا۔ سٹی کالج سے۔۔۔ گاڑی کھاتہ میں معلوم ہوا کہ حمایت علی شاعر بھی میرے ہم جماعت ہیں۔ میں تو عقیدت مند تھا ان کا' یہ سن کر میری باچھیں کھل گئیں۔

ہم اب برابر تیر رہے تھے!

لطف یہ تھا کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی کالج نہ جاتا تھا' اگر کبھی ہم لوگ پہنچ جاتے تو کلاس روم کی بجائے سٹی کالج کی اوپن ایئر کینٹین میں چائے کی پیالیوں میں شعر و ادب کی بھپکیوں کے درمیان نصاب کے طوفان اٹھائے جاتے اور بس!

حمایت علی شاعر' شاعر سے زیادہ آدمی کی قسم میں سے تھے۔ وہ اپنی بیوی بچوں سے بہت زیادہ وابستہ تھے۔ (ہیں کے بارے میں کچھ کہنا واثق نہ ہوگا) بچوں کے لئے ان کو ٹیوٹر کی ضرورت ہوئی تو مجھ سے کہا۔۔۔ میں نے اپنی خدمات پیش کردیں۔ انہوں نے کچھ ٹیوشن فیس بھی مقرر کردی اور میں ان کے بچوں کو پڑھانے لگا۔

ماشاء اللہ خاصے ذہین بچے ان کے۔ اس سے پہلے کہ مہینہ پورا ہوتا اور میں ٹیوشن فیس وصول کرتا۔ میری لاابالی فطرت' میرے کام آگئی' اور میں اس رقم سے بال بال بچ گیا۔ مگر اس سے ہماری رسم و راہ میں کوئی فرق نہ آیا۔ حمایت میں' یہ خوبی ان کی تمام برائیوں پر (یقیناً کچھ نہ کچھ ہوں گی) بھاری ہے کہ وہ اخلاق کے دامن کا کبھی پیچھا نہیں چھوڑتے اور ملنے جلنے والوں سے ان کا سنبدھ تکلف سے برابر دور ہوتا جاتا ہے۔ اور اپنائیت کے درجہ پر آجاتا ہے۔ وہ حیدر آباد میں بیسیوں لوگوں سے اسی طرح ملتے تھے' کوئی کسی دفتر کا کلرک ہے تو کوئی حکیم ہے' کوئی کاتب ہے تو کوئی ریڈیو آرٹسٹ' کوئی طالب علم ہے تو کوئی پروفیسر' سب سے ان کی ملاقات بر سر عام ہو یا بر سر میز ہر جگہ کھلکھلاتی اور گنگناتی ہوئی ہوتی۔ ان کے چہرے پر سدا ہی مسکراہٹ ہوتی' اور یہ مسکراہٹ "ان نیچرل" کبھی نہ معلوم دیتی۔ اپنی طبیعت پر اسقدر اختیار میں نے بہت کم آدمیوں میں دیکھا ہے۔ پتہ نہیں "گن" کا سہرا ظرف

کے سر بندھے گا یا گناہ کے سر منڈھے گا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ انہوں نے زندگی گزاری نہیں، جھیلی تھی۔ معاش کے سوپ پر زندگی نے ان کو اجناس کی طرح پھٹکا تھا، صاف کیا تھا۔

حمایت انسان پسند آدمی ہیں۔ میں نے ان کو کبھی تنہا نہیں دیکھا۔ ہر جگہ دو چار آدمی ان کے ساتھ ہمیشہ ہی نظر آتے۔ جہاں کھڑے ہو جاتے، ارد گرد چار چھ آدمی ضرور گھیرے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ ایسا ہی منظر سامنے تھا۔ حمایت علی بول رہے تھے، سب سن رہے تھے، میں نے طاہر رضوی سے چپکے سے کہا "یار --- آدمی مجمع گیر ہے۔"

اس نے اپنے خاص "ہیرو اک" انداز میں قہقہہ لگایا اور حمایت تک یہ ریمارک اپنا بنا کر پہنچا دیا، میں صاف بچ گیا مگر حمایت نہایت فراخدل آدمی ہے۔ انہوں نے فقرہ کا لطف لیا۔ اس زمانے میں ہمارا پورا گروپ عمدہ فقرہ بولنے کے جیسے "کمپٹی شن" میں مبتلا تھا مگر حمایت کے سامنے بولتا کون؟ ٹرافی ان ہی کو ملتی، کبھی کبھار ہم لوگ بھی کنسولیشن پرائز مار جاتے!

۱۹۵۹ء میں ہم دونوں نے سٹی کالج سے انٹر آرٹس کا امتحان پاس کیا۔ وہ تو پڑھتے رہے مگر میں اپنی سیمابیت کا شکار ہو گیا۔ ان دنوں وہ پی ایچ۔ڈی کر رہے ہیں۔ اور میں خدا خدا کر کے اب ایم۔اے میں پہنچا ہوں۔

میرے واسطے ایک اور امتحان کا وقت آیا۔ حمایت کے پاس محسن بھوپالی لاڑکانے سے آتے رہتے تھے، انہوں نے ہی محسن سے متعارف کرایا تھا۔

محسن کا پہلا مجموعہ "شکست شب" آیا، تو اس کا بڑا اہتمام کیا گیا۔ زیڈ اے بخاری کی صدارت میں رٹز ہوٹل میں افتتاحی تقریب منعقد ہوئی۔ حمایت نے محسن کی شاعری پر مضمون پڑھا۔

ہم دونوں نے اپنی سی کوشش کی مگر وہ نہ میرے دوست بن سکے اور نہ ہی میرے دشمن۔ وہ شروع سے ہی میرے لئے گلیمر رہے اور ہیں۔

شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم کنارے پر نہیں بھنور میں ملے تھے۔

احمد رئیس

نذرِ شاعر

(حمایت علی شاعر کے نام)

۲۳ - ۱۱ - ۷۲

وہ ایک شاعر
وہ اک مغنی
جو گیت لکھتا ہے زندگی کے
جو پیار کرتا ہے آدمی سے
ہمیں محبت ہے بس اس سے ——

وہ ایک شاعر
وہ اک مغنی
جو عصر حاضر کا ترجماں ہے
جو آنے والے
حسین لمحوں کا نغمہ خواں ہے
ہمیں عقیدت ہے بس اسی سے ——

وہ ایک شاعر
وہ اک مغنی
کہ جس کے اشعار میں اجنتا کا با نکپن ہے
وہ جس کی نظموں میں
خوبصورت، حسیں ایلورہ کا بھولپن ہے
مرانٹھواڑے کی دلکشی ہے
وہ جس کی آواز ——
کل تلنگانہ کی سرخ تہذیب کا نشان ظفر بنی تھی
جواب کراچی سے تا پشاور رواں دواں ہے
میرے وطن کے

جیالے محنت کشوں کے
غمگین اداس لمحوں کی ہم سفر ہے
جو محترم سے بھی محترم ہے
جو معتبر ہے
عظیم تر ہے
ہمیں بھی رغبت ہے بس اسی سے ——

وہ ایک شاعر
وہ اک مغنی
کہ جو سراج و ولی کا ہمزاد و ہم سخن ہے
وہ جس کو مخدوم نے دعا دی
اریب کہتا تھا جس کو بھائی
جلیس جس کی حسین راہوں میں اپنی پلکیں بچھا رہا ہے
ضیائی کو جس سے پیار سا ہے
ظفر بھی جس پر نثار سا ہے
ہمارا ہمدم ہے
یار سا ہے
اسے ہم اپنا
رفیق و دمساز جانتے ہیں
اسے ہم اپنے
لہو کی آواز مانتے ہیں
ہمیں بھی نسبت ہے بس اسی سے ——

یہ شام ابراہیم جلیس کے زیر صدارت منائی گئی تھی اور اس میں حمایت صاحب کی شخصیت اور شاعری پر ابراہیم جلیس کے علاوہ مسلم ضیائی، مرزا ظفر الحسن، سرور بارہ بنکوی، سحر انصاری اور خود محسن بھوپالی نے مضامین پڑھے تھے۔ منظوم نذرانہ محبت مجیب خیر آبادی اور احمد رئیس نے پیش کیا تھا۔ (مرتب)

(ہمدرد ریسرچ سنٹر کے زیر اہتمام حمایت علی شاعر کے ساتھ منائی گئی ایک شام کیلئے لکھی)

محسن بھوپالی

کچھ یادیں' کچھ باتیں

(طبع اول ۱۵/ دسمبر ۷۶ء روزنامہ "جنگ" راولپنڈی)

ہمارے ادب میں روایت چلی آرہی ہے کہ جب کوئی لکھنے والا کسی شخصیت کے بارے میں اظہار خیال کرتا ہے تو سب سے پہلے اس شخصیت سے اپنے دیرینہ تعلقات کا سراغ لگاتا ہے' اور انہیں کچھ اس ڈھنگ سے تحریر میں لاتا ہے' کہ ممدوح اگر بقید حیات ہے تو دانتوں میں انگلی دبائے دیر تک دریائے حیرت میں غوطے لگاتا رہتا ہے اور غوطے لگانے کے بعد بھی ماضی کی قربتوں اور رفاقتوں کے آئینے میں صاحب مضمون کی دھندلی سی شکل بھی دیکھنے سے محروم رہتا ہے۔ پھر تعلقات جتنی بڑی شخصیت سے ہوں' اتنے ہی زیادہ گہرے اور وسیع ہوتے ہیں۔ چنانچہ علامہ اقبال کے متعلقین کی فہرست سب سے طویل ہے۔ چند سال پہلے انشاء جی نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ اقبال اپنے ان دوست کو فلسفیانہ گتھی سلجھانے یا عقدۂ لاینحل کو حل کروانے رات برات یاد فرما لیا کرتے تھے۔ ایک رات اقبال نے انہیں بلوا بھیجا۔ امام رازیؒ کے فلسفے کی مبادیات پر سیر حاصل گفتگو کی اور صبح دم انہوں نے شعر کہہ لیا۔

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

ہر چند کہ میں اپنے تعلقات کا مدعی نہیں ہوں۔ پھر بھی اسی ادبی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنے ممدوح یعنی حمایت علی شاعر کے بارے میں گفتگو اپنے تعلقات سے شروع کروں گا۔

۱۹۵۶ء کی بات ہے جب میں این ای ڈی انجینئرنگ کالج میں سال اول کا طالب علم تھا۔ حمایت علی شاعر سے رشید اثر کی کھولی میں ملاقات ہوئی۔ جو مولوی مسافر خانے میں تھی۔ اپنے بالوں کی لٹ کو ٹھیک کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر کر انھوں نے عام طور پر تعارف کے موقع پر کہے جانے والے فقرے ادا کئے۔ چائے پی گئی' کچھ شاعری پر گفتگو ہوئی اور بس۔ چند مہینوں بعد ٹیلی گراف آفس میں ایک شاندار مشاعرہ ذوالفقار علی بخاری صاحب کی صدارت میں ہوا۔ سب شعراء غزلیں سنا رہے تھے۔ میں نے اپنی باری آنے پر نظم پیش کی جو خاصی پسند کی گئی۔ حمایت جو میرے پاس بیٹھے تھے کہنے لگے بہت اچھی نظم کہی ہے۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد حمایت علی شاعر نے بھی نظم پیش کی جو بے حد پسند کی گئی۔ انھوں نے تحت اللفظ میں اس قدر پراثر لہجے اور ڈرامائی انداز میں سنائی کہ حاضرین مبہوت رہ گئے۔ نظم ختم ہونے کے بعد داد و تحسین کی صدائیں بلند ہوئیں اور فضا میں دیر تک آواز اور کلام کا سحر قائم رہا۔

اس زمانے میں مشاعروں میں نظمیں سنانے کا رواج بالکل نہیں تھا۔ سندھ میں حسن حمیدی' صمد رضوی ساز' خالد علیگ ہیں اور کراچی میں صرف حمایت علی شاعر یہ بدعت کرتے تھے۔ ۱۹۵۴ء میں سکھر کے ایک مشاعرے میں پھر ملاقات ہوئی۔ اس دوران افکار و ادب لطیف وغیرہ میں ان کی چند نظمیں نظر سے گزر چکی تھیں۔ اس مشاعرے میں بھی اتفاق سے میں نے نظم پڑھی اور حمایت علی شاعر نے (جب میں ان کے قریب آکر بیٹھا) وہی جملہ دہرایا "اچھی نظم کہی ہے" میں نے برجستہ کہا کہیں یہ تکیہ کلام تو نہیں ہے۔ اس پر حمایت نے نہایت متانت سے کہا واقعی اچھی نظم ہے۔ اس لئے تعریف کر رہا ہوں اور اس طرح ہمارا شاعرانہ تکلف ختم ہوا اور ہم ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ حمایت' عمر میں مجھ سے دو سال بڑے ہیں اور میں نے اس بڑائی کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ میری کتاب "شکست شب" پر ان کے ایک تبصرے سے غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی یا پیدا کردی گئی تھی۔ بقول کسے یہ ایک الگ داستان ہے۔

۱۹۵۵ء میں جب حیدر آباد میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تو حمایت کراچی سے تبدیل ہو کر آگئے۔ حیدر آباد میں صحیح معنوں میں ادبی فضا حمایت علی شاعر کے آنے کے بعد ہی قائم ہو سکی۔ اس سے پہلے حیدر آباد میں ادب کے نام پر اپنی ذات کے لئے لوگ کام کر رہے تھے۔ لیکن حمایت نے مکتبہ شعور کی داغ بیل ڈالی۔ ایک ادبی رسالہ ''شعور'' جاری کیا جو دو سال تک نکلا اور ادبی حلقہ قائم کیا۔ ۱۹۵۶ء میں جب ان کا مجموعہ کلام ''آگ میں پھول'' شائع ہوا تو اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ مجموعے کی ایک طویل نظم ''بنگال سے کوریا تک'' خاصی متنازعہ بنی رہی۔ ساحر لدھیانوی کی نظم ''پرچھائیاں'' اور متذکرہ نظم کم و بیش ایک ہی موضوع یعنی جنگ' اس کے اثرات اور عالمی امن کی خواہش پر کہی گئی تھیں۔ یہ موضوع دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنی نوعیت کی بنا پر دنیا کے ہر بالغ نظر ادیب اور شاعر کا مرکز فکر رہا ہے لیکن چند کوتاہ نظر شاعروں نے جو برنائے حسد ناک لگائے بیٹھے تھے' اس مسئلے کو رسائل اور نجی محفلوں میں خوب اچھالا اور شاعر پر سرقے تک کا الزام لگایا مگر قابل ذکر نقاد اور ادیب خاموش رہے۔

۱۹۵۸ء کے اواخر میں حمایت اور چند احباب نے مل کر ایک ثقافتی ادارہ ''ارژنگ'' قائم کیا جس کے بنیادی اراکین میں حمایت علی شاعر اور میرے علاوہ آجکل کے ممتاز فلمی ہیرو محمد علی' ان کے بھائی ارشاد علی' مسعود جعفری' نایاب حسین وغیرہ تھے۔ اس انجمن کے زیر اہتمام ایک ڈرامہ ''اندھیرے اجالے'' کھیلا گیا جو بے حد مقبول ہوا۔ اس کے مکالمے اور گانے حمایت علی شاعر نے اور کہانی ارشاد علی نے تحریر کی تھی۔ اور اس ڈرامے میں محمد علی' ارشاد علی' عثمان عرفانی' طاہر رضوی اور مصطفیٰ قریشی کے علاوہ حمایت اور میں نے بھی حصہ لیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ حمایت علی شاعر' ساحر لدھیانوی سے متاثر ہیں۔ میرے خیال میں ساحر لدھیانوی چلی کے نوبل انعام یافتہ شاعر پبلو نرودا سے متاثر ہیں اور پبلو نرودا کس سے متاثر ہیں' یہ کوئی چلی کا شاعر بتا سکتا ہے۔ شاعری میں مسئلہ اثر قبول کرنے کا نہیں ہے کہ ہر شاعر اپنے ہمعصر شعراء اور قدما سے متاثر ہوتا ہے۔ جوش صاحب کی مثال

سامنے ہے۔ نئی نسل سے ذرا پہلے کے کم و بیش سب کے سب شعراء جوش سے مرعوب و متاثر رہے ہیں یا ہیں۔ اور ایک زمانے میں ان کے آہنگ میں اسی گھن گرج کے ساتھ شعر کہنا اپنے لئے باعث اعزاز سمجھتے تھے۔ متاثر ہونا اور رنگ اختیار کرنا میرے نزدیک قابل مواخذہ بات نہیں ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے اور دیے سے دیا روشن ہوتا ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ کوئی روشنی لینے کے بہانے ہنڈہ ہی لے اڑے۔ اس سلسلے میں مجھے ایک فلمی شاعر سے اپنا مکالمہ یاد آیا۔ کوئی چھ سات برس ادھر کی بات ہے' میں نے ان سے کہا "جناب یہ شعر:

ابھی تو دل میں ہلکی سی خلش محسوس ہوتی ہے
بہت ممکن ہے کل اس کا محبت نام ہوجائے

شعری بھوپالی صاحب کا ہے۔ اسے آپ نے اپنے نام سے فلم میں کیسے دیا؟" کہنے لگے "تعجب کی بات ہے۔ مجھے تو میوزک ڈائریکٹر نے بتایا تھا کہ یہ شعر کسی پرانے استاد کا ہے جو مرچکے ہیں!" میں نے کہا "تو آپ نے نزدیک مرے ہوئے شاعر کا شعر جائز ہے!" بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ حمایت نے جس نیک تمنا کے ساتھ یہ شعر کہا تھا۔

اے ریگزار سندھ ترا چاند بجھ نہ جائے
آئے ہیں تیری چاہ میں ارض دکن سے ہم

اس کی خاطر سندھ کو ہی اپنا مسکن بنا لیا۔ ریڈیو کے لئے سندھی لوک کہانیوں پر مشتمل ڈرامے لکھے اور سندھی نظموں کے تراجم اپنے رسالے میں شائع کیے۔

حمایت علی کی شاعری اور شخصیت کے دو نمایاں پہلو ہیں۔ ایک فلمی نغمہ نگار اور فلمساز کی شخصیت اور دوسری ادبی شخصیت۔ فلمی دنیا سے کم و بیش گزشتہ بارہ سال سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے آنچل' دامن' بدنام اور لوری وغیرہ جیسی سلور جوبلی فلموں کے گانے لکھے اور بلاشبہ انہوں نے بعض بہت ہی خوبصورت گیت اور جاندار غزلیں دیں اور ایک فلم "لوری" سے خود اتنے متاثر ہوئے کہ اب تک ان پر ایک خواب گوں

کیفیت طاری ہے۔ دیکھیں کب اس خوابناک فضا سے باہر نکلتے ہیں۔ اور ترسی ہوئی آنکھوں کو نقش ثانی کا جلوہ دکھاتے ہیں۔

"آگ میں پھول" کے بعد گزشتہ تقریباً پندرہ برسوں میں ان کا کلام مختلف رسائل میں جستہ جستہ نظر سے گزرا۔ اتنا تو کہہ چکے ہیں کہ قارئین کو ایک اور مجموعہ دے سکیں۔ لیکن ان کی مصلحت یہ جانیں! میری نظر میں ان کا پہلا شعر جس نے قاری کو چونکایا، یہ تھا:

راہزن کے بارے میں اور کیا کہوں کھل کر
میر کارواں یارو، میر کارواں یارو

ایک مدت تک یہ شعر ملک کی فضاؤں میں گونجتا رہا۔ اس دوران میں انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی۔ تازہ نظموں میں "مٹی کا قرض" "لمحہ فکر" "پس دیوار حرف" ایک خوش آئند موڑ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دو تازہ شعر یاد آرہے ہیں۔

وہ قحط جنوں ہے کہ کوئی چاک گریباں
آتا ہے نظر بھی تو گزرتا ہے گماں اور

وہ مشت خاک، ہوا نے جسے بکھیر دیا
سمیٹنے کی تگ و دو ہے آدمی کیا ہے

یہ اشعار اور نظمیں ان کا منفرد انداز لیے ہوئے ہیں اور اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ حمایت علی شاعر اب بھی تازہ دم ہیں۔

(نوٹ: یہ بات بھی غور طلب ہے کہ "حمایت علی شاعر کے ساتھ ایک شام" (منعقدہ۔ ۲۳ر نومبر ۷۷ء) کراچی میں پڑھا جانے والا مضمون کس مصلحت کے تحت روزنامہ "جنگ" راولپنڈی میں اشاعت کے لئے بھیجا گیا)

”وہی قتل بھی کرے ہے‘ وہی لے ثواب الٹا“

ڈاکٹر ساجد امجد

(حمایت علی شاعر کا ”علامہ اقبال ایوارڈ یافتہ“ مجموعہ کلام)

ہارون کی آواز

(تبصرہ)

(مطبوعہ ”سیپ“ کراچی۔ جون ۸۷ء)

حمایت علی شاعر ۱۹۴۷ء کے بعد اپنی جگہ بنانے والے شعراء میں اہم نام کی صورت میں ابھرے ہیں۔ ان کی شاعری فکر‘ فن اور اختصار کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔ ایک مخصوص نظریئے سے واضح وابستگی کے باوجود شاعرانہ نزاکت‘ احساس کی لے‘ بطون سے اٹھنے والی آگ اور فنی رموز ان کی شاعری کی پہچان ہیں۔ ”آگ میں پھول“ ”مٹی کا قرض“ اور ”تشنگی کا سفر“ کے بعد ”ہارون کی آواز“ کی اشاعت نے انہیں دقیع شعرا کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

”ہارون کی آواز“ بعض خصوصیات کی بنا پر ان کے سابقہ مجموعہ ہائے کلام کے مقابلے میں زیادہ منفرد اور دقیع مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں جس تاریخی شعور کا اظہار ملتا ہے وہ بڑی شاعری کی چند بڑی شرائط میں سے ایک ہے۔ ہر قوم کا ایک تاریخی لاشعور ہوتا ہے اور جب کسی خوش قسمت شاعر کے شعور میں یہ لاشعور بیدار ہوتا ہے تو روح عصر سے ہم کلام ہونے کی قوت حاصل کر لیتا ہے اور پھر اس کی نظر صرف عصری مسائل پر نہیں ہوتی۔ وہ موازنے کی قوت بے مثال کے بعد عصر کی روح میں اترتا ہے خارجی مسائل کا ذکر کئے بغیر اپنی آواز کے سوز سے تصاویر آشوب حال دکھاتا ہے اور ہم اپنا جائزہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں یہی اچھی شاعری کا مقصد ہے۔ ”ہارون کی آواز“ عہد پارینہ کی مختلف حکایات کی روشنی میں عہد حال کے محرکات کو سمجھنے کی کوشش ملتی ہے جو ایک صحت مند طریقہ تجزیہ ہے اس تجزیئے کے دوران شاعر کو بہت سے ایسے موڑ نظر آتے ہیں جہاں ماضی کا آسمان حال کی زمین سے

گلے ملتا نظر آتا ہے۔ حضرت موسیٰ کے عہد کی گوسالہ پرستی اب زر پرستی کی شکل میں رائج ہے ۔ حضرت یعقوب کی ہجرت جدید عہد کی بے زمینی کے مسئلہ کی مثال ہے۔ حق طلبی کی تحریکات، بے یقینی کی فضا۔ ان سب موضوعات کا مطالعہ اس مجموعے میں شامل ہے لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا کسی ۔کچے شاعر کی طرح حمایت علی شاعر نے ان مسائل کے نام گنوانے کو شاعری نہیں سمجھا۔ ان کے یہاں تو اس مجموعی صورت حال کی مختلف کیفیات ہیں جو پردہ شعر سے جھانک رہی ہیں۔ ان مسائل کی اجتماعی کیفیت ایک دبا دبا سا پچھتاوا ہے جس کو شاعر نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

بدن پہ پیرہن خاک کے سوا کیا ہے
مرے الاؤ میں اب راکھ کے سوا کیا ہے

لیکن حمایت علی شاعر قنوطی ذہن کے مالک نہیں اس لئے ان کی شاعری نوحہ نہیں بنتی، لمحہ فکریہ بن کر دعوت فکر دیتی ہے۔

یہ مجموعہ کسی ایک موضوع پر مبنی تھیسس نظر آتا ہے جس میں مصنف اپنے مرکزی خیال سے نہیں ہٹا ہے۔ اس مجموعے کی غزلیں ہوں یا نظمیں شروع سے آخر تک ایک فضا میں سانس لیتی نظر آتی ہیں لیکن اس کے باوجود قاری کو کہیں بھی یکسانیت کا احساس نہیں ہوتا۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ مصنف کی تخلیقی سحرکاری ہمیں سہارا دیئے رہتی ہے۔

اسی تاریخی شعور نے انہیں روایت کا احترام کرنا سکھایا ہے ان کے یہاں جدید ذائقہ بھی ہے روایت سے ہٹ کر چلنے کا میلان بھی لیکن روایت کو یکسر نظر انداز کرنے کے وہ قائل نہیں۔ اس لئے ان کے ہاں بیشتر جدید تر شعراء کی طرح ابلاغ کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا وہ اپنی بات کو آسانی سے سمجھانا جانتے ہیں ان کے خوابوں کی تہ داری ان کے پڑھنے والوں پر بڑی سہولت سے کھلتی ہیں حمایت علی شاعر کی ایک بڑی خصوصیت ان کا اختصار ہے۔ وہ قاری کا زیادہ وقت ضائع نہیں کرتے۔ بہت کم لفظوں میں اظہار مطلب ان کا طرہ امتیاز ہے۔ اسی تاریخی شعور نے ان پر وطن کی اہمیت اور محبت کے رمز عیاں کئے ہیں اس مجموعے میں انکی نظمیں "پرانے سلسلے نئے رابطے" اور "نسبت خاک" اسی تاثر کی تصویریں ہیں۔

S. NAYAB HUSSAIN,
General Secretary,
'ARSCHUNG' Hyderabad.

ثقافتی انجمن "ارژنگ" حیدر آباد میں اگست ۵۹ء میں چند نوجوان فنکاروں نے قائم کی تھی۔ سجاد حیدر (ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان) کو صدر بنایا گیا اور نایاب حسین کو جنرل سیکریٹری۔ ارکان میں حمایت علی شاعر، ارشاد علی، عثمان عرفانی، محمد علی (فلم اسٹار)، مصطفیٰ قریشی (فلم اسٹار)، طاہر رضوی، میرلائق علی، نذیر وڑائچ (ریڈیو انجینئر)، اشفاق حسین، مسعود جعفری، اقبال جعفری، نورالانبیاء، نظام صدیقی، ہاشمی، شاکر جعفری، محسن بھوپالی، قاصد عزیز، تبسم مراد، شہنشاہ حسین، بینش سلیمی، مختار سحر اور سرتاج عالم وغیرہ۔ سب سے پہلے سید انصار ناصری کا ڈرامہ "بختاور" اسٹیج کیا گیا جس میں مرکزی کردار بینش سلیمی نے ادا کیا تھا۔ ۱۳نومبر ۵۹ء کو "امن عالم" کے موضوع پر حمایت علی شاعر صاحب کی مشہور، طویل افسانوی نظم "بنگال سے کوریا تک" کو مونولاگ کی صورت میں سندھ یونیورسٹی کے اسٹیج پر پیش کیا گیا جس میں بنیادی کردار خود حمایت علی شاعر نے ادا کیا تھا۔ فیاز احمد (کمشنر حیدر آباد) ۲۹نومبر ۵۹ء کو اسکے سرپرست اعلیٰ بنے۔ اسی رات ایک انگریزی ڈرامہ "Night in an Inn" اسٹیج کیا گیا جس میں بنیادی کردار میرلائق علی (انکم ٹیکس کمشنر کراچی) نے ادا کیا تھا۔ ۲۱دسمبر ۵۹ء کو گورنمنٹ گرلز کالج کے اسٹیج پر ارشاد علی کی کہانی پر حمایت علی شاعر کا لکھا ہوا ڈرامہ "اندھیرے اجالے" پیش کیا گیا جس میں دوسروں کے ساتھ محمد علی اور مصطفیٰ قریشی نے بھی اہم کردار ادا کئے تھے۔ پھر "ارژنگ" ہی کے زیر اہتمام طاہر رضوی (ٹی وی پروڈیوسر) نے "بنگال سے کوریا تک" کو دوبارہ اسٹیج پر پیش کیا جس میں مرکزی کردار خود طاہر رضوی نے ادا کیا تھا۔ ان تمام سرگرمیوں میں عثمان عرفانی نے اسٹیج کے وسیع تجربے اور چہرہ سازی کے ہنر کے سبب نمایاں خدمات انجام دیں، نیاز صاحب کی سرپرستی میں ۲۹ جنوری ۶۰ء کو آل پاکستان کلچرل فیسٹویل منعقد کیا گیا جس میں ملک کے دونوں حصوں کے مشہور موسیقار، گلوکار، اور رقاص شریک ہوئے تھے۔ یہ فیسٹویل چار دن جاری رہا۔ پھر مارچ ۶۰ء میں ہم عصر پاکستانی مصوروں کے فن پاروں کی نمائش ہوئی۔ کچھ عرصے بعد "رانی باغ" (ٹھنڈی سڑک) میں "ارژنگ میونسپل اوپن ایئر تھیٹر" تعمیر کیا گیا جو اس دور کی ایک یادگار ہے۔ (مرتب)

(ماخوذ۔ شخص و عکس)

بنگال سے کوریا تک

(اشاعتی حوالے)

۱۔ برگِ گل (اردو کالج کراچی کا جریدہ) شمارہ نمبر ۱۔ مرتبہ۔ ابن انشاء اور افضل الرحمٰن (یہ شمارہ تعلیمی سال ۵۳۔۵۲ء میں مرتب ہوا اور مارچ ۵۳ء میں شائع ہوا
اس رسالے میں مذکورہ نظم کا دوسرا حصہ "تصور" کے عنوان سے چھپا تھا)

۲۔ مشرب (کراچی) مدیر۔ اختر انصاری اکبرآبادی۔ شمارہ نمبر ۶ جلد نمبر ۱ مئی ۱۹۵۳ء
(اس شمارے میں مذکورہ نظم کا پانچواں اور چھٹا حصہ "موت اور زندگی" کے عنوان سے شائع ہوا۔ آخر میں "بنگال سے کوریا تک" کا حوالہ بھی موجود ہے)

۳۔ روحِ ادب (کراچی) مرتبہ۔ پروفیسر ممتاز حسین۔ شمارہ نمبر ۱۷، ۱۹۵۳ء
(یہ رسالہ ایک ادبی ڈائجسٹ تھا۔ ممتاز صاحب نے مشرب سے میری نظم منتخب کی اور شائع فرما دیا)

۴۔ سیّارہ (کراچی) مدیر۔ پروفیسر ممتاز حسین۔ جلد نمبر ۱۔ شمارہ نمبر ۸۔ ستمبر ۱۹۵۳ء
(اس رسالے میں نظم کا آٹھواں حصہ "گیتوں کی بستی میں" کے عنوان سے شائع ہوا، شروع میں "بنگال سے کوریا تک" کا حوالہ بھی دیا گیا ہے)

۵۔ شاہراہ (دہلی) ایڈیٹر۔ وامق جونپوری۔ جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۳ (سلسلہ سالانہ) مارچ ۱۹۵۴ء

اس شمارے میں نظم کے دس حصے شائع ہوئے تھے اور ابتدا میں بنگال اور کوریا کی علامتی حیثیت کے بارے میں ایک نوٹ بھی دیا گیا تھا۔ (ملاحظہ "[illegible] عکس" صفحہ ۳۶۶)

۶۔ نیا دور (کراچی) ۲ - ۴
(اس شمارے میں کچھ حصے "طلوع و غروب" کے عنوان سے شائع ہوئے تھے)

۷۔ سحر (کراچی) ایڈیٹر۔ محمد فائق۔ عرفان حامد، جلد ۱ شمارہ ۱ جون ۱۹۵۶ء
(اس شمارے میں نظم کا چوتھا حصہ "وداع" کے عنوان سے شائع ہوا تھا)

۸۔ آگ میں پھول[1] مجموعہ کلام۔ حمایت علی شاعر۔ طبع اول ۱۹۵۶ء (پوری نظم)

۹۔ حیدر آباد کے شاعر (جلد دوم) مرتبہ۔ سلیمان اریب۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی حیدر آباد (دکن) مارچ ۱۹۶۲ء (پوری نظم)

بنگال سے کوریا تک

(عالمی امن کے موضوع پر لکھی ہوئی طویل افسانوی نظم کے مختلف لسانی روپ)

۱- FLOWER IN FLAMES (ترجمہ) پروفیسر راجندر سنگھ ورما
پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ۔ (انڈیا)

۲- FLUTE AND BUGLE (ترجمہ) پرکاش چندر
ایڈیٹر ٹائمز آف انڈیا، لکھنؤ۔ (انڈیا)

۳- گل باہ مہ (سندھی ترجمہ) ام-ای- عالمانی، حیدر آباد۔ سندھ

۴- بنگال سے کوریا تک (ہندی) پروفیسر جی- این- نداف
ابوالکلام آزاد کالج۔ اورنگ آباد۔ (انڈیا)

۵- (تلگو) ڈاکٹر دسرتی- حیدر آباد دکن (آندھرا پردیش)

Bengal-se-Korea Tak—A narrative poem by Himayat Ali Sha'ir, cast into a monologue and presented on the Sind University stage during the Pak-American Cultural Festival on Nov., 13, 1959. Also broadcast from 'Voice of America'.

---

[1] اب یہ نظم میری طویل نظموں کے مجموعے "تشنگی کا سفر" میں شامل ہے جو "پاک کتاب گھر" (اردو بازار کراچی ۱) کے زیر اہتمام ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا ہے (شاعر)

("بنگال سے کوریا تک" کا دوسرا حصہ)

حمایت علی شاعر

تصور

آئینہ خانۂ تصور میں ... ایک اک نقش ابھرا آیا
اور کچھ دیر تھرتھرانے ہی آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے
وہ مری سانولی سلونی شام میری آباد شامِ تنہائی
اپنے ہی دل کی دھڑکنوں پر جب زندگی پہلی بار شرمائی
مچلی مچلی سی آرزوؤں کو لوریاں دے رہی تھی شہنائی
میرے خوابوں کے خشک کھیتوں میں ہنستے گیتوں کی فصل لہرائی
کچی مٹی کے اک گھروندے میں کہکشاں کی برات اتر آئی
کس قدر تھے عجیب وہ دن رات کتنے یک رنگ، کس قدر متضاد
کتنے خاموش، کتنے طوفانی کتنے پابند، کس قدر آزاد
سوئی سوئی سی ایک بیداری صبح سے تا بہ شام رہتی تھی
نوجوانی کے خواب زاروں میں عمر محوِ خرام رہتی تھی
اپنا ساقی تھا، اپنا میخانہ زندگی غرقِ جام رہتی تھی
شام ہوتی تھی، صبح میرے لیے اور سویرے سے شام رہتی تھی
دوش و فردا سے بے خبر یوں ہی زندگی مدام رہتی تھی
کیا خبر تھی کہ ہر بہار کے ساتھ خار و گل ساتھ ہوتے ہیں
عیش و غم زندگی کے بستر پر ساتھ اٹھتے ہیں ساتھ سوتے ہیں
ایک جھٹکے میں ٹوٹ ٹوٹ گئے خودفریبی کے جھل جھلاتے خواب
بادِ صرصر نے نوچ کر رکھ دی شبنمی شبنمی قبائے گلاب
ہوگئے چور اک تھپیڑے سے موج ساحل پہ رقص کرتے حباب
شب نے انگڑائی بھی نہ لی تھی ابھی زرد پڑنے لگا رخِ مہتاب
دھوپ کی آگ اتنی تیز ہوئی رہ گیا گل کے پتھروں کا شباب
[illegible]کی اپنا ہر بناؤ سنگھار ایک دوکان پر اتار آئی
جھڑ گیا شاخِ گل سے ایک اک پھول میری دنیا میں جب بہار آئی

ماخوذ۔ "برگِ گل" (اردو کالج۔ کراچی) ۵۲-۱۹۵۳ء۔ ایڈیٹر۔ ابن انشاء اور [illegible]

(ماخوذ۔ شخص و عکس)

شہ پارہ

حمایت علی شاعر

بنگال سے کوریا تک

(ایک منظوم کہانی)

بنگال اور کوریا ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ بنگال گزشتہ عالمگیر جنگ سے دو دو رہ کر بھی پچاس لاکھ انسانوں کا مدفن بن گیا اور کوریا —— تازہ ہیروشیما ہے اور یہ ہیروشیما جتنی تیزی سے پھیلتا جائے گا بنگال بھی اسی سرعت سے پھیلتا جائیگا یہ نظم ہندوستانی عوام کے اس بیدار ہوتے ہوئے شعور کی داستان ہے جو گزشتہ جنگ سے مختلف ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا آج اس مقام پر پہونچ گیا ہے کہ جنگ بازوں کو نئے کوریا کی تلاش مشکل ہو گئی ہے۔ شاعر

(۱)

آئینہ خانۂ تصور میں ایک اک نقش ابھرتا آتا ہے
اور کچھ دیر تھرتھراتے ہی آپ ہی آپ ڈوب جاتا ہے

وہ مرا گاؤں، میرا اپنا وطن میری جنت — مرا جہنم زار
بند اونچی حویلیوں کے گرد زندہ لاشوں کی تربتوں کا دیار
سبز شاداب کھیتیوں کے بیچ بھوکی ننگی حیات کا بازار
ارتقائے جہاں کی پستی کے ہر فریب حسیں کا آئینہ دار
حسن فطرت کا سادہ لوح امیں زر گزیدہ سماج کا شہکار

اسی جنت، اسی جہنم میں غنچے چٹکے، کھلے، گلاب ہوئے
اسی چھاؤں کی نرم حدت میں ذرے تپ تپ کے آفتاب ہوئے

نوجوانی کہ موج طوفاں جوش نوجوانی کہ آندھیوں کا خروش
پتھروں کی رگوں میں کھولتی آگ زندگی کے لہو کا نقطۂ جوش
ایک فرزانگی — جنوں کی سی ایک دیوانگی — بقید ہوش
ایک بے چینی، پرسکوں تیور ایک سکون، اضطراب در آغوش
ایک خاموشی اپنے شور میں گم ایک غوغا مگر بہت خاموش

کس قدر تھے حسین وہ دن رات کتنا دلکش تھا زندگی کا روپ

(عکس) شاہراہ (دہلی) سالنامہ، مارچ ۱۹۵۴ء

(ماخوذ۔ شخص و عکس)

"پرچھائیاں" کا پیش لفظ

'پرچھائیاں' میری پہلی طویل نظم ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں امن اور تہذیب کے تحفظ کے لیے جو تحریک چل رہی ہے، یہ نظم اُس کا ایک حصّہ ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہر نوجوان نسل کو یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ اُسے جو دنیا اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی ہے، وہ آئندہ نسلوں کو اس سے بہتر اور خوبصورت دنیا دیکر جائے۔ میری یہ نظم اسی کوشش کا ادبی روپ ہے۔

سرورق، اور دیگر خاکے ہرکرشن کی فنّی کاوشوں کا نتیجہ ہیں جو ہمارے ملک کے ایک ممتاز اور صاحبِ طرز آرٹسٹ ہونے کے علاوہ میرے بچپن کے دوست اور کالج کے ساتھی بھی ہیں۔ دیباچہ محترم رفیق سردار جعفری نے لکھا ہے۔ میں ان دونوں دوستوں کا شکر گزار ہوں۔

ساحر لدھیانوی

بمبئی ۲۱، نومبر ۱۹۵۵ء

علی سردار جعفری نے اپنے دیباچے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ

"اس نظم میں کہانی کہنے کی تکنیک بھی نئی ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے اس سے پہلے کسی اردو شاعر نے استعمال نہیں کی اور میں جتنا غور کرتا ہوں اتنے ہی مجھے اس تکنیک کے وسیع تر امکانات نظر آتے ہیں۔ یہ تکنیک ساحر نے براہ راست فلم سے لی ہے"

ساحر لدھیانوی کو یہ تکنیک برتنے کا خیال یقیناً فلم سے آیا ہوگا لیکن محترم سردار جعفری صاحب کو شائد یاد نہیں رہا کہ اس تکنیک پر حضرت احسان دانش کی نظم "بیتے ہوئے دن" بہت پہلے سے موجود ہے اور ممکن ہے کہ ساحر کے تحت الشعور میں اس نظم کا عکس بھی کہیں محفوظ رہ گیا ہو کیوں کہ انہوں نے اپنی نظم "پرچھائیاں" میں وہی بحر وہی استعمال کی ہے جس میں احسان صاحب نے اپنی نظم لکھی تھی۔ "بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں تنہائی جنہیں دہراتی ہے"

اس کے علاوہ کئی برس پہلے نادر کاکوروی کی مشہور نظم "اکثر شب تنہائی میں" (ٹامس مور کی نظم کا ترجمہ) بھی اسی تکنیک پر لکھی گئی تھی۔ (تازہ اشاعت' ہفت روزہ "معیار" ۱۷ تا ۲۴ جنوری ۱۹۸۲ء) شاعر

ڈاکٹر وزیر آغا کا خط

(حمایت علی شاعر کے نام)

از وزیر کوٹ (سرگودھا)

۱۶/

برادرم۔

آپ کا خط ملا۔ مجھے یہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے سالنامہ کامران پسند فرمایا۔ آپ درست فرماتے ہیں کہ مرکز سے دور رہ کر معیاری رسالہ پیش کرنا مشکل بات ہے تاہم ایسی کوشش ضرور ہونی چاہیے۔ کامران ایک ماہنامے کے طور پر پچھلے چار برس سے شائع ہو رہا ہے لیکن سالنامے کی نوبت اس بار ہی آئی ہے۔ میں نے مدیر کامران سے وعدہ کر رکھا ہے کہ سالنامے کے سلسلے میں ہمیشہ اپنی خدمات پیش کر دیا کروں گا۔ باقی پرچے وہ خود ترتیب دے لیا کریں۔ امید ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

"مسرت کی تلاش" پر ڈاکٹر صاحب کی رائے کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ براہ کرم اس تبصرے کی ایک کاپی مجھے ضرور بھیج دیں جو ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو میرا سلام بھی پہنچا دیں اور یہ پیغام بھی کہ میں اس تبصرے کے لئے اُن کا بے حد ممنون ہوں۔

"طنز و مزاح [illegible]" کا ایک نسخہ ارسال خدمت ہے۔ اس کے بارے میں جو تبصرہ آپ لکھیں گے اس کی ایک کاپی بھی ضرور بھیج دیجئے گا۔

تحقیق کے لئے آپ نے ایک نہایت شاداب موضوع انتخاب کیا ہے۔ اس پر ضرور لکھنا چاہیے — اس لئے بھی کہ اس میں اردو ادب کے علاوہ ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ بھی شامل ہو جائے گا اور ہماری تنقید کو تاریخی اور سماجی پس منظر کی اشد ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے میں خود بھی ایک گاؤں میں رہتا ہوں جہاں کتب دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ تاہم میں اب اس بارے میں سنجیدگی سے سوچوں گا اور اگر شہر میں جا کر رہنے کا موقع مل سکا تو ضرور اس سلسلے میں تحقیق کروں گا۔

(P.T.O)

"آگ سی بیول" کا مقالہ پڑھ لیا۔ اس پر مفصل تبصرہ تو بعد میں کروں گا۔ چند باتیں ابھی عرض کیے دیتا ہوں۔ اس مجموعے کی مختصر نظموں میں "نم زدا" اور "مژدہ نو" بہت اچھی نظمیں ہیں۔ مجھے یاد ہو گا کہ ۱۹۵۵ء کے بہترین ادب کا انتخاب کرتے وقت اس نظم یعنی "نم زدا" نے مجھے اپنی تازگی اور شعاریت کے باعث بہت متاثر کیا تھا اور میں نے اس نظم کو انتخاب میں شامل کر لیا تھا "مژدہ نو" جیسی مختصر نظم ہے اتنی ہی پُر تاثیر بھی ہے۔ اس میں طنز کی آمد بے حجابانہ ہے۔ اردو ادب میں "ذوق نو" کا مطالعہ کریں تو اس نظم کو ایک مقام امتیاز حاصل ہوگا۔ جیسا کہ آپ نے خود بھی لکھا ہے آپ کے اس مجموعے کی بیشتر طویل نظمیں "مسائل" سے متعلق ہیں۔ اور اگرچہ اتنی گہرے درد، کسک اور احساس سے لبریز ہیں اور ان کے پیرایۂ بیان میں شاعر کے خلوص کا اظہار ہوتا ہے (اور شعر کی [illegible]) تاہم [illegible] دو سے متعلق ہونے کے باعث ان نظموں میں تفکر کا وہ عنصر نہیں جو مثلاً آپ کی نظم "سمندر اور انسان" میں ہے۔ اگر مجھے اس بار بھی پچھلے برسوں کی بہترین شاعری پر تبصرہ کرنے کا موقع ملا تو میں اس نظم پر تفصیل سے لکھوں گا کیونکہ میری دانست میں یہ نظم اردو کی بہترین نظموں میں شامل کیے جانے کے قابل ہے۔

طویل نظموں میں "شبستاں سے گورستاں تک" نہایت خوبصورت نظم ہے۔ اتفاق دیکھئے کہ بالکل اسی موضوع پر پچھلے دنوں ساحر لدھیانوی نے بھی ایک طویل نظم لکھی ہے "پرچھائیاں"۔ لیکن میری رائے میں آپ کی نظم "پرچھائیں" سے کہیں بہتر ہے۔ "پرچھائیاں" میں ایک تو ساحر نے میٹر کو بار بار بدلا ہے جس سے نظم کی [illegible] روانی کو صدمہ پہنچا ہے۔ آپ کی نظم میں یہ نقص موجود نہیں دوسرے ساحر نے جو کہانی پیش کی ہے نہ صرف بے حد معمولی ہے بلکہ بے ربط بھی ہے اور آخر اس نے مقصد کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ آپ کی کہانی میں ربط ہے اور ایک تسلسل ہے اور پھر زندگی کے ایک مخصوص انداز کو شکست از بام کیا گیا ہے۔ اس نظم میں بھی "[illegible]" کا کردار [illegible] امید ہے [illegible] موجودہ خلفشار اور تہذیب اور بربریت کے زمانے میں انسان کا دامن سیاہ رہے۔ نظم کا [illegible] انداز سے ابھرا ہے اور یہی اس نظم کا سب سے بڑا وصف ہے۔ پھر آپ نے سحر کی [illegible] اپنی بیانی [illegible] ہے اور اس طرح قاری کی ہمدردی حاصل [illegible] میں آپ کا اس نظم [illegible] مبارکباد قبول فرمائیے۔

آپ کا
[illegible]

از وزیر کوٹ (سرگودھا)

۱۶؍

برادرم۔

آپ کا خط ملا۔ مجھے یہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے سالنامہ "کامران" پسند فرمایا۔ آپ درست فرماتے ہیں کہ مرکز سے دور رہ کر معیاری رسالہ پیش کرنا مشکل بات ہے۔ تاہم ایسی کوشش ضرور ہونی چاہئے۔ کامران ایک ماہنامے کے طور پر پچھلے چار برس سے شائع ہو رہا ہے لیکن سالنامے کی نوبت اس بار ہی آئی ہے۔ میں نے مدیر کامران سے وعدہ کر رکھا ہے کہ سالنامے کے سلسلے میں ہمیشہ اپنی خدمات پیش کر دیا کروں گا۔ باقی پرچہ وہ

خود ترتیب دے لیا کریں۔ امید ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

"مسرت کی تلاش" پر ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں) کی رائے کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ازراہ کرم اس تبصرے کی ایک کاپی مجھے ضرور بھیج دیں جو ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو میرا اسلام بھی پہنچا دیں اور یہ پیغام بھی کہ میں اس تبصرے کے لئے ان کا بے حد ممنون ہوں۔

"طنز و مزاح" کا ایک نسخہ ارسال خدمت ہے۔ اس کے بارے میں جو "تبصرہ" آپ لکھیں گے' اس کی ایک کاپی بھی ضرور بھیج دیجئے گا۔

تحقیق کے لئے آپ نے ایک نہایت شاندار موضوع انتخاب کیا ہے۔ اس پر ضرور لکھنا چاہئے۔۔۔ اس لئے بھی کہ اس میں اردو ادب کے علاوہ ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ بھی شامل ہو جائے گا اور ہماری تنقید کو تاریخی اور سماجی پس منظر کی اشد ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے میں خود بھی ایک گاؤں میں رہتا ہوں جہاں کتب دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ تاہم میں اب اس بارے میں سنجیدگی سے سوچوں گا اور اگر شہر میں جا کر رہنے کا موقع مل سکا تو ضرور اس سلسلے میں تحقیق بھی کروں گا۔

"آگ میں پھول" کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ اس پر مفصل تبصرہ تو بعد میں کروں گا۔ چند باتیں ابھی لکھنا چاہتا ہوں۔ اس مجموعہ کی مختصر نظموں میں "غم فردا" اور "مژدۂ نو" بہت اچھی نظمیں ہیں۔ مجھے یاد ہے غالباً ۱۹۵۵ء کے بہترین ادب کا انتخاب کرتے وقت اس نظم یعنی "غم فردا" نے مجھے اپنی تازگی اور نکھار کے باعث بہت متاثر کیا تھا اور میں نے اس نظم کو انتخاب میں شامل کر لیا تھا۔ "مژدۂ نو" جتنی مختصر نظم ہے اتنی ہی پر تاثیر بھی ہے۔ اس میں طنز کی آمد بے محابا ہے۔ اردو ادب میں "نوحوں" کا مطالعہ کریں تو اس نظم کو ایک مقام امتیاز حاصل ہو۔ جیسا کہ آپ نے خود بھی لکھا ہے آپ کے اس مجموعے کی بیشتر نظمیں مسائل سے متعلق ہیں۔ اور اگرچہ یہ درد' کسک اور احساس سے لبریز ہیں اور ان کے ہر ہر مصرعے سے شاعر کے خلوص کا اظہار ہوتا ہے (اور شعر کے لئے خلوص کس قدر ضروری ہے) تاہم شاید عمر کے ایک خاص دور سے متعلق ہونے کے باعث ان نظموں میں تفکر کا وہ عنصر نہیں جو

مثلاً آپ کی نظم "سمندر اور انسان" میں ہے۔ اگر مجھے اس بار پھر پچھلے برس کی شاعری پر تبصرہ کرنے کا موقع ملا تو میں اس نظم پر تفصیل سے لکھوں گا کیونکہ میری دانست میں یہ نظم اردو کی بہترین نظموں میں شامل کئے جانے کے قابل ہے۔

طویل نظموں میں "بنگال سے کوریا تک" نہایت خوبصورت نظم ہے۔ اتفاق دیکھئے کہ بالکل اسی موضوع پر پچھلے دنوں ساحر لدھیانوی نے بھی ایک طویل نظم لکھی ہے "پرچھائیاں"۔ لیکن میری رائے میں آپ کی نظم "پرچھائیاں" سے کہیں بہتر ہے۔ "پرچھائیاں" میں ایک تو ساحر نے میٹر کو بار بار بدلا ہے جس سے نظم کی روانی کو صدمہ پہنچا ہے۔ آپ کی نظم میں یہ نقص موجود نہیں۔ دوسرے ساحر نے جو کہانی پیش کی ہے نہ صرف بے حد معمولی ہے بلکہ بے ربط بھی ہے اور آخر میں اس نے وعظ کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ آپ کی کہانی میں لوچ ہے' ایک نقطہ عروج ہے اور پھر زندگی کے ایک مخصوص "انداز" کو ملتزمًا ازبام کیا گیا ہے۔ اس نظم میں "بچی" کا کردار "امید" کے معنوں میں آیا ہے جو موجودہ خلفشار' تخریب اور بربریت کے زمانے میں انسان کا واحد سہارا ہے۔ نظم کا یہ مثبت پہلو بڑے فطری انداز سے ابھرا ہے اور یہی اس نظم کا سب سے بڑا وصف ہے۔ پھر آپ نے ساحر کی طرح اپنے افکار قاری پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی بلکہ صرف اپنی کہانی سنائی ہے اور اسی طرح قاری کی ہمدردی حاصل کر لی ہے۔ میں آپ کی اس نظم سے متاثر ہوا ہوں۔ مبارکباد قبول فرمایئے۔

آپ کا

وزیر آغا

(یہ خط وزیر آغا صاحب نے غالباً ۵۸ء میں لکھا تھا' اس لئے کہ "اردو ادب میں طنز و مزاح" اسی سال شائع ہوئی تھی)

سید سبط حسن

چند اقتباسات

(۱)

(مطبوعہ۔ ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور۔ ۲۷ر جنوری ۵۷ء)

"آگ میں پھول" میں ۳۵ کے قریب نظمیں ہیں۔ چھ سات غزلیں ہیں' کچھ متفرق اشعار ہیں اور آخر میں طویل نظم "بنگال سے کوریا تک" شامل ہے۔ یہ نظمیں متاثر کرتی ہیں اور فکر انگیز ہیں' صاف ستھری رواں دواں' لہجے میں بے باکی لیکن تلخی کی حد تک نہیں۔ مزاج میں ایک خاص طرح کا تجسّس اور معصومیت' موضوع یہی عام زندگی کے سیدھے سادے واقعات ہیں۔ کچھ غم دنیا ہے' جس میں ذاتی غم کا احساس صاف نظر آتا ہے۔ کچھ اپنا غم ہے' جو ان نظموں کے خاتمہ پر صرف "اپنا" نہیں رہ جاتا۔ ان نظموں کی کامیابی کی وجہ یہی ہے۔ شاعر کا یقین ہے کہ "انسان فرد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اجتماع بھی ہے اور انسان کے ارتقاء کی انتہائی منزل اپنی ذات میں ضم ہونا نہیں ایک "اجتماعی انسان" ہو جانا ہے۔ "بنگال سے کوریا تک" اس مجموعے کی کامیاب ترین نظم ہے۔ جو قحط اور گزشتہ جنگ کی روداد ہوتے ہوئے بھی صرف ایک روداد نہیں۔ نظم کا اسلوب کچھ ایسا ہے جیسے پردے پر دستاویزی فلم دکھائی جا رہی ہے۔ ایک ایک مصرعہ' زمین کے پردے پر دھندلے دھندلے منظر کی طرح ابھرتا ہے۔ روشن ہوتا ہے۔ دھندلکے میں کھو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دوسرا منظر اجاگر ہوتا ہے۔ نظم کا ایک کردار "میں" ہے۔ جس کے حافظے میں قحط بنگال اور جنگ کی ہولناک داستان کے باب ابھرتے ہیں اور اس دور کی مکمل تصویر نگاہوں میں گھوم جاتی ہے۔ نظم اس طرح ختم ہوتی ہے۔

جنگ نے کتنے کھلتے غنچوں کو پھول بننے سے پہلے توڑ دیا
کتنی راتوں کی مانگ سنولا دی کتنی صبحوں کا خون نچوڑ دیا
کتنے کڑیل جوان جسموں کو سوکھی شاخوں کی طرح توڑ دیا
صبح فردا کے کتنے خوابوں کو ظلمتوں میں بھٹکتا چھوڑ دیا
ارتقاء کے پتے قدموں کا رخ کس اور سمت موڑ دیا
کوئی سوچے عروس فطرت کیوں شام سے تابہ صبح روتی ہے
ایک سورج کی موت میں مضمر کتنی کرنوں کی موت ہوتی ہے

یہ نظم شاعر کے اجتماعی شعور' حادثات کے ادراک' واقعات اور ان کے جزئیات کی مصوری ایک داستان میں ان کی ترتیب' جذبات کی شدت' گہرائی اور گیرائی' الفاظ کے انتخاب اور ان کے دروبست کی

کامیاب مثال ہے۔ ویسے مختصر نظموں سے زیادہ مکمل اور موثر اس مجموعے کی نسبتاً طویل تر نظمیں ہیں۔ "غم فردا" "۸ر جنوری" "زندگی اور پتھر" اور "منظر و پس منظر" اس مجموعے کی نمائندہ نظمیں قرار دی جاسکتی ہیں۔

ڈاکٹر مغنی تبسم

(۲)

(مطبوعہ ماہنامہ "صبا" حیدر آباد دکن - شمارہ ۶-۷ ۱۹۵۷ء)

اس مجموعے (آگ میں پھول) میں مختلف رومانی اور مسائلی نظموں اور غزلوں، رباعیوں اور قطعات کے علاوہ ایک طویل نظم "بنگال سے کوریا تک بھی شامل ہے جو غالباً اس مجموعے کی سب سے اچھی نظم ہے۔ امن کے موضوع پر اردو میں بے شمار نظمیں لکھی گئی ہیں لیکن ان میں سے صرف چند ہی پڑھی جانے کے قابل ہیں ان میں سے ایک "بنگال سے کوریا تک" بھی ہے۔ یہ نظم ایک کہانی ہے جو آپ بیتی کے انداز میں بیان کی گئی ہے۔ بنگال اور کوریا اس میں تمثیلی علامتیں ہیں۔ اس نظم کے کئی حصے ہیں۔ ہر حصہ اپنی جگہ ایک مکمل نظم ہے ہر نظم دوسری نظم سے ایسی پیوست ہے کہ تسلسل اور روانی میں کہیں فرق نہیں آیا ہے یہ نظم بہت زیادہ طویل بھی ہوسکتی تھی لیکن شاعر نے اختصار اور ایجاز سے کام لے کر اسے طولانی ہونے سے بچالیا۔ اس کی وجہ سے نظم کا مجموعی تاثر بہت بڑھ گیا ہے۔ اس نظم کا ہیرو جنگ میں شریک رہ کر اس کی تباہ کاریاں دیکھنے کے بعد گھر لوٹتا ہے۔ جنگ کے اثرات اس کے وطن تک پہنچ چکے ہیں۔ "دوسری زندگی" کا ایک بند ملاحظہ کیجئے۔

زندگی کے ہر ایک گوشے میں ایک اک چیز کاروباری تھی
کھیت کے کھیت تھے گھروں میں دفن اور بھوکی خدائی ساری تھی
ہر تجوری میں قبر کی مانند موت کی جوئے فیض جاری تھی
دیر تا کعبہ کوئی دوکاں ہو ہر طرف زر کی شہریاری تھی
جنگ تو ختم ہوچکی تھی مگر جنگ ایک ایک گھر میں جاری تھی

تنگ آکر نہ جانے کتنی بار دل نے سانسوں کا ساتھ چھوڑ دیا
لیکن اکثر مرے عزائم کو ایک بچی نے ہنس کے توڑ دیا

جنگ کے معاشی اثرات کی تصویر مختصر لفظوں میں کس خوبی سے کھینچ دی گئی ہے آخری دو شعروں میں ایک طویل کہانی سموئی ہوئی ہے۔

شعلہ بے دود' آخر شب' ادھوری کہانی' شکست خواب' اجنبی مہمان اور غم فردا بھی اس مجموعے کی اچھی نظمیں ہیں ان نظموں کی موسیقیت' خیالات کی ترتیب اور توازن' لب ولہجے کی گھلاوٹ اور تاثر کی شدت ایسی خصوصیات ہیں جو ہماری توجہ کو مرکوز کر لیتی ہیں۔

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن (پٹنہ بہار)

(۳)

(ماخوذ۔ مقالہ "جدید شاعری کے نئے چراغ" مطبوعہ ماہنامہ "شاہراہ" دہلی۔ جنوری ۶۰ء)

حمایت علی شاعر نے اردو میں چند نہایت ہی خوبصورت نظموں کا اضافہ کیا ہے۔ ان نظموں سے ان کے نقطہ نظر کو بھی سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اپنی طویل نظم "بنگال سے کوریا تک" کے بارے میں ایک مختصر نوٹ میں شاعر لکھتے ہیں۔ "بنگال اور کوریا ایک تصویر کے دو رخ ہیں' بنگال گزشتہ عالمگیر جنگ سے دور رہ کر بھی پچاس لاکھ انسانوں کا مدفن بن گیا اور کوریا۔ تازہ ہیروشیما ہے اور یہ ہیروشیما جتنی تیزی سے پھیلتا جائے گا' بنگال بھی اسی سرعت سے پھیلتا جائے گا" یہ نظم ہندوستانی عوام کے اس بیدار شعور کی داستان ہے جو گزشتہ جنگ سے مختلف ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا آج اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ جنگ بازوں کو نئے کوریا کی تلاش مشکل ہو گئی۔ "بنگال سے کوریا تک"۔ "۸ جنوری ۱۹۵۲ء"۔ "اجنبی مہمان" اور دوسری نظموں میں شاعر کے شعور کی پختگی دیکھی جا سکتی ہے۔ سیاسی اور معاشی حقیقتوں کے ساتھ فن کا احترام بھی ہر جگہ موجود ہے۔ ان کی شاعری میں جدید رجحانات کی جھلک اچھی طرح نظر آتی ہے۔ خیالات میں تسلسل ہے مسائل حیات پر ایک خاص انداز سے سوچتے ہیں' وقتی اور سیاسی موضوعات پر لکھتے ہوئے بھی ان کی شاعری میں ایک احتیاط ہے وہ سہل نگاری کے شکار نہیں ہوئے ہیں۔ سخت تجربوں کو نرم آہنگ میں پیش کرتے ہیں' امریکہ کے سابق وزیر خارجہ مسٹر ڈلس تشریف لائے تو شاعر کا شعور تلملا گیا۔ "اجنبی مہمان" میں طنز کی ایک اچھی صورت ہے' کہتے ہیں

بھیگی آنکھوں میں خشک ہونٹوں پر   مسکراہٹ کا انتظام کرو
اپنی آزادیوں پہ ناز کرو   اپنی قبروں میں جشن عام کرو
دوستوں کوئی اہتمام کرو   کچھ تو توقیر نوبہار کرو
یہ شب وصل کٹ نہ جائے کہیں   اپنی نظروں پہ اعتبار کرو
کچھ تو دو اس بہار کا انعام   کچھ تو اس گلبدن کو پیار کرو

شاعر کے جذبات ایشیا کی بیدار قوموں کے جذبات سے ہم آہنگ ہیں اس طنز میں تلخی کا احساس ہے۔ شاعر کے ذہنی پس منظر کو ایسی نظموں سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

سرشار صدیقی کے دو کالم

(حد ادب)

(مطبوعہ روزنامہ "حریت" ۱۳ر مئی ۱۹۸۳ء)

(۱)

معاصرانہ چشمک تو ہمیشہ سے ہوتی چلی آ رہی ہے اور شاید آئندہ بھی ہوتی رہے۔ اس سے جہاں ادب میں رونق اور چہل پہل کی فضا پیدا ہوتی ہے وہیں اصلاح احوال کے امکانات بھی رونما ہوتے ہیں اگر ہمارے متقدین اور ماہرین سیدھے سبھاؤ اپنے حصے کا ادب لکھ کر خاموشی سے مر گئے ہوتے تو یہ نوبت کیسے آتی کہ بھائی محمد طفیل اپنے ماہنامہ "نقوش" کی ایک خصوصی اشاعت "معرکہ نمبر" شائع کر سکتے۔

یہ معاصرانہ چشمکیں سر آنکھوں پر، بشرطیکہ ان کا دائرہ ادبی مباحث تک محدود رہے اور ذاتیات موضوع گفتگو نہ بنے۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ آب و ہوائے چشمک نے اپنے منطقے تبدیل کر لئے ہیں اور ادب کے رسمی حوالے سے شخصیات معرض بحث بن گئی ہیں۔

حالیہ برسوں میں جو مثالیں ہمارے سامنے آئی ہیں ان میں سرگودھا اور لاہور کے مکاتیب فکر کے سلسلے میں مختلف مباحث قابل غور ہیں اور خصوصیت کے ساتھ "انشائیہ" کا مسئلہ ہے اس ضمن میں دونوں فریقین کے وکیلوں نے چشمک کو نزاع کی حد تک پہنچا دیا ہے۔

بہرحال اس میں ایک پہلو تحقیق اور تنقید کا بھی نکلتا ہے اور اسی رعایت سے اسے کسی حد تک گوارا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں ہمارے کراچی میں کئی معرکے ایک ساتھ جاری ہیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں کئی کردار یا کئی نام مشترک ہیں۔

نثری نظم ہو یا ثلاثی۔ طویل نظم ہو یا دوہے ہر محاذ پر جدال و قتال کا سماں ہے ان میں سے کئی جنگوں میں حمایت علی شاعر اور قمر جمیل کسی نہ کسی طرح شریک ہیں یہ دونوں تعلیم اور

مطالعے کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے کم نہیں۔ دونوں تقریباً ہم عمر بھی ہیں اور ہم عصر بھی۔

معاصرین کی حیثیت سے ان کی چشمک پڑھنے والوں کو بہت کچھ دے سکتی ہے بعض پوشیدہ گوشے سامنے آتے ہیں۔ اور بعض ناشنیدہ حقائق بھی معلوم ہوسکتے ہیں یہ چشمکیں ایک طرح کا تہذیبی انقلاب بھی ہوسکتی ہیں جن کی روشنی میں بہت سی تاریخی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن اس چشمک سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے ادبی بالشتیوں کو یہ حق نہ دیا جانا چاہیئے کہ وہ "بی جمالو" کی طرح سلگتی ہوئی بھس میں چنگاری ڈالیں اور ادبی چشمک کو ذاتی تنازعہ بنا کر بغلیں بجائیں اور ادب میں نچلی سطح کی ٹھٹھول کے لئے راہ ہموار کریں۔

ادب کی بستی میں ایسے ناجائز تجاوزات کی روک تھام ضروری ہے ہمیں سکھر سے شائع ہونے والے ایک روزنامے کے ادبی صفحے پر ایک بے نام اہل قلم کے شذرات پڑھ کر دکھ ہوا۔ جس شخص میں اتنی بھی جرات نہیں کہ بغیر فرضی نام کا نقاب اوڑھے ادب کی دنیا میں داخل ہو اس کی غیر ذمہ دارانہ فقرے بازیوں کو ادبی صفحات میں کیسے داخلہ مل گیا؟

ادب سچائیوں کے اظہار کا نام ہے جو شخص اپنی سچی شکل اور سچے نام کو چھپا سکتا ہو وہ سچ بات کیا کہے گا اور اسی لئے اس نے حمایت علی شاعر کی حمایت میں کردار کشی کا فرض انجام دیا ہے سوال یہ ہے کہ کیا یہی حقیقتوں سے ڈرا ہوا آدمی کل حمایت علی شاعر کا چہرہ نہیں مسخ کرے گا؟

ہم ادب کے لوگ ادب سے باہر کے آدمی کی حمایت کو بھی نیک نیتی پر محمول نہیں کرتے۔ اگر ایسے کسی مراسلہ نگار کو کسی چشمک میں شریک ہونے کا بہت زیادہ شوق ہو تو وہ اپنے اس نام سے قلم اٹھائے جس کے اعتبار یا بے حیثیتی کا اندازہ لگایا جاسکے۔ ہمیں یقین ہے کہ حمایت علی شاعر کو طرفداری کے یہ انداز خود بھی پسند نہ ہوں گے۔ اب رہے قمر جمیل تو وہ بھی ایسی بے وقعت باتوں کا نوٹس نہ لیں گے۔

(۲)

(مطبوعہ ۱۹ر اگست ۱۹۸۳ء)

عید آزادی مبارک ہو۔

مبارکباد ہی کا سلسلہ جاری ہے تو ایک پر خلوص مبارکباد اپنے اہل قلم ساتھیوں کی خدمت میں بھی پیش کرنا ضروری ہے جنہوں نے ایک اخباری اطلاع کے مطابق اپنے ادبی تنازعے ختم کرکے صلح کرلی ہے۔ حمایت علی شاعر، قمر جمیل اور شمیم احمد سب ہی باشعور ادیب وشاعر ہیں، بعض غلط فہمیوں اور جذباتی مسائل کی بناء پر ان کے قدیمی مراسم مجروح ہوگئے تھے، بات کا بتنگڑ بنانے میں بیچ کے مفسد، منافق اور حاسد قسم کے لوگوں کا ہاتھ زیادہ تھا۔

حمایت، قمر اور شمیم کی صلح کی خوشی کے ساتھ ساتھ ہم ایک نئے صدمے سے دوچار ہیں۔ اور یہ رنج ساقی فاروقی اور افتخار عارف کے درمیان پیدا ہونے والی غلط فہمی اور سر اٹھانے والے ایک نئے فتنے سے پہنچا ہے ہم چونکہ ان دونوں فریقوں کے دیرینہ شناسا ہونے کے دعویدار ہیں اس لئے ہمیں اس رنجش کے پیچھے بھی کسی تیسرے کا ہاتھ نظر آرہا ہے، یہ ہاتھ بھی دیر تک پردۂ زنگاری میں نہیں رہ سکتا اور ہمیں پرامید رہنا چاہئے کہ دوستوں کا یہ جھگڑا بھی جلد ہی طے ہوجائے گا۔

پچھلے جمعے کی اشاعت میں ایک معاصر نے ساقی فاروقی کے خط سے جو اقتباسات شائع کئے ہیں وہ یک طرفہ بیان کی حیثیت رکھتے ہیں جب تک وہ مسائل سامنے نہ آجائیں جن کی وجہ سے اتنا طویل خط لکھنے کی نوبت پیش آئی کوئی فیصلہ دیدینا انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہوگا۔

ساقی فاروقی اور افتخار عارف دونوں سنجیدہ باشعور، تعلیم یافتہ اور مہذب آدمی ہیں۔ اور اسی لئے یہ مسئلہ زیادہ پیچیدہ معلوم ہو رہا ہے۔ جہاں تک اس سلسلے میں ہمارے موقف کا سوال ہے تو ہم تنازعے کی تفصیلات کی تشہیر میں دلچسپی نہیں رکھتے کہ اس طرح باتیں سنورنے کے بجائے بکھرتی ہیں اور پھر سمٹ نہیں پاتیں۔

(باتیں ادب کی)

باتونی کے چار کالم

("باتونی" نکہت بریلوی کا قلمی نام تھا)

(مطبوعہ روزنامہ "کلیم" سکھر ۲۰ر مئی ۸۳ء)

(۱)

ہمارے کالم "باتیں ادب کی" میں معلوم نہیں کیا بات ہمارے محترم سرشار صدیقی صاحب کو اتنی ناگوار گزری کہ انہوں نے ہمیں بے بھاؤ کی سناڈالیں اور اس قدر جذباتی ہوگئے کہ خود اپنی مقرر کردہ "حد ادب" سے تجاوز کر گئے۔ بہرحال ہم ان کی باتوں کا جواب ان کی زبان اور ان کے انداز میں تو دے نہیں سکتے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ بہت سینئر اہل قلم میں سے ہیں، ہم انہیں اپنے زمانہ طالب علمی سے جب غالباً کانپور میں ہوتے تھے، برصغیر کے معیاری ادبی جرائد میں پڑھتے آرہے ہیں۔ مشاعروں کے سلسلے میں جب وہ سکھر آئے تو دو تین مرتبہ ان سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوچکا ہے ہم نے انہیں بہت سنجیدہ، معقول اور علم و شعور سے بھرپور پایا، سو ان سے متاثر ہوئے اور ہم پر ان کا احترام واجب آیا۔ پھر وہ ہمارے اخبار کے مالک و مدیر جناب مہرالٰہی شمسی کے حلقہ احباب میں شامل ہیں۔ ظاہر ہے اس صورت حال کے ہوتے ہم غیر شائستہ لب و لہجہ میں کوئی بات کرنے کی جسارت نہیں کرسکتے۔ تاہم محترم سرشار صدیقی صاحب سے بصد ادب یہ ضرور پوچھنا چاہئیں گے کہ وہ ہمیں ہمارے کالم میں موجود اس بات کی نشان دہی کرائیں جس کے ذریعہ بقول ان کے ان کے ممدوح قمر جمیل کی کردار کشی ہوئی ہے۔ خدانخواستہ ہم نے انہیں "چربہ ساز" بتایا ہے نہ "سرقہ باز" کہا ہے۔ بلکہ ہم نے تو ان کے علمی تبحر کا اعتراف کرتے ہوئے ان حرکات کی مذمت کی ہے جو وہ ادب کے نام پر بلا تکلف فرمائے جارہے ہیں۔ کیا یہ بات قابل قیاس ہے

کہ غلام عباس مرحوم جیسے بلند پایہ افسانہ نگار چور تھے؟ ساحر لدھیانی و ناصر کاظمی مرحومین جیسے اردو کے منفرد اور مقبول ترین شعرا چوری و بددیانتی کے مرتکب ہو سکتے ہیں؟

صدیقی صاحب آپ .مفضلہ صاحب علم ہیں اعلیٰ درجہ کا شعری ذوق رکھتے ہیں اور صحیح تجزیہ کرنے کی پوری صلاحیت۔ ایمانداری سے تاریخ کے تناظر میں تقابلی مطالعہ کر کے بتایئے، حمایت علی شاعر کی نظم "بنگال سے کوریا تک" ساحر لدھیانوی کی نظم "پرچھائیاں" کا چربہ ہے؟ اور کیا ثلاثی (تین مصرعوں کی نظم) قمر جمیل کی ایجاد ہو سکتی ہے جسے بقول ان کے حمایت علی شاعر لے اڑے۔ مجھے یقین ہے حمایت علی شاعر سے آپ کے تعلقات اتنے خراب نہیں ہو سکتے کہ انہوں نے آپ کو "آگ میں پھول" کا نیا ایڈیشن نہ دیا ہو۔ آپ اسے شروع سے آخر تک بغور دیکھیں کہیں قمر جمیل کی محولہ نظم "نیل کا سیلاب" کے اثرات کسی نظم میں کسی طور پائے جاتے ہیں؟ جس پر بقول ان کے حمایت علی شاعر نے دھوکا دینے کے لئے پرانی تاریخ ڈال دی ہے۔ ہمیں تو پوری کتاب کو بار بار شروع سے آخر تک دیکھنے کے باوجود نظم تو کجا کسی مصرع میں نیل کا لفظ تک نہیں ملا۔ اسی طرح آپ جناب عزیز حامد مدنی کی وہ نظم مطالعہ فرمائیں جس کا حوالہ دیکر حمایت علی شاعر کی نظم "انسان اور سمندر" کو اس کا چربہ بتایا گیا ہے۔ ایمانداری سے بتایئے ان دونوں نظموں میں کس طرح کی کیا مماثلت پائی جاتی ہے۔

اس سے قطع نظر کہ حمایت علی شاعر سے، ان کی شخصیت اور فن کی وجہ سے اندرون سندھ کے ہر شہر میں محبت کرنے والوں کی اکثریت ہے اور خوش قسمتی سے ہمیں بھی ان سے مراسم کا فخر حاصل ہے۔ لیکن خدا گواہ ہے ہم نے دوستی اور دشمنی کے جذباتی تعلق کی بناء پر کسی بھی قلم کی طہارت کو ہرگز غارت نہیں کیا ہے۔ اور پھر قمر جمیل صاحب سے ہماری کیا دشمنی ہو سکتی ہے اور کیوں ہو سکتی ہے۔ ہم نے تو ادب میں بے بنیاد الزامات کے نہایت رکیک رویے کی نفی کی ہے، ہاں اگر ان سب الزامات کے لئے قمر جمیل صاحب کچھ معقول دلائل اور مضبوط ثبوت لاتے تو ہم بھی واہ واہ کرتے اور آپ نے معاصرانہ چشمک کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے جو فوائد بتائے ہیں انہیں پا کر خوش ہوتے۔ آپ انصاف کے ساتھ

فیصلہ کریں۔ (ہمیں یقین ہے کہ آپ دیانتدار آدمی ہیں) کیا قمر جمیل صاحب کی باتیں کسی عنوان ادبی چشمک کے ضمن میں آتی ہیں؟ ان سے کون سے پوشیدہ گوشے سامنے آئے ہیں اور کن نادیدہ حقیقتوں پر سے پردہ اٹھا؟ "آپ نے فرمایا ہے کہ ادب سچائیوں کے اظہار کا نام ہے" بیشک ہمارا اس پر ایمان ہے اور ہم حتی الامکان اس پر عمل پیرا بھی ہیں۔ معاف کیجئے گا آپ نے شاید اسے ایک "مقولے" کے طور پر کوٹ کیا ہے؟

محترم ہم نے اپنے ادیب ہونے کا دعویٰ کب کیا تھا جو آپ نے ناحق ہمارے قد کی پیمائش کی زحمت فرمائی۔ بے نام اہل قلم والی بات ہم نہیں سمجھے' ہمارے خیال میں نام فرضی اور حقیقی نہیں ہوتا' صرف نام ہوتا ہے اور وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے جو لکھنے والا لکھ دے وہی اس کی شناخت کے لئے کافی ہے نہیں تو پھر یہ "عنقا" "پنج دریا" "سندھ بادجہازی" "بت شکن" اور "خامہ بگوش" وغیرہ کیا ہیں؟

جناب والا! ادب کی بستی سب کی بستی ہوتی ہے' لکھنے والے کی بھی اور پڑھنے والے کی بھی۔ یہ کسی کی جاگیر ہوتی ہے نہ اس پر کسی کی اجارہ داری قائم ہو سکتی ہے اور یہ کوئی رائٹرز گلڈ جیسا ادارہ بھی نہیں ہوتی کہ اس میں داخلے کے لئے کسی کی اجازت ضروری ہو۔ چنانچہ یہاں جائز یا ناجائز تجاوزات کا مسئلہ ہی نہیں اٹھتا۔

آخری بات نہایت احترام کے ساتھ عرض ہے کہ غیر صنعتی چھوٹے شہروں کے رہنے والے لوگ مقابلتاً" حقیقت پسند ہوتے ہیں ان کے یہاں صنعتی شہروں جیسی مصلحتیں' رابطے اور واسطے کم سے کم ہوتے ہیں لہٰذا وہ حقیقت سے ڈرنے والے آدمی تو ہو ہی نہیں سکتے۔ وہ جس شکل میں سامنے آئیں' سچی اور جو نام بتائیں' سچا۔

دل صاحب انصاف سے انصاف طلب ہے۔

۱-۲- احمد ندیم قاسمی ۳- چراغ حسن حسرت ۴- طفیل احمد جمالی ۵- مشفق خواجہ

(۲)

(مطبوعہ "کلیم" ۲۶ر اگست ۸۳ء)

جناب سرشار صدیقی صاحب نے اپنے کالم (حد ادب۔ حریت) میں اطلاع دی ہے کہ

حمایت علی شاعر نے اپنے دیرینہ دوست قمر جمیل کی طرح شمیم احمد کو بھی معاف کر دیا ہے اور گھل مل گئے ہیں یہ اطلاع پاتے ہی ہم اس سلسلے کی مزید معلومات کے لئے "ان صاحب" کی طرف لپکے کہ وہ حمایت علی شاعر کی حمایت میں شمیم احمد کے خلاف مقدمہ دائر کر رہے تھے (واللہ عالم، ہم نے خبر پڑھی تھی) ان سے ملے تو انہوں نے تفصیلات سے آگاہ کیا، بتایا کہ اندرون سندھ حمایت علی شاعر کے چاہنے والوں کی ایک بڑی تعداد پائی جاتی ہے وہ اس پورے علاقے کے محبوب شاعر مانے جاتے ہیں لہٰذا بیشتر اہل قلم متعدد انجمنوں اور کثیر تعداد میں ادب دوستوں کا تقاضہ تھا کہ شمیم احمد کی بے سروپا الزام تراشی اور دشنام طرازی کا نوٹس لیا جانا چاہئے۔ ورنہ علمی و ادبی مباحث میں اختلاف افکار کے بجائے شخصیتوں سے بیر رواج پا جانے کا اندیشہ پیدا ہوگا اور ادبی اختلاف ذاتی عناد کا روپ دھار جائے گا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ شمیم احمد ملک کے ایک بہت بڑے تعلیمی ادارے میں اردو زبان و ادب کے استاد کے منصب پر فائز ہے لہٰذا تنقید کے نام پر اس کی بے ادبی اور بدزبانی طالب علموں کو گمراہ کر سکتی ہے۔ خدانخواستہ اگر انہوں نے بھی تقلیداً اسی طرح کی بے طوری اور ابنارملٹی (Abnormalty) کا مظاہرہ ادب میں شروع کر دیا تو کیا ہوگا۔ انہوں نے مزید بتایا کہ ہم نے ضروری دستاویزات حاصل کر کے اپنے وکلاء کو دی تھیں کہ عزیز جبران انصاری نے اپنے کالم "لب مہران" (حریت) میں مقدمہ کی خبر لگا دی جس دن یہ خبر چھپی اسی دوپہر کو حمایت علی شاعر کا فون آگیا۔ فوری کراچی طلب کر لیا گیا۔ کراچی پہنچے تو حمایت صاحب نے ہمیں تاکید کی کہ مقدمہ دائر نہ کیا جائے۔ ہر چند کہ شمیم احمد نے جس قسم کی لغویت کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابل معافی نہیں لیکن وہ سلیم احمد کا چھوٹا بھائی ہے اور میں نظریاتی اختلاف کے باوجود سلیم احمد کو دوست سمجھتا ہوں، اس کی عزت کرتا ہوں، تیس بتیس سال کے مراسم ہیں، میں اسے کسی قسم کا دکھ نہیں پہنچانا چاہتا۔ ہم نے یہاں کے لوگوں کے جذبات سے آگاہ کیا تو کہا انہیں سمجھاؤ کہ شمیم احمد نے اپنے لب و لہجہ اور بے بنیاد باتوں کی وجہ سے ادب کے تمام سنجیدہ حلقوں میں خود اپنی وقعت گنوا لی ہے۔ میرا کچھ نہیں بگڑا ہے، جو غلط فہمیاں اس نے پیدا کرنا چاہی تھیں، میں نے مکتوبات کے ذریعے اس کے غباروں سے ہوا نکال دی ہے۔ غرض

یہ کہ مقدمہ کا خیال ملتوی کردیا گیا ہے لیکن گھل مل جانے کی بات قرین قیاس نہیں۔ قمر جمیل کی بات الگ تھی وہ حمایت علی شاعر کے دیرینہ دوست اور تقریباً ہم عصر ہیں، شمیم احمد سے حمایت علی شاعر کے مراسم کبھی دوستانہ نہیں رہے، یوں بھی وہ بہت کم عمر ہیں چنانچہ سلیم احمد کے برادر خورد کی حیثیت سے سلیم احمد کے دوسرے دوستوں کی طرح حمایت علی شاعر نے بھی شمیم احمد کا خیال کیا حتیٰ کہ سلیم احمد کی خواہش کے مطابق اپنے ساتھ حیدر آباد سندھ لے گئے اور اپنے رسالہ "شعور" میں رکھا لہٰذا گھلنے ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ سلیم احمد کی وجہ سے جو اپنے بھائی کی حرکت پر شرمندگی کا اظہار کر چکے ہیں، حمایت نے شمیم کو معاف کردیا۔

سرشار صاحب صلح جو واقع ہوئے ہیں ادیبوں کی ٹریڈ یونین، یعنی پاکستان رائٹرز گلڈ کے ناظم ہیں اس لئے ادیبوں میں یک جہتی کے خواہش مند رہتے ہیں، وہ علم و ادب کے مباحث کے منکر نہیں ہیں لیکن اس بہانے بے ادبی کے مظاہروں کے سخت مخالف ہیں اور کوشش کرتے رہتے ہیں کہ اہل قلم (ادیب و شاعر) اختلافی معاملات میں "حد ادب" کو نظرانداز نہ کریں۔ اب انہیں ساقی فاروقی اور افتخار عارف کے تنازعہ کا غم لگ گیا ہے حالانکہ اب انہیں اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہئے، ان بیکار کے غموں میں اپنا خون خشک نہیں کرنا چاہئے۔ اور یہ جواب کے "خامہ بگوش" نے انہیں چھیڑا ہے تو اس پر بھی ہمارے خیال میں انہیں "باشد خموشی" والے مقولے پر عمل کرنا چاہئے۔

(۳)

(مطبوعہ "کلیم" ۱۶ر ستمبر ۸۳)

ادب کے قارئین کے لئے اہل قلم کی معرکہ آرائیاں اور شعراء کرام کے مابین نوک جھونک کوئی نئی بات نہ ہوگی اس قسم کی جنگوں کا سلسلہ دور قدیم سے چل رہا ہے اور خیر سے اب تک جاری ہے۔

پہلے ان معرکوں میں زبان وبیان پر گرفت عموماً ہوا کرتی تھی، عروض کی اونچ نیچ دیکھی جایا کرتی تھی، الفاظ کا دروبست اور محاوروں کے استعمال پر غور وخوض ہوتا تھا جیسے جیسے زمانہ

آگے بڑھتا گیا۔ ادبی معرکہ بازی میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں' پھر خیال کی لطافت ونزاکت بھی زیر بحث آنے لگی۔ آخر آخر زندگی اور ادب کے راستے سے نظریہ سامنے آیا اور ادبی مسلک بن گئے۔ ان پر دھینگا مشتی شروع ہوگئی۔ اس ضمن میں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے نعروں سے بہت عرصہ تک کارزار ادب گونجتا رہا۔

اس میں شک نہیں کہ پہلے ان ادبی جنگوں کا حاصل ادب کے تعلق سے اکثر مفید ثابت ہوتا تھا' بڑی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ رازہائے سربستہ کھلتے تھے۔ نکتہ آفرینیاں سمجھ میں آتی تھیں۔ زبان وبیان کے بارے میں ادب کے شائقین کو بہت ساری نزاکتوں کا علم ہوتا تھا اس طرح صحت مند ادبی فضا کی ترقی اور نکھار کا سامان ازخود پیدا ہوتا چلا جاتا تھا۔ معرکہ آراء اہل قلم مقابلے کے لئے بڑی تیاریاں کرتے تھے' اپنے اپنے علم ومطالعہ کے ذخیرے کو بڑھاتے تھے یعنی اسلحہ سے لیس ہوکر میدان میں آتے تھے حتی الامکان صاف ستھری جنگ لڑتے تھے۔ ادب کی سطح سے گرکر اچکوں والی حرکات کے مرتکب نہیں ہوتے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس لڑائی میں شب خون کو بھی شرفا عیب گردانتے تھے۔

زیادہ تر اپنی اپنی فنکارانہ مہارت کا مظاہرہ کرتے تھے' مصحفی اور انشاء کی جنگ طویل تھی اور اس وجہ سے کچھ گڑبڑ بھی ہوئی پھر بھی کسی کو چور نہیں کہا۔ کیسے کہہ سکتے تھے۔ سب بغیر کہے سنے اپنے آپ کو ایک ضابطہ اخلاق کا پابند جانتے تھے۔

ہمارے زمانے میں اس نوع کی مشہور جنگ حضرت فراق گورکھپوری اور خان بہادر جعفر علی خان اثر لکھنوی کی ہے جو "ساقی" کے میدان میں ہوئی اور بہت عرصہ تک جاری رہ کر صلح صفائی پر ختم ہوگئی۔ ان معرکوں کی روداد ادھر ادھر منتشر صورت میں تو بہت سی جگہ دیکھنے کو مل جاتی ہے لیکن سارے معرکوں کو ایک جگہ جمع کرکے شائع کرنے کی روایت بھارت میں پڑی۔

حال ہی میں وہاں کسی صاحب نے یہ کام کرکے کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ سنا ہے کہ اسی کتاب سے استفادہ کرتے ہوئے ہمارے مدیر معظم جناب محمد طفیل صاحب نے جو عرف عام میں محمد نقوش مشہور ہیں' اپنے "نقوش" کا حسب روایت ایک ضخیم "ادبی معرکہ نمبر"

شائع کرکے ہمیں اس محرومی سے بچالیا ہے۔

یہ طویل تمہید اصل میں اس موضوع پر ایک نئی چیز کے تعارف کی غرض سے باندھی گئی ہے۔ یہ نئی چیز حمایت علی شاعر نے "چراغ بکف" کے نام سے ترتیب دی ہے اس کی ضخامت دوسو صفحات کے قریب بنتی ہے اور سائز بڑی تختی پر یعنی ۲۰x۳۰/۴ بلکہ اس سے کچھ نکلتا ہی ہوا ہے۔

اس میں حمایت علی شاعر صاحب نے اپنے خلاف ان تحریروں کو جمع کیا ہے جو مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہو چکی ہیں' ان کے ساتھ ان مخالف تحریروں کے وہ جوابات بھی شامل ہیں جو زیادہ تر حمایت علی شاعر صاحب نے خود اور اکا دکا کسی غیر جانبدار صاحب قلم نے لکھے ہیں۔ وہ تمام نظمیں پوری پوری دی گئی ہیں جن پر چربہ کا الزام لگایا گیا تھا اور دوسرے شعراء کی وہ نظمیں بھی مکمل صورت میں شامل ہیں جن کے چربے یا نقل کا الزام ہے۔

اس طرح شاعر صاحب نے قاری کو موازنے کی سہولت فراہم کردی ہے' یہ ساری چیزیں ۱۹۶۳ء سے ۱۹۸۳ء تک کے عرصہ پر پھیلی ہوئی ہیں اور جن رسائل واخبارات وغیرہ میں شائع ہوئی ہیں انہی کے تراشوں کی فوٹو اسٹیٹ کاپیوں سے یہ دستاویز مرتب کی گئی ہے۔ اس کی مجلد کاپیاں' انڈیا آفس لائبریری (لندن) اردو مرکز لندن' ملکی جامعات کی لائبریریوں اور بعض اہم ادبی شخصیتوں کو بھی بھیجی گئی ہیں تاکہ ریکارڈ کی صورت میں محفوظ ہو جائیں۔

ہم نے اس دستاویز کو شروع سے آخر تک دیکھا ہے۔ اس کے محاسن پر مفصل تبصرہ کسی اور نشست پر اٹھا رکھتے ہیں۔

سردست حمایت علی شاعر کی محنت اور سلیقہ مندی کی داد دینا چاہتے ہیں کہ انہوں نے اس بظاہر معمولی کام کو غیر معمولی بنا کر پیش کیا ہے۔ انہوں نے تمام مخالفین کو نکتہ بہ نکتہ جواب دیا ہے اور بڑی متانت کے ساتھ دیا ہے' ہر اعتراض کو علمی طور پر رد کیا ہے اور بعض مخالفین کے بے بنیاد الزامات کی وضاحت اصل اور نقل کے نمونے دے کر کردی ہے۔

امید ہے کہ آج نہیں تو کل' پچیس پچاس سال بعد سہی "چراغ بکف" کی بہت اہم

ادبی حیثیت ہوگی۔ درحقیقت یہ اہل تحقیق کے لئے ایک عمدہ ذریعہ معلومات ہے' اس کا خصوص یہ ہے کہ اسے خود ایک فریق معرکہ نے مرتب کیا ہے۔

(۴)

(مطبوعہ کلیم' ۱۴/ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

گئے ماہ یعنی ستمبر کے آخری ہفتے میں کراچی کے فکشن گروپ کے زیر اہتمام "افسانہ سیمینار" منعقد ہوا تھا۔ اس کے ہونے کی تصدیق ہمیں لاہور میں ہوگئی جب کہ انتظار حسین صاحب سے ملاقات ہوئی وہ اسی دن کراچی کا افسانہ سیمینار نمٹا کر لاہور واپس ہوئے تھے۔ لوگ ان سے پوچھ رہے تھے سندھ کے حالات کیا ہے؟ اور وہ بتا رہے تھے۔ یارو! وہاں "افسانہ سیمینار" ہو رہا ہے۔

"فکشن گروپ" اللہ رکھے بڑا غنیمت ہے افسانوی ادب کی ترویج و ترقی کے لئے کراچی کی حد تک اس نے بڑی سرگرمی پیدا کر رکھی ہے۔ ہفتے کے ہفتے افسانوی تخلیقات پر تنقیدی نشست کا اہتمام کرتے رہنا بھی کوئی کم قابل تعریف کام نہیں ہے۔ اس نشست میں کسی نو تصنیف افسانے پر' کسی ناول پر تنقید و تبصرہ ہوتا ہے۔ اس کے عیب و ہنر ڈھونڈے جاتے ہیں۔ تعمیر و ترقی پر بحث ہوتی ہے۔ اتار چڑھاؤ بیان ہوتے ہیں۔ کہانی کے حاضر و عدم حاضر پر غور کیا جاتا ہے' علامتی' غیر علامتی اور تجریدی افسانوی ادب پر کار آمد باتیں ہوتی ہیں' ان باتوں میں سب کی سب کار آمد باتیں نہ سہی لیکن ساری کی ساری بیکار بھی نہیں ہوتیں۔ اہل ذوق بیکار سے صرف نظر کرتے ہیں اور کار آمد باتوں کو گانٹھ میں باندھ کر اٹھتے ہیں۔

یہی کام اس لائق ہے کہ نہ صرف کراچی بلکہ پورے پاکستان میں اس کی تعریف اور تقلید ہونا چاہئے۔ ملک کے ادبی حلقوں میں جو لوگ فکشن سے مخصوص ہیں انہیں تو بطور خاص اس تحریک کو اپنا کر آگے بڑھانا چاہئے۔

کراچی کے مذکورہ "افسانہ سیمینار" کے بارے میں بعض اہل قلم کو فکشن گروپ کے بانی رکن علی حیدر ملک کے اس دعوے سے اختلاف پیدا ہوا ہے کہ یہ "افسانہ سیمینار" پاکستان میں پہلا "افسانہ سیمینار" تھا۔ ہرچند کہ یہ صحیح بات نہیں ہے۔ سندھ کی حد تک ہماری

معلومات کے مطابق استاد اختر انصاری اکبر آبادی نے سندھ میں اپنے ابتدائی ایام میں مجلس ترقی علم و ادب کے تحت میرپور خاص' دادو' کندھ کوٹ' نواب شاہ اور سکھر میں افسانے پر اس نوع کی محفلیں جمائی ہیں۔ ان کے ساتھ سلطان جمیل نسیم' قدیر غوثی' عثمان عرفانی' مسعود انور' محمد احمد اور بہت سے افسانہ نگار ہوتے ہیں۔ ان افسانوی مذاکروں یا سیمیناروں میں معروف افسانہ اور ناول نگار مثلاً غلام عباس' شوکت صدیقی' ابوالفضل صدیقی' ابراہیم جلیس' شوکت تھانوی' اور سندھی کے حفیظ صدیقی' بشیر موریانی' رشید بھٹی' عبدالرزاق راز' شیخ ایاز' مقبول صدیقی وغیرہ شامل ہوئے ہیں۔

لیکن ہمیں علی حیدر ملک صاحب کے دعویٰ پر کسی دلیل کی ضرورت اس لئے محسوس نہیں ہوتی کہ انہوں نے یہ دعویٰ اخباری کالم میں کیا ہے اور آج کل اخباری کالم میں ضروری نہیں کہ سب کچھ سچ اور مصدقہ بھی ہو۔

اصل میں کچھ عرصہ سے ہمارے یہاں ادب میں پہل کاری کی وباء سی چل نکلی ہے۔ کچھ دن نثری نظم کے بارے میں مبارک احمد' افتخار جالب اور قمر جمیل اس مسئلہ میں ایک دوسرے سے بالواسطہ بھڑے رہے۔ پھر قمر جمیل صاحب نے حمایت علی شاعر کی ثلاثی کے بارے میں پہل کاری کا دعویٰ کردیا اور کچھ روز خوش ہولئے۔ کتابوں کی رونمائی کی رسم نکالنے پر بھی پہلے کون کی بحث چل چکی ہے۔ کچھ کہتے ہیں سرشار صدیقی صاحب کی "پتھر کی لکیر" سے اس رسم کا آغاز ہوا کچھ کا خیال ہے کہ یہ بدعت محسن بھوپالی صاحب نے اپنی "شکست شب" سے شروع کی اور تو اور پہل کاری کے شوق یا مرض نے اس قدر بار پالیا ہے کہ پچھلے دنوں افتخار عارف کی کتاب "مہر و نیم" کی تقریب میں پڑھے جانے والے اپنے مضمون میں معلوم نہیں کس نسبت سے جناب محسن بھوپالی نے یہ دعویٰ کردیا کہ "حمایت علی شاعر" کے خلاف لکھنے کا پہل کار میں ہوں۔ باقی جن لوگوں نے شاعر کے خلاف لکھا ہے میرے بعد اور میرے ہی اگلے ہوئے نوالوں کو نگلا ہے۔ پہل کاری کا عارضہ اس حد تک بڑھ جائے تو بھلا علی حیدر ملک کے "پاکستان میں پہلے افسانہ سیمینار" پر ناک بھوؤں چڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیں تو اس میں بھی فائدہ نظر آتا ہے۔

محسن بھوپالی

ایک کھلا خط

(باتونی اور حمایت علی شاعر کے نام)

(مطبوعہ روزنامہ "کلیم" ۳۰ مارچ ۱۹۸۴ء)

برادرم شمسی صاحب۔۔۔ سلام مسنون۔!

امید ہے کہ مع الخیر ہوں گے۔ "کلیم" ملتا رہتا ہے۔ پچھلے چار پانچ مہینوں میں چھپنے والے بعض ادبی صفحے واقعی چونکا دینے والے تھے۔ باتونی اور احباب یقیناً سوچتے ہوں گے کہ یا تو مجھے پرچے نہیں مل رہے یا پرچوں کو توجہ نہیں مل رہی حالانکہ اصل بات یہ تھی کہ "تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے۔"

گزشتہ دنوں آپ کا خط ملا۔ غزل بھیج رہا ہوں۔ اور بعض غلط فہمیاں دور کرنے کے لئے یہ کھلا خط بھی۔!

○

۱۴ر اکتوبر ۸۳ء کے "کلیم" میں اپنا ایک مضمون "تازہ دم شاعر" دیکھا جو غالباً آپ نے اپنے وسائل سے حاصل کر کے شائع کیا ہے۔ یہ مضمون تقریباً پندرہ برس پہلے برادرم حمایت علی شاعر کے ساتھ ایک شام کی تقریب میں پڑھا گیا تھا' اور ان دنوں "جنگ" پنڈی میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون کسی فنکار کے ساتھ شام منانے کی تقریب کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھا گیا تھا اور میں اسے "اون" کرتا ہوں۔ ظاہر ہے تقریب رونمائی یا شام منانے کی تقریبات کے موقع ایسے نہیں ہوتے کہ تنقید کی کسوٹی پر کسی شخصیت یا اس کے فن کو پرکھا جائے' بال کی کھال نکالی جائے اور قطعی حکم لگایا جائے (حالانکہ میرے ساتھ یہی ہوا) بہرحال یہ ایک جملہ معترضہ تھا' میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

اس صفحے پر بائیں طرف "باتونی" نے اپنے کالم میں جو باتیں لکھی ہیں، میرے کھلے خط کا موضوع دراصل وہی باتیں ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

"کتابوں کی رونمائی کی رسم نکالنے پر (غالباً ابتدا کرنے سے مراد ہے) پہلے کون کی بحث چل نکلی ہے۔ کچھ کہتے ہیں سرشار صدیقی صاحب کی "پتھر کی لکیر" سے اس رسم کا آغاز ہوا۔ کچھ کا خیال ہے کہ یہ بدعت محسن بھوپالی صاحب نے اپنی "شکست شب" سے شروع کی اور تو اور "پہل کاری" (شان صاحب کو مژدہ ہو اچھی ترکیب ہے) کے شوق یا مرض نے اس قدر بار پالیا ہے کہ پچھلے دنوں افتخار عارف کی کتاب "مہر دونیم" کی تقریب میں پڑھے جانے والے اپنے مضمون میں معلوم نہیں کس نسبت سے جناب محسن بھوپالی نے یہ دعویٰ کردیا کہ حمایت علی شاعر کے خلاف لکھنے کا پہل کار میں ہوں۔ باقی جن لوگوں نے شاعر کے خلاف لکھا ہے، میرے بعد اور میرے اگلے ہوئے نوالوں کو نگلا ہے، پہل کاری کا عارضہ اس حد تک بڑھ جائے تو بھلا علی حیدر ملک کے "پاکستان کے پہلے افسانہ سیمینار" پر ناک بھوں چڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔"

متذکرہ کالم میں "پہل کاری" کے ضمن میں باتونی نے چونکہ میرے دو "دعووں" کو بلا تحقیق اور بہت مبہم انداز میں ذکر کرکے چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے میں ذرا تفصیل سے حقائق پیش کرنا چاہوں گا۔

تقریب رونمائی کے سلسلے میں شبنم رومانی نے اپنے کالم مطبوعہ "مشرق" کراچی ۱۸ر دسمبر ۱۹۷۵ء میں لکھا تھا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سرشار صدیقی کی کتاب "پتھر کی لکیر" سے تقریب رونمائی کی رسم کا آغاز ہوا، جواباً میں نے ایک خط شبنم رومانی کو لکھا تھا جو انہوں نے اپنے کالم مطبوعہ ۱۹ر جنوری ۷٦ء "مشرق" کراچی میں شائع کیا تھا، اس خط کا خلاصہ یہ ہے۔

میرا شعری مجموعہ "شکست شب" ۱۹٦۱ء میں شائع ہوا تھا اور یہی سنہ اشاعت کتاب میں درج ہے۔ اس مجموعے کے مختصر دیباچے پر میرے دستخط کے ساتھ جو تاریخ درج ہے وہ ۵ر اکتوبر ۱۹٦۱ء ہے۔ اس مجموعے کی تقریب رونمائی ۲۵ر نومبر ۱۹٦۱ء کو رٹز ہوٹل حیدر آباد سندھ میں زیڈ اے بخاری کی صدارت میں منعقد ہوئی، اور اس میں مرزا عابد عباس، سید محمد

نصیر، حمایت علی شاعر، خالد وہاب اور نظر کامرانی نے اظہار خیال کیا تھا۔ اس تقریب کی خبر جنگ، لیڈر اور عبرت میں شائع ہوئی تھی۔ سرشار صدیقی کے پہلے مجموعہ کلام "پتھر کی لکیر" میں شامل اشاعتی تفصیل میں سال طباعت ۱۹۷۲ء درج ہے۔ اس مجموعے کے انتساب پر ۱۲ر دسمبر ۱۹۷۲ء درج ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی کتاب کی تقریب رونمائی اس کی اشاعت سے ایک سال قبل کس طرح ممکن ہے۔

اس خط کی اشاعت کے بعد گزشتہ دس برسوں میں قارئین بشمول سرشار صدیقی اور شبنم رومانی، کسی نے بھی حقائق سے اختلاف نہیں کیا۔ اہل نظر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ خالص تحقیقی مسئلہ تھا، یا پہل کاری کا دعویٰ۔ اس کالم میں دوسری بات کو باتونی نے خاصہ توڑ مروڑ کر اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے اور حوالہ میرے مضمون کا دیا ہے۔

واضح رہے کہ میں نے افتخار عارف کی کتاب "مہر دو نیم" کی تقریب میں جو مضمون پڑھا تھا وہ کراچی کے روزنامے "حریت" ۲۳ر ستمبر ۸۳ء میں شائع بھی ہوا تھا۔ میں اس خط میں اس مضمون کا پیراگراف جوں کا توں نقل کر رہا ہوں تاکہ قارئین باتونی کے فقروں اور الفاظ کو اس میں تلاش کرنے کی کوشش کریں اور میری طرح ناکام رہیں۔

عام تقریبات رونمائی کے انداز کا ذکر کرتے ہوئے "شکست شب" کی تقریب کے حوالے سے میں نے لکھا تھا: "آجکل کی تقریبات کے برخلاف اس تقریب میں مضمون نگار حضرات نے تنقید بھی کی بلکہ کسی حد تک تنقیص بھی چنانچہ حمایت علی شاعر سے ہماری دو تین سال بول چال بند رہی اور "نگار" اور "کردار" اور دوسرے اخبارات میں باقاعدہ قلمی جنگ جاری رہی۔ یہ ہماری اس زمانے کی تحقیق و تدقیق (واضح رہے دونوں الفاظ دواین میں شائع ہوئے تھے) ہی تھی جس کی بنیاد پر گزشتہ دنوں "نوائے وقت" میں قمر جمیل نے کالم کے کالم سیاہ کر دیئے اور شمیم احمد نے (کاتب نے سمیم احمد لکھ دیا ہے) ابھی حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب "برش قلم" میں ایک باب مخصوص کر دیا ہے۔ یہ رجحان اس وقت بھی غلط تھا اور آج تو اور بھی زیادہ غلط ہے۔ وہ جوانی کا زمانہ تھا۔ اب ڈھلتی عمروں یہ پٹا بینٹی کے ہاتھ نہیں جچتے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ سطریں جس مصالحانہ جذبے اور دردمندی کے ساتھ لکھی گئی

تھیں، اسے نظرانداز کر کے سنی سنائی باتوں کو سکہ بند فقروں میں ڈھال کر "باتونی" نے کس قدر ظلم لیا ہے۔

بات یہیں تک رہتی تو غنیمت تھا، یک نہ شد دو شد برادرم حمایت علی شاعر نے آپ کے نام اپنے کھلے خط میں جو "کلیم" ۱۱ر نومبر ۸۳ء کو شائع ہوا تھا، انہی "باتوں" کو بنیاد بنا کر "پنڈورا بکس" کھول دیا اور ایک بار پھر فریقین کے الزامات اور تنقیدی موشگافیوں کو راہ دی۔ یہ خط میرے خیال میں قطعی غیر ضروری اور بلاجواز تھا۔ اسے انگریزی میں "ان کالڈ فار" کہا جاتا ہے۔ ممکن ہے انہوں نے یہ خط ریکارڈ درست کرنے کے لئے لکھا ہو۔

متذکرہ کھلے خط کی اشاعت کے بعد بھی شمارہ ۱۹۸۳ء نظرنواز ہوا جس میں حمایت علی شاعر نے سرشار صدیقی کے شعر اور میرے شعر میں حیرت انگیز مماثلت کا ذکر کرتے ہوئے دونوں شعر درج کئے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

میں نے جس حال میں اک عمر بسر کی سرشار
ایک ہی دن کبھی اس طرح گزارے کوئی

سرشار صدیقی

میں نے جس طرح زیست کاٹی ہے
ایک دن ہی سہی بسر تو کر

محسن بھوپالی

شمسی صاحب۔! ایک مدت کے بعد جب حمایت علی شاعر صاحب نے دوبارہ "حیرت انگیز مماثلت" کا ذکر تحریری طور پر کر ہی دیا ہے تو میں بھی جواب آں غزل کے طور پر ایک مماثلت کا ذکر کردوں تو آپ برا تو نہیں مانیں گے جو گزشتہ دنوں حضرت سیماب اکبر آبادی (المتوفی ۱۹۵۱ء) کا شعر میں نظر آئی:

عقیدت کچھ بنا دے، ورنہ پتھر صرف پتھر ہے
حرم کے در میں ہو یا بت کدے کے آستانے میں

سیماب

یہ اک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت تراش لے تو یہی صنم ہے
حمایت علی شاعر

اس فن شریف یعنی شعر گوئی میں جو کچھ میرا تجربہ ہے' اس کی رو سے میرا تو یہ ایمان ہے کہ توارد' مماثلت اور چراغ سے چراغ جلانا' سب بعد کی باتیں ہیں۔ اصل چیز صحت مند خیالات اور احساسات کو دیانت فن کے ساتھ کاغذ پر منتقل کرتے رہنا ہے۔ اہل فن کہتے آئے ہیں اور ٹھیک ہی کہتے آئے ہیں کہ کوئی خیال اوریجنل نہیں ہوتا۔ اب بات خیال کی یا مضمون کی نہیں بلکہ جدت خیال' اسلوب اور انداز کی رہ جاتی ہے کہ شاعر نے اسے کس طرح ادا کیا ہے۔

میں پھر اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ حمایت علی شاعر مجھ سے دو سال بڑے ہیں اور میں نے ان کی اس بڑائی کا ہمیشہ خیال رکھا۔ میں اس خط کے ذریعے ان سے گزارش کروں گا کہ حمایت صاحب' مجھے اور آپ کو ریکارڈ سے قطع نظر' توارد اور مماثلت تلاش کرنے کے بجائے اچھے مصرعے کہنا چاہئے اور آپ نے تو کہے بھی ہیں۔

شمسی صاحب۔! اب اجازت دیجئے۔ اور ہاں اگر آپ کو' باتونی کو یا حمایت صاحب کو کوئی بات تلخ لگے تو اس کے لئے میری پیشگی معذرت قبول فرمائیں۔

حمایت علی شاعر

(ماخوذ۔ محض و عکس)

مثلث کا تیسرا گوشہ

قمر جمیل، شمیم احمد اور ــــــ محسن بھوپالی

(مطبوعہ۔ کلیم۔ سکھر۔ ۱۳؍اپریل ۸۴ء)

بھائی شمسی صاحب، سلام خلوص

۳۰؍مارچ ۸۴ء کے "کلیم" میں برادر عزیز محسن بھوپالی کا ایک "کھلا خط" شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے "بانو فی" کے کالم کے علاوہ میرے اس خط کا بھی ذکر کیا ہے جو ۱۱ نومبر ۸۳ء کو "کلیم" میں شائع ہوا تھا اور جو بلا شبہ اس مقصد سے لکھا گیا تھا کہ ان کی "تحقیق و تدقیق" کا وہ رویہ بھی سامنے آجائے (اصل اشعار میں لفظی تبدیلی کر کے اُن پر سرقے کا الزام لگانا) جو انہوں نے اب سے بیس برس پہلے اختیار کیا تھا اور جس پر انہیں میری مخالفت کے سلسلے میں "اولیت کا شرف" حاصل ہے کیونکہ بقول ان کے

"جس کی بنیاد پر گزشتہ دنوں "نوائے وقت" میں قمر جمیل نے کالم سیاہ کر دیئے اور شمیم احمد نے ابھی حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب "برش قلم" میں ایک باب مخصوص کر دیا ہے۔"

پہلے تو میں اس جملے میں ان کی ایک غلطی درست کر دوں کہ شمیم احمد نے صرف میرے لیے کوئی باب مخصوص نہیں کیا بلکہ "باب زرد" کے تحت ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید اور سجاد نقوی وغیرہ اور "باب سرخ" کے تحت میرے علاوہ احمد ندیم قاسمی، سبط حسن، پروفیسر ممتاز حسین، شوکت صدیقی، پروفیسر عتیق احمد، انور خواجہ اور شہزاد منظر کے خلاف بھی فحش الفاظ میں بے بنیاد الزامات لگاتے ہوئے نہایت رکیک مضامین لکھے ہیں خدا کا شکر ہے کہ محسن کو اب اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور انہوں نے اپنے اس خط میں واضح الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ

"یہ رجحان کل بھی غلط تھا اور آج تو اور بھی زیادہ غلط ہے، وہ جوانی کا زمانہ تھا۔ اب ڈھلتی عمر میں یہ پٹا بنیٹی کے ہاتھ نہیں جچتے۔"

اس کے بعد محسن نے سرشار صدیقی پر لکھے ہوئے میرے مضمون "شجرِ ممنوعہ کا شاعر" (مطبوعہ ماہنامہ "الفاظ" کراچی ۸۳ء) میں ان کے اور سرشار کے دیئے گئے ایک شعر کا حوالہ دیا ہے جن کے بارے میں، میں نے صرف اتنا لکھا تھا کہ

"دونوں اشعار میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔"

واضح رہے کہ میں نے کسی پر سرقے یا چربے کا الزام عائد نہیں کیا تھا مگر برادر عزیز محسن بھوپالی کو میرے اس مختصر اور بے ضرر جملے نے اتنا پریشان کر دیا کہ انہوں نے گزشتہ چار مہینوں میں حضرت سیماب اکبرآبادی کے دیوان چھان مارے اور بالآخر کسی دیوان میں ان کے ایک شعر سے میری ایک "ثلاثی" کی مماثلت ڈھونڈ نکالی۔ اس مماثلت کو محسن ہی کے الفاظ کی روشنی میں اہل ادب پرکھ سکتے ہیں۔

" اہل نظر کہتے آتے ہیں اور ٹھیک ہی کہتے آئے ہیں کہ کوئی خیال اوریجنل نہیں ہوتا۔ بات خیال کی یا مضمون کی نہیں بلکہ جدتِ خیال، اسلوب اور انداز کی ہوتی ہے کہ شاعر نے اسے کس طرح ادا کیا ہے۔"

۶۳ء میں یہی باتیں میں نے بھی (اپنے ابوارڈ یافتہ نغمے کی مخالفت کے جواب میں) سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر محسن اور دیگر حضرات مجھ پر الزامات کی بوچھاڑ کرتے رہے اور گزشتہ سال قمر جمیل اور شمیم احمد تو ذاتیات پر بھی اتر آئے۔ مجبوراً مجھے قانون کا سہارا لینا پڑا۔ خدا کا مزید شکر ہے کہ محسن نے بات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے مسئلے کو اب سنجیدہ پیرائے میں اٹھایا ہے۔ میرا موقف اب بھی یہی ہے کہ

سیفؔ انداز بیاں، بات بدل دیتا ہے
ورنہ دنیا میں کوئی بات، نئی بات نہیں (سیفؔ)

اب حضرت سیماب کا شعر پڑھیئے۔

عقیدت کچھ بنا دے، ورنہ پتھر صرف پتھر ہے
حرم کے در میں ہو یا بت کدے کے آستانے میں

اور "میری "ثلاثی" ہے (محسن نے جس کے صرف دو مصرعے دیئے ہیں)

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت تراش لے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت نواز دے تو یہی خدا ہے

مضمون یقیناً نیا نہیں ہے لیکن ان دونوں میں جو لطیف فرق ہے وہ "راستے میں پڑے ہوئے پتھر اور محبت اور عقیدت" کی تخصیص نے خود نمایاں کر دیا ہے۔

اب سیماب صاحب کے شعر کو ذہن میں رکھتے ہوئے حضرت امجد حیدر آبادی کی اس رباعی کو پڑھیے۔

ہر ذرّے پہ فضلِ کبریا ہوتا ہے
اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام دبی زبان سے یہ کہتے ہیں
وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

دیکھیے وہی پتھر اور خدا کا سلسلہ ہے مگر بات کچھ اور ہو گئی ہے۔ تلاش کیے جائیں تو مختلف شعرا کے پاس اس مضمون کے بے شمار شعر نکل آئیں گے مگر اندازِ بیان سب کا مختلف ہوگا۔ محسن کی خاطر میں خود اپنا ایک اور شعر اسی مضمون کا لکھتا ہوں۔

آرائشیں جدا سہی، بنیاد ایک ہے
کعبے سے مختلف نہیں پتھر کنشت کا

بات کو مختصر کرتے ہوئے غالب کے اس شعر پر یہ بحث ختم کرتا ہوں۔

دیدہ ور آں کہ تا نہد دل بہ شمارِ دلبری
در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آزری

برادرِ عزیز محسن بھوپالی کو اپنے شعر کی اس "حیرت انگیز مماثلت" پر اس قدر لشیان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے اور سرشار کے شعر میں جو مماثلت ہے۔ اس میں بھی کسی "اہل نظر" کو انداز بیاں کی کوئی "ندرت" دکھائی دے سکتی ہے۔

میں نے جس حال میں اک عمر بسر کی سرشار
ایک ہی دن کبھی اس طرح گذارے کوئی

اور محسن کا شعر ہے

میں نے جس طرح زیست کاٹی ہے
ایک دن ہی سہی ، بسر تو کر ،

غور طلب بات یہ ہے کہ سرشار نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

بات دراصل یہ ہے کہ محسن بلاوجہ مجھ سے بدگمان ہیں۔ ایک ہی شعر کی نشاندہی پر اپنے آپ کو اتنا ہلکان کر لیا۔ اے بھائی محسن

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

فلمی ہفت روزہ "کردار" میں آپ نے میرے خلاف جو مضمون لکھا تھا۔ وہ اب سے بیس برس پہلے شائع ہوا تھا اور اس کا میں نے جواب نہیں دیا تھا۔ اب بھی اگر آپ افتخار عارف کی کتاب "مہر دونیم" پر لکھے ہوئے اپنے مضمون میں کسی بہانے میرا ذکر نہ کرتے اور قمر جمیل اور شمیم احمد کے بارے میں یہ انکشاف نہ کرتے کہ وہ آپ کی پیروی کر رہے ہیں تو بخدا میں آپ کے مضمون کا اب بھی تجزیہ نہ کرتا۔ میں نے تو ان حضرات سے گزشتہ ایک سال تک چلنے والی "مذاقتی جنگ" میں کہیں آپ کا نام بھی نہیں لیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان مخالفانہ کالموں کے دوران جب میں نے قمر جمیل کا ذرا سختی سے محاسبہ کیا تو انہوں نے گھبرا کر اپنی "گمراہی" کا سارا الزام شمیم احمد کے مضمون پر ڈال دیا تھا۔ (مطبوعہ "حریت" ۱۶ جون ۸۳ء) اور خود شمیم احمد نے اپنے مضمون میں میری نظم "بنگال سے کوریا تک" پر الزام آرائی کا ذمہ دار عبدالرؤف عروج کو ٹھہرا کر خود کو بری الذمہ ٹھہرا لیا تھا اس سلسلے میں جب نے اور نکہت بریلوی نے عروج سے بات کی تو انہوں نے قسم کھا کر اسے شمیم احمد کے جھوٹ سے تعبیر کیا اور وعدہ کیا کہ جب ضرورت ہو گی تو وہ خود اس کی قلعی کھول دیں گے) شمیم نے چونکہ تحریری اعتراف کر لیا تھا کہ انہوں نے یہ مضمون بیس برس پہلے لکھا تھا (مطبوعہ جسارت ۲۴ جون ۸۳ء) اس لیے مجھے یہ خوش گمانی رہی کہ ممکن ہے شمیم نے اُس زمانے میں اپنا مضمون آپ کو بھی سنایا ہو اور آپ نے بھی "شکستِ شب" پر میرے مضمون کے ردِ عمل کے طور پر وہ جذباتی مضمون لکھ دیا ہو۔ بہر حال یہ بات پرانی تھی اور بقول آپ کے اس دوران ہمارے "تعلقات بھی بحال ہو گئے" اس لیے میں نے ان مباحث میں آپ کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کیا۔ مگر اب آپ نے خود ایک غیر متعلق مضمون میں میرا ذکر کر کے یہ تاثر دے دیا کہ مجھ "گناہ گار" پر "پہلا پتھر" آپ ہی نے

چھپنا تھا۔ گویا اس مثلث کا سراغ دے دیا جس کا ایک گوشہ آپ کی ذات میں زاویہ قائمہ بنا تے ہوئے تھا مجھے اس شعری مماثلت سے زیادہ حیرت تو اس "مماثلت" پر ہوئی جو نظریاتی اختلافات کے باوجود آپ میں اور مثلث کے بانی دونوں گوشوں (قمر جمیل اور شمیم احمد) میں نظر آئی اور افسوس یوں ہوا کہ آپ میرے قبیلے کے آدمی ہیں اور اب بھی میں آپ کو عزیز رکھتا ہوں۔

آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ جب اس "انکشاف" کی تشہیر مختلف اخبارات (جسارت، حریت اور کلیم) میں کی گئی تو مجھے کیا کرنا چاہیئے تھا۔ مجبوراً میں نے آپ کے لکھے ہوئے ہر اس مضمون کا جائزہ لیا جو آپ نے پچھلے بیس برسوں میں میری مخالفت اور میری تعریف میں لکھا تھا۔ بقول آپ کے "ریکارڈ درست کرنے کے لیے" ہی سہی کیونکہ عاقبت کا ایک پہلو یہ بھی تو ہے کہ

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

لیکن آپ نے میرے جائزے میں دیکھا ہوگا کہ جن باتوں کا آپ نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے میں نے انہیں آپ کی "اعلیٰ ظرفی" سے تعبیر کیا ہے مثلاً "بنگال سے کوریا تک" کے بارے میں آپ کا یہ جملہ کہ

"چند کوتاہ نظر شاعروں نے جو برِ بنائے حسد تاک لگائے بیٹھے تھے، اس مسئلہ (بنگال سے کوریا تک) کو رسائل اور نجی محفلوں میں خوب اچھالا اور شاعر پر سرقے تک کا الزام لگایا مگر قابلِ ذکر نقاد اور ادیب خاموش رہے"۔ اس کے علاوہ "دو سال بڑا ہونے کے سبب" آپ جو ہمیشہ میری "بڑائی" ملحوظ رکھتے ہیں، اسے بھی میں آپ کی "سعادت مندی" سمجھتا ہوں۔ اس خط میں بھی آپ نے انہیں "اوصافِ حمیدہ" سے کام لیا ہے۔

اب "دو سال بڑے ہونے کے ناطے" میں آپ سے اصرار کروں گا کہ "شکستِ شب" پر میرا مضمون ایک بار پھر پڑھ لیں۔ شاید آپ کی ۲۴ سالہ بدگمانی دور ہو جائے کیونکہ اب ماشاءاللہ آپ "نوجوانی کے زمانے سے" آگے نکل آئے ہیں اور سمجھنے لگے ہیں کہ "تنقید" اور "تنقیص" میں کیا فرق ہوتا ہے۔ (میں وہ مضمون بھائی شمسی صاحب کو بھیج رہا ہوں تاکہ وہ اسے شائع کر دیں ممکن ہے آپ "قندِ مکرر" کا مزہ لیتے ہوئے اس کڑواہٹ کو تھوک دیں جس نے آپ کو عرصہ دراز سے "تلخیِ کام و دہن" میں مبتلا کر رکھا ہے)

آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ آپ کی کتاب کی تقریب رونمائی (نومبر ۱۹۶۱ء) میں میں نے اپنے مضمون کا وہ پیراگراف نہیں پڑھا تھا جس میں زبان کی چند غلطیوں کی نشاندہی کی گئی تھی اور آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ جب یہ مضمون ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے نشر ہوا تو آپ کی خفگی کا خیال کرتے ہوئے میں نے اسے تین سال تک کہیں اشاعت کے لیے نہیں بھیجا۔ فنون (نومبر ۱۹۶۴ء) میں بھی یہ مضمون اس وقت چھپا جب آپ نے باضابطہ میرے خلاف لکھنا شروع کر دیا تھا اور کچھ بے بنیاد الزامات بھی عائد کر دیے تھے اس وقت بھی اس کی اشاعت کا مقصد یہی تھا کہ لوگ آپ کی مخالفت کا پس منظر جان جائیں اور بس۔

ویسے آپ نے اپنی کتاب "جستہ جستہ" میں مخالفت کے باوجود اس مضمون کا ایک "توصیفی پیراگراف" تو شامل کر ہی دیا تھا۔ یہ اور بات کہ میرا نام دینے کی بجائے صرف "فنون" کا حوالہ دے کر رہ گئے ـــ اس کے علاوہ "نظمانے" (مطبوعہ ۱۹۶۵ء) کے سووینیر میں بھی آپ نے میرے "تعریفی جملے" شائع کر دیے تھے جو "کسی فنکار کے ساتھ شام منانے کی تقریب کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر" نہیں لکھے گئے تھے بلکہ آپ کے اس نئے تجربے پر میری ایک رائے کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ میں "تقریبی مصلحتوں" کا قائل نہیں اور آپ کی شاعری کے بارے میں اپنی ایک رائے رکھتا ہوں اس لیے روئے سخن آپ کی طرف کیے بغیر "غوغائے رقیباں" کی نسبت سے غالب کا ایک شعر سناتے ہوئے رخصت ہوتا ہوں۔

حسد، سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجیے
ستم، بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کیجیے

۱؎ شمیم احمد کی طرح محسن بھوپالی نے بھی اب اپنے مضمون کا جواز یہ پیش کیا ہے (اسی خط سے ایک اقتباس)

" یہ مضمون تقریباً پندرہ برس پہلے برادرم حمایت علی شاعر کے ساتھ ایک شام (کراچی) کی تقریب میں پڑھا گیا تھا اور اُن دنوں (۱۵ دسمبر ۱۹۶۲ء) کو "جنگ" پنڈی میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون کسی فن کار کے ساتھ شام منانے کی تقریب کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھا گیا تھا"

(ادبیات)

خامہ بگوش کے دو کالم

(مشفق خواجہ کا قلمی نام)

(۱)

(مطبوعہ ہفت روزہ "تکبیر" (کراچی) ۲۵ تا ۳۱ر مئی ۱۹۸۴ء)

دو ہفتے ہوئے ہم نے محسن بھوپالی اور حمایت علی شاعر کے تازہ ترین جھگڑے کو ختم کرانے کا ارادہ کیا تھا لیکن جب ہم اس مسئلے پر لکھنے بیٹھے تو معلوم ہوا کہ اس معرکہ آرائی سے متعلق طرفین کے مراسلات کہیں گم ہو گئے ہیں۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کی شاعری گم ہو جاتی تو ہمیں اتنا افسوس نہ ہوتا جتنا ان مراسلوں کے گم ہونے کا ہوا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شاعری تو آدمی کسی وقت بھی کر سکتا ہے' مراسلہ نگاری خاص خاص موقعوں پر اور ضرورت کے تحت ہی کی جاتی ہے۔ ہم نے محسن بھوپالی اور حمایت علی شاعر سے گزارش کی تھی کہ وہ ہمیں اپنے اپنے شائع شدہ مراسلات کے تراشے ارسال فرمائیں۔ جناب شاعر نے توجہ نہیں کی' سنا ہے وہ آج کل بہت پریشان ہیں اور اپنے ایسے مضامین کا مجموعہ مرتب فرما رہے ہیں جن کا تعلق معرکہ آرائیوں سے ہے۔ اس مجموعہ کا نام انہوں نے "شخص و عکس" رکھا ہے حالانکہ مناسب نام "سخن ہائے ناگفتی" تھا' محسن بھوپالی صاحب کے ہم ممنون ہیں کہ انہوں نے مشاعروں کی بے پناہ مصروفیت کے باوجود ہماری درخواست پر توجہ فرمائی۔ اور اپنے ایک مراسلے کا تصحیح شدہ تراشہ بھیج دیا۔ تصحیح شدہ ان معنوں میں کہ انہوں نے اپنے دست مبارک سے دو ایک جگہ کتابت کی غلطیوں کو درست کر دیا ہے۔ اس پر ہمیں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک شاعر نے اپنا مجموعہ کلام شائع کیا' اس میں کتابت کی غلطیاں بہت تھیں۔ وہ جب کسی کو مجموعہ پیش کرتے' پہلے کتابت کی غلطیاں درست کرتے۔ ایک نقاد کو

تصحیح شدہ مجموعہ دیا گیا تو اس نے ورق گردانی کے بعد کہا "آپ نے ناحق زحمت کی، بعض اشعار کتابت کی غلطیوں کی وجہ سے بہتر ہو گئے تھے۔ تصحیح کے بعد وہ دوبارہ اپنی اصلی حالت میں آ گئے ہیں"۔

محسن بھوپالی کی شاعری تو سہل ممتنع کا درجہ رکھتی ہے کہ پہلے مصرعے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ دوسرا مصرع کیا ہوگا۔ لیکن ان کی نثر میں پہلا جملہ دوسرے جملے سے اپنے تعلق کو ظاہر نہیں کرتا۔ قاری اگر ذہین ہو تو وہ بات کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔ ہم جس حد تک ذہین ہیں، وہ کچھ ہمیں جانتے ہیں، تاہم جو کچھ ہم سمجھ سکے ہیں، اس کا اندازہ ذیل کی سطور سے ہوگا۔

حمایت علی شاعر نے محسن بھوپالی پر الزام لگایا تھا کہ ان کے اور سرشار صدیقی کے ایک شعر میں حیرت ناک حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ سرشار کا شعر ہے۔

میں نے جس حال میں اک عمر بسر کی سرشار
ایک ہی دن کبھی اس طرح گزارے کوئی

محسن کا شعر ہے۔

میں نے جس طرح زیست کاٹی ہے
ایک ہی دن سہی بسر تو کر

معلوم نہیں جناب شاعر کو ان شعروں کی مماثلت پر حیرت کیوں ہوئی جس طرح سرشار صاحب نے ناگفتہ بہ حالت میں زندگی گزاری، کیا اسی طرح محسن بھوپالی صاحب نہیں گزار سکتے؟ ناگفتہ بہ حالت سے ہماری مراد صرف یہ ہے کہ دونوں شاعر ہیں اور کئی کئی شعری مجموعوں کے مصنف ہیں اور پھر سب سے بڑی مماثلت یہ ہے کہ دونوں اخباری کالم نویس ہیں اور کالم بھی ایسے لکھتے ہیں، جو بہت سے شاعروں کی شاعری سے زیادہ مقبول ہیں۔

حمایت علی شاعر کے الزام کا جواب محسن بھوپالی نے ان الفاظ میں دیا ہے "اس فن شریف یعنی شعر گوئی میں جو کچھ میرا تجربہ ہے، اس کی رو سے میرا تو ایمان ہے کہ توارد، مماثلت اور چراغ سے چراغ جلانا سب بعد کی باتیں ہیں، اصل چیز صحت مند خیالات اور

احساسات کو دیانت فن کے ساتھ کاغذ پر منتقل کرتے رہنا ہے۔ اہل نظر کہتے آئے ہیں اور ٹھیک ہی کہتے آئے ہیں کہ کوئی خیال اوریجنل نہیں ہوتا۔ اب بات خیال کی یا مضمون کی نہیں بلکہ جدت خیال' اسلوب اور انداز کی رہ جاتی ہے کہ شاعر نے اسے کس طرح ادا کیا ہے"۔

قطع نظر اس سے کہ محسن صاحب نے شعر گوئی کو فن شریف کہا ہے ہمیں ان کے اس خیال سے پورا پورا اتفاق ہے کہ توارد' مماثلت' چراغ سے چراغ جلانا (یعنی سرقہ) ایسے مسائل نہیں ہیں کہ جن پر غور کیا جائے۔ اصل مسئلہ شعر کہنا ہے اگر ایک شاعر کو دوسرے شاعر کا کوئی مضمون پسند آجائے تو اسے لفظی تبدیلیوں کے ساتھ اپنا لینا ہرگز قابل اعتراض نہیں' جب غالب اور میر کے کلام میں توارد اور سرقے کی مثالیں ملتی ہیں تو عام شاعروں کو کیوں روکا اور ٹوکا جائے۔

محسن صاحب کی یہ بات بھی درست ہے کہ کوئی خیال اوریجنل نہیں ہوتا اس کی تصدیق ان کے کلام سے بھی ہوتی ہے' اصل چیز انداز بیان ہے' اس معیار سے دیکھا جائے تو مذکورہ دونوں شعروں میں محسن بھوپالی کا شعر سرشار صدیقی کے شعر سے بڑھ گیا ہے۔ سرشار کے ہاں لہجہ بڑا دھیما بلکہ معذرت آمیز ہے جیسے انہوں نے عمر بسر نہیں کی' کوئی غلط کام ہے۔ اس کے برعکس محسن کے شعر کا لہجہ پر شکوہ ہے' ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ مخاطب کو ڈرا دھمکا رہے ہوں اور پھر زیست کاٹنے اور گھاس کاٹنے میں جو صوتی مماثلت ہے اس سے بھی شعر کی معنویت میں اضافہ ہوتا ہے۔

"جواب آں غزل" کے طور پر محسن نے شاعر کی ایک ثلاثی کو سیماب اکبر آبادی کے ایک شعر کی صدائے بازگشت قرار دیا ہے۔

سیماب کا شعر ہے۔

عقیدت کچھ بنادے ورنہ پتھر صرف پتھر ہے
حرم کے در میں ہو یا بت کدے کے آستانے میں

شاعر کی ثلاثی یہ ہے۔

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت تراش لے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت نواز دے تو یہی خدا ہے

اگر یہ سلسلہ چل نکلا تو حمایت علی شاعر یہ کہہ سکتے ہیں کہ محسن بھوپالی کا یہ شعر

زیست ہمسائے سے مانگا ہوا زیور تو نہیں
ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کھو جانے کا

عندلیب شادانی کے اس شعر کی تشکیل نو ہے۔

مجبوریوں پر ڈالے ہیں پردے
میری ہنسی ہے مانگے کا زیور

ہمارے خیال میں یہ اعتراض نامناسب ہو گا۔ جب کوئی شاعر دوسروں سے زیور مانگ سکتا ہے تو شعر کا مضمون کیوں نہیں مانگ سکتا۔

محسن بھوپالی نے اپنے مراسلے میں یہ بھی بتایا ہے کہ ۱۹۶۱ء میں جب ان کا پہلا مجموعہ کلام "شکست شب" شائع ہوا تھا تو اس کی تقریب رونمائی میں حمایت علی شاعر نے ایک تنقیصی مضمون پڑھا تھا اس کی وجہ سے ان میں اور شاعر صاحب میں دو تین سال تک بات چیت بند رہی تھی اور پھر اخبارات میں قلمی جنگ بھی ہوئی تھی، اسی زمانے میں محسن بھوپالی نے حمایت علی شاعر کے کلام میں سرقے اور توارد کی نشاندہی کی تھی، بعد میں قمر جمیل اور شمیم احمد نے محسن بھوپالی کی تحقیق سے فائدہ اٹھا کر حمایت علی شاعر کے خلاف مضامین لکھے تھے۔

قمر جمیل اور شمیم احمد پر ہمیں حیرت ہے کہ ان دونوں نے محسن بھوپالی کی شاعری سے تو کبھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ لیکن تحقیق سے فائدہ اٹھالیا۔ سنا ہے قمر جمیل نے بعد میں نقصان بھی اٹھایا یعنی انہیں حمایت علی شاعر کے سامنے معذرت پیش کرنی پڑی۔

محسن بھوپالی نے اپنے مراسلے میں یہ بھی لکھا ہے "حمایت علی شاعر مجھ سے عمر میں دو سال بڑے ہیں اور میں نے ان کی اس بڑائی کا ہمیشہ خیال رکھا۔ میں ان سے گزارش کروں گا کہ مجھے اور آپ کو توارد اور مماثلت تلاش کرنے کی بجائے اچھے مصرعے کہنا چاہئے اور

آپ نے تو کہے بھی ہیں"۔

محسن صاحب کی فرخدالی قابل قدر ہے کہ انہوں نے شاعر صاحب کی "بزرگی بہ سال" کو تسلیم کیا ہے اور یہ بھی مانا ہے کہ انہوں نے اچھے مصرعے کہے ہیں لیکن انہوں نے خود اپنے بارے میں اچھے مصرعے کہنے کی جو بات کی ہے وہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ اچھے مصرعوں کے بغیر جب کام چل سکتا ہے تو پھر کوئی خطرہ مول لینے سے فائدہ۔ خطرہ سے ہماری مراد یہ ہے کہ آدمی اچھے مصرعوں کی تلاش میں برے مصرعوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

محسن صاحب نے اپنے مراسلے میں یہ مسئلہ بھی اٹھایا ہے کہ کتابوں کی تقرب رونمائی کی بنیاد کس نے ڈالی تھی۔ اب تک کئی مصنف اس اعزاز کو حاصل کرنے کے لئے اپنے اپنے دعوے پیش کر چکے ہیں محسن صاحب نے سب دعووں کو جھٹلا کر خود یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کی تصنیف "شکست شب" پہلی کتاب ہے جس کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی تھی۔ ہمارے خیال میں اس دعوے کو اعتراف جرم سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ کتابوں کی تقاریب رونمائی سے ہمارے ادب میں جھوٹی تعریف کرنے اور جھوٹی تعریف سننے کا رجحان عام ہوا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ جب کوئی غلط کام کرتے تھے تو اس پر شرماتے تھے۔ اب فخر کرتے ہیں اور اخباروں میں اعلان کرتے ہیں کہ اس غلط کام کو کسی اور سے منسوب نہ کیا جائے۔

محسن بھوپالی نے اپنی کتاب کی تقریب رونمائی کی تاریخ ۵ر اکتوبر ۱۹۶۱ء بتائی ہے۔ اتفاق سے اس وقت مرزا ظفر الحسن کی تصنیف "عمر گزشتہ کی کتاب" ہمارے سامنے ہے۔ اس کے صفحہ ۲۴۲ پر لکھا ہے کہ فیض کی کتاب "دست صبا" کی تعارفی تقریب ۲۲ر دسمبر ۱۹۵۳ء کو لاہور میں منعقد ہوئی تھی جس میں شاعروں اور دانشوروں کی بڑی تعداد نے شرکت کی تھی احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مقالے پڑھے تھے۔

مرزا ظفر الحسن کو اپنی کتاب میں یہ واقعہ نہیں لکھنا چاہئے تھا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ محسن بھوپالی کو اپنے جس کارنامے پر فخر تھا۔ مرزا صاحب نے اس کا سہرا بھی فیض کے سر باندھ دیا۔ آخر مرزا صاحب کب تک فیض کے سر پر سہرے باندھتے رہیں گے۔ اس سہرابندی کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے۔

(۲)

(مطبوعہ "تکبیر" ۲۳ تا ۲۹ ر نومبر ۸۴ء)

سلطانہ مہر کے بارے میں حمایت علی شاعر نے لکھا ہے کہ ان کی شخصیت سر گوشہ بلور کی سی ہے۔ اگر یہی پیرائیہ بیان خود جناب شاعر کے بارے میں اختیار کیا جائے تو ان کی شخصیت کو ہفت گوشہ بلور کہا جا سکتا ہے۔ وہ شاعر ہیں' ڈرامانویس ہیں' یونیورسٹی کے استاد ہیں اور اب ان کے نقاد ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں رہا کہ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہفت ہزاری امراء ہوا کرتے تھے' اب وہ نہیں ہیں تو ہمیں خوش ہونا چاہئے کہ ان کا نعم البدل موجود ہے یعنی ایک ایسی شخصیت جسے ہفت گوشہ بلور سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

جناب شاعر کا کمال ہے کہ وہ ادب و فن کے جس گوشے کی طرف بھی جا نکلتے ہیں کامیابی ان کے قدم چومتی ہے وہ شعر و سخن کی طرف گئے تو مشاعروں ہی میں نہیں صفحہ قرطاس پر بھی' ان کی شاعری' ساحری کے درجے پر فائز نظر آئی۔ وہ بلاشبہ ہمارے بہترین شاعروں میں سے ہیں بشرطیکہ جناب محسن بھوپالی کو اس پر اعتراض نہ ہو۔ (محسن بھوپالی نے چونکہ بہت سے معاملات میں جناب شاعر پر اعتراضات کئے ہیں' اس لئے ان کا خیال رکھنا ضروری ہے)

ٹی وی میں جناب شاعر نے یوں تو کئی سلسلہ وار پروگراموں میں حصہ لیا اور کئی ڈراموں میں اہم کردار ادا کئے لیکن ان کے پروگرام "کسوٹی" کو لوگ اب تک یاد کرتے ہیں جن میں شاعر صاحب ایک خاص ادا سے اپنے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے تھے تو عبیداللہ بیگ اور افتخار عارف ہر سوال کا صحیح جواب دینے پر قادر ہو جاتے تھے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا تھا "کسوٹی" کے دونوں لڑکوں کی ساری ذہانت حمایت علی شاعر کی انگلیوں میں ہے' اب انہیں انگلیوں پر جناب شاعر نے تنقید کی فندقیں لگائی ہیں۔ استاد ذوق نے فرمایا ہے۔

آ گئیں تم کو لگانی انگلیوں پر فندقیں
نوک مژگاں پر مری اشک جگر گوں دیکھ کر

(پہلے مصرعے میں انگلیوں کے سرے پر مہندی لگانے کا ذکر ہے)

جناب شاعر کے تنقیدی مجموعے کا نام ہے "شخص و عکس" جس کے دیباچے میں انہوں نے اعلان کیا ہے کہ یہ مجموعہ "میری تنقیدی فکر اور میری تخلیقات کے رد عمل کی روشنی میں' میرا بھی آئینہ ہے اور ان مخصوص چہروں کا بھی جنہوں نے شاید آج تک آئینہ نہیں دیکھا"۔ شاعر صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسا آئینہ تیار کیا ہے جس میں خود ان کا اپنا عکس تو مطابق اصل ہے لیکن بعض چہروں کے عکس ایسے ہیں کہ انہیں دیکھ کر خوف آنے لگتا ہے۔ آئینہ گری ہو تو ایسی ہو۔

"شخص و عکس" کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے کا عنوان ہے "تجزیہ" اس میں ابراہیم جلیس' سلطانہ مہر' سرور بارہ بنکوی' قمر ہاشمی' سرشار صدیقی' کشور ناہید' جیلانی بانو' نگار صہبائی اور متعدد اہل قلم کے بارے میں تنقیدی مضامین ہیں' ان مضامین سے مصنف کی گہری تنقیدی بصیرت ظاہر ہوتی ہے۔ وہ جس موضوع پر لکھتے ہیں اس میں ڈوب کر لکھتے ہیں وہ عام نقادوں کی طرح اپنے ساتھ موضوع کو بھی ڈبو نہیں دیتے بلکہ بڑے خلوص اور فراخ دلی کے ساتھ موضوع کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں۔ فراخدلی کا یہ عالم ہے کہ وہ سستے مال کو بھی مہنگے داموں خریدنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ جناب شاعر نے جن اہل قلم پر تنقیدی مضامین لکھے ہیں' ان میں سے بعض ایسے ہیں جن پر جناب شاعر سے پہلے کسی نے نہیں لکھا' اور شاید ان کے بعد بھی کوئی لکھنے کی جرات نہ کر سکے۔

سلطانہ مہر کے بارے میں جو مضمون ہے' اس کا ایک جملہ ہم اس کالم کے شروع میں درج کر چکے ہیں۔ دوسرا جملہ اب درج کیا جاتا ہے۔ "یہ مضمون دو قسطوں میں لکھا اور پڑھا گیا ہے۔" اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سلطانہ مہر کی ایک کتاب کی تقریب رونمائی ۱۹۷۶ء میں ہوئی تھی' دوسری کتاب کی ۱۹۷۹ء میں' دونوں تقریبوں میں جناب شاعر نے الگ الگ مضمون پڑھے تھے' لیکن کتاب میں دونوں کو اس خوبصورتی سے یکجا کیا گیا ہے کہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ پہلی قسط کہاں ختم ہوئی ہے۔ اور دوسری کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ یہ مضمون خوبصورت علامتی انداز میں لکھا گیا ہے جس سے اردو میں علامتی افسانے کی طرح علامتی

تنقید بھی مروج ہو سکتی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔ "وہ زبان جو صدیوں کے جبر میں پتھرا کر رہ گئی ہے۔ جب "لب گویا" ہوئی تو "صد برگ" کا استعارہ بن کر "شہر ممنوع" کی سینکڑوں در پردہ حقیقتوں کو نمایاں کر گئی۔ اب وہ "کلیاں" "خوشبو" کو اپنے باطن میں چھپائے رکھنے پر آمادہ نہیں۔ زندگی کو "چوری چھپے" دیکھنے اور "ہائے اللہ" کہہ کر "توبہ توبہ" کر لینے کا عمل اپنے شعور میں تپ پر "آگ کا دریا" بن چکا ہے۔ گھر کے "آنگن" سے زندگی کی "تیسری منزل" تک دیکھنے کا حوصلہ اب عورت کو "دو پاٹن کے بیچ" پسنے والے احساس سے نکال کر اس مقام تک لے جا چکا ہے جہاں "آخر شب کے ہم مسافر" اس کے منتظر ہیں اور وہ دن کے اجالے میں "شہر ممنوع" کی "دھوپ گلیاں اور دروازے" دیکھنے کی آرزومند ہیں"۔ اس اقتباس میں واوین میں دیئے گئے الفاظ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب خواتین کی تصانیف کے نام ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے کا عنوان ہے "تبصرہ" اس میں فاضل مصنف نے اپنے ان تبصروں کا یکجا کر دیا ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں لکھے تھے۔ تبصرہ نگاری کو مولوی عبدالحق اور نیاز فتح پوری نے ایک باقاعدہ فن بنا دیا تھا۔ جناب شاعر نے بھی بڑی حد تک ان بزرگوں کی پیروی کی ہے۔ ان تبصروں میں تعارف بھی ہے اور تنقید بھی۔ ہر تبصرے کا آخری جملہ عموماً اس قسم کا ہے کہ "کتابت اور طباعت دیدہ زیب ہے اور قیمت معقول" حیرت ہے کہ آج سے ۲۰-۲۵ برس پہلے کتابوں کی قیمت معقول ہوتی تھیں اور اب قیمت تو کیا قامت بھی معقولیت ذرا کم ہی نظر آتی ہے۔ جناب شاعر کے بعض تبصرے ان کی ایجاد کردہ صنف سخن "ثلاثی" کی طرح چند سطری ہیں۔ انہوں نے اچھا کیا کہ ان تبصروں کو کتاب میں محفوظ کر دیا ورنہ سو پچاس برس بعد اہل تحقیق کو ان کی تلاش میں کافی زحمت اٹھانی پڑتی۔

تیسرا حصہ "تزکیہ" ہے جو ضخامت کے اعتبار سے باقی دونوں کتاب کا تقریباً نصف ہے اور دلچسپی کے اعتبار سے باقی دونوں حصوں پر بھاری ہے اور شاید ان لوگوں پر بھی خاصا بھاری ہوگا جن کا ذکر اس میں آیا ہے۔ مصنف نے اپنے تمام مضامین اس حصے میں جمع کر دیئے ہیں جو انہوں نے گزشتہ ۲۰-۲۵ برسوں میں اپنے دفاع میں لکھے تھے۔ ممکن ہے

بعض نوواردانِ ادب یہ پوچھیں کہ آخر حمایت علی شاعر جیسے شاعر نغزگو کو اپنے دفاع کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ لہٰذا مختصراً عرض ہے کہ گزشتہ ربع صدی میں متعدد اہل قلم نے جناب شاعر پر الٹے سیدھے الزام لگائے اور ان کے بعض امتیازیات کی نفی کی۔ مثلاً جب شاعر صاحب نے ایک صنف "ثلاثی" کے نام سے ایجاد کی تو محسن بھوپالی نے فوراً یہ اعلان کیا کہ وہ اور قمر جمیل تین مصرعوں والی نظمیں بہت پہلے لکھ چکے ہیں (قمر جمیل نے صرف اپنی حد تک اس بیان کی تصدیق کی) شاعر صاحب کی مشہور زمانہ نظم "بنگال سے کوریا تک" کے بارے میں یار لوگوں نے افواہ اڑائی کہ یہ ساحرلدھیانوی کی نظم "پرچھائیاں" سے ماخوذ ہے۔ فلمی گانا "کسی چمن میں رہو تم بہار بن کر رہو" زبان زد خاص وعام ہوا تو اسے اختر شیرانی کی ایک نظم کا چربہ بتایا گیا۔ شاعر صاحب نے "سمندر" کے عنوان سے نظم لکھی تو قمر جمیل نے کہا کہ یہ حامد عزیز مدنی کی اسی عنوان کی نظم سے ماخوذ ہے۔ اور ساتھ ہی یہ الزام لگایا کہ جناب شاعر نے ٹیگور کی شاعری پر بھی ہاتھ صاف کیا ہے۔ قمر جمیل ہی کا بیان ہے کہ ان کی نظم "نیل کا سیلاب" جناب شاعر نے اپنے مجموعے میں شامل کرلی ہے۔ ایک الزام یہ بھی ہے کہ فلم "اور بھی غم ہیں" کے نغمے میں جناب شاعر نے محسن بھوپالی کے دو مصرعے ہتھیا لئے ہیں۔ (یہ اگر درست ہے تو نہایت افسوس ناک ہے۔ دو مصرعے چوری ہوگئے تو باقی کیا رہا!) اور پھر شمیم احمد صاحب نے اپنی کتاب "برش قلم" میں ادبی ہی نہیں، اخلاقی الزامات بھی عائد کئے حالانکہ موجودہ زمانے میں ادب سے اخلاق کا اتنا بھی تعلق نہیں رہا جتنا آج کا احمد ہمیش سے صلاح الدین پرویز کا ہے۔ غرضیکہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پچھلے ۲۵ برسوں میں باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے جناب شاعر کے خلاف "انسدادی" مہم چلائی گئی ہو۔ جناب شاعر ہی کا حوصلہ ہے کہ وہ ان پریشان کن حالات میں بھی آسودہ خاطر رہے اور بڑی جرات کے ساتھ مخالفوں کے ایک ایک الزام کو مدلل انداز سے رد کرتے رہے۔ جناب شاعر کی جگہ اگر ہم ہوتے تو حوصلہ ہار جاتے اور اعلان کردیتے کہ ہمارے نام سے جو کچھ چھپا ہے وہ قمر جمیل اور محسن بھوپالی کا نتیجہ فکر ہے۔ یہاں تک کہ ان دونوں نے اپنے نام سے جو کچھ چھپوایا ہے وہ بھی انہیں کا لکھا ہوا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری دوسری بات کو فوراً تسلیم

کرلیا جاتا کیونکہ قمر جمیل اور محسن بھوپالی کے نام سے جو کلام شائع ہوا ہے' وہ ایسا نہیں ہے کہ کوئی دوسرا لکھنے کی جرات کرسکے۔

اردو ادب میں ادبی معرکہ آرائیوں کی روایت بہت پرانی ہے۔ ہمیشہ سے یہ ہوتا آیا ہے کہ دو ادیب لڑتے ہیں اور باقی تماشا دیکھتے ہیں۔ لیکن جناب شاعر کے ساتھ جو معاملہ ہوا وہ منفرد نوعیت کا ہے یعنی یہ ادھر اکیلے اور ادھر حریفوں کا جم غفیر۔ بہرحال جناب شاعر اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی داد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے چومکھی لڑی اور خوب لڑی۔ شمیم احمد کے ہاں تو قلم کی برش تھی لیکن حمایت علی شاعر کے ہاں کرپان کی برش ہے (یہاں ہم "تلوار" بھی کہہ سکتے ہیں لیکن آج کل تلوار کا رواج نہیں رہا۔ کرپان ہی استعمال ہوتی ہے۔) جناب شاعر کی یہ جرات بھی قابل داد ہے کہ انہوں نے لڑائی کے دوران ایسے لوگوں پر بھی وار کئے جن کا اس لڑائی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مثلاً انہوں نے فیض صاحب کے بہت سے شعروں کو مال مسروقہ قرار دیا ہے[1] اور حامد عزیز مدنی کے متعدد اشعار کو

---

[1] فیض صاحب کی ایک غزل میں ایک شعر اور ایک مصرعہ ان کا نہیں بلکہ محبوب علی خان آصف (نظام دکن) کا ہے۔ فیض صاحب نے یہ غزل "نذر داغ" کی اور ان اشعار کو داغ ہی کا خیال کیا۔ حمایت صاحب نے صرف نشاندہی کی---- انہوں نے کوئی ناشائستہ لفظ استعمال نہیں کیا۔ وہ شعر اور مصرعہ حسب ذیل ہیں۔

لاؤ تو قاتل نامہ ذرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے کہ محضر لگی ہوئی

اس طرح اس غزل میں ایک مصرعہ ہے---- تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی---- اس کے علاوہ "ہم خیال اور ہم الفاظ" اشعار کے مطالعے "سیر کے واسطے تھوڑی فضا اور سہی" میں اور شعراء کے ساتھ فیض صاحب کے سلسلے میں بھی حافظ اور ڈبلیو' بی ایٹس (W.B.Eeats) مصرعے اور لائنیں کسی "الزام" کے بغیر دی گئی ہیں۔ اس کتاب میں وہ مضمون بھی شامل ہے۔

۲۔ کیا مدنی صاحب کے کلام میں خامیاں نہیں ہیں؟ شمیم احمد اور قمر جمیل نے حمایت صاحب پر جو الزامات عائد کئے تھے اس کی روشنی میں مدنی صاحب کی شاعری کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ اگر انہوں نے کوئی غلط بات کہی ہو تو انہیں قصوروار سمجھیں۔ حمایت صاحب کا مضمون "ٹیگور عزیز حامد مدنی اور میں" شخص و عکس میں شامل ہے' (مرتب)

خارج از وزن بتایا ہے۔ گویا گھن کے ساتھ گیہوں کو بھی پیس کے رکھ دیا ہے۔

جی تو چاہتا ہے کہ "شخص و عکس" کے کچھ مزیدار اقتباس پیش کرکے بتایا جائے کہ جناب شاعر نے کہیں تاریخی شواہد سے، کہیں طنز و مزاح سے کام لے کر اور کہیں عدالتی کارروائی کی دھمکی دے کر حریفوں کو اپنی حرکتوں سے باز آنے کا مشورہ دیا ہے لیکن افسوس کہ ہمارے کالم میں اقتباسات کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ بہرحال جن حضرات کو ادبی معرکہ آرائیوں سے دلچسپی ہو انہیں اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔ خصوصاً جناب محسن بھوپالی کو، کیونکہ ان کا دعویٰ ہے کہ حمایت علی شاعر کے "ادبی سرقوں" کا سب سے پہلے سراغ انہوں نے ہی لگایا تھا، ہمیں یقین ہے کہ جناب محسن بھوپالی اس کتاب کو دیکھتے ہی کہیں گے۔ "اس کا تو نام ہی مال مسروقہ ہے۔ عنوان چشتی کی کتاب "شخص و عکس" کے نام سے کئی سال پہلے شائع ہو چکی ہے"۔

جناب شاعر اب ایک اور کتاب "چراغ بکف" کے نام سے مرتب فرما رہے ہیں انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے ادبی معرکوں سے متعلق تمام تحریروں کی فوٹو کاپیاں بنوا کر ملک کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ کرا دیں گے۔ ایک کاپی انڈیا آفس لائبریری کو بھی بھیجی جائے گی "تاکہ آئندہ سو پچاس برسوں میں اس مسئلے سے متعلق کسی شخص کو تحقیقی کام کی ضرورت پیش آئے تو سارا مواد یکجا مل جائے۔" ہماری دعا ہے کہ جناب شاعر سو برس تک زندہ رہیں اور خود ہی اس مواد پر تحقیق مزید کا فریضہ انجام دیں کیونکہ سو برس بعد اتنی گاڑھی تحقیق کی فرصت کسے ہوگی۔

"چراغ بکف" کی اشاعت ادب کی ایک مفید خدمت ہوگی۔ کیا ہی اچھا ہو اگر جناب شاعر اس کتاب میں اپنے معترضین اور مخالفین کی تصویریں بھی شامل کر دیں۔ تاکہ سو برس بعد اہل ادب کو یہ معلوم ہو کہ آخر وہ کون لوگ تھے جنہوں نے جناب شاعر کو تخلیقی کاموں سے ہٹا کر آئینہ سازی کی صنعت کے سپرد کر دیا۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم

(میر تقی میر)

حمایت علی شاعر صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۵ء سے ہوتا ہے۔ ابتداء میں افسانے اور مضامین لکھے' پھر نظمیں کہیں۔ (غزلیں پاکستان آکر لکھیں) ان کا پہلا افسانہ' عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد (دکن) کے مجلّہ "نورس" (آذر تا اسفندار ۱۳۵۵ف مطابق ستمبر تا دسمبر ۱۹۴۵ء) میں "فلسفہ اور حقیقت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا (حیدر آباد دکن میں ایران کی طرح ماہ وسال کے "فصلی" نام رائج تھے) ان دنوں حمایت صاحب "حمایت تراب" کے نام سے لکھتے تھے۔

ہندوستان میں حمایت علی شاعر صاحب کی تخلیقات بمبئی میں ہفتہ وار نظام (قدوس صہبائی) اور شاہد (عادل رشید)' بھوپال میں ماہنامہ جادہ (کوثر چاندپوری)' اور افکار (صہبا لکھنوی)' لاہور میں ادب لطیف (مرزا ادیب)' کلکتہ میں ہفتہ وار ضرب کلیم (پرویز شاہدی)' جالندھر میں نقوش (فکر تونسوی اور نریش کمار شاد) اور حیدر آباد دکن میں ماہنامہ سویرا (غوث محی الدین)' ایوان (احمد مکی اور مختار کرمانی)' سازنو (فکر حیدر آبادی)' آدمیت (حمایت علی شاعر اور عزیز قیسی)' اور روزناموں میں پیام (قاضی عبدالغفار اور سبط حسن)' عوام (اختر حسن)' پرواز اور ہمدرد (ممتاز اختر) وغیرہ میں چھپتی رہی ہیں۔ اس دور میں ان کی بعض تحریریں "زرودش" کے قلمی نام سے بھی شائع ہوئیں۔

۵۱ء میں حمایت صاحب پاکستان آگئے۔ یہاں بھی "ابن مریم" کے قلمی نام سے ان کی اکثر نظمیں افکار (کراچی) اور لیل ونہار (لاہور) میں ۵۵ء سے ۵۹ء تک مسلسل چھپتی رہیں۔ ہندوستان میں ان کا شعری مجموعہ "گھن گرج" کے نام سے مرتب ہوچکا تھا مگر ہجرت کے سبب ضائع ہوگیا۔ پاکستان میں پہلا مجموعہ کلام "آگ میں پھول" کے نام سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کی جو بھی کتابیں آئیں' اہل نظر کے سامنے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ حمایت صاحب اب اپنا ابتدائی کلام بھی "بادہ نیم رس" کے نام سے مرتب کر رہے ہیں۔ (مرتب)

(حمایت علی شاعر کی پہلی تحریر)

آذر تا اسفندار ۱۳۵۵ ف
ستمبر ۱۹۴۵ء
تا
دسمبر ۱۹۴۵ء

نورس

عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد دکن

MUSLIM ZIAEE
کتب خانہ مسلم ضیائی

فلسفہ اور حقیقت ......

از حمایت تراب متعلم عثمانیہ کالج اورنگ آباد

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر
اقبال

زندگی نے کروٹ بدلی۔ کلیاں پھول ہو گئیں، پھول مرجھا بھی گئے۔ جو معصوم آنکھیں کبھی چاند کو اپنے پاس بلانے کی ناکام کوشش کرتی تھیں۔ اب ایک دوسرے کی آنکھوں میں مستقبل کی رنگینیاں دیکھ رہی تھیں۔ مقبرہ رابعہ دورانی کا سا دلکش مقام۔ درخت دودھ سی چاندنی میں کھڑے نہا رہے تھے۔ بہار میں رنگی ہوئی کلیاں حوض کے شفاف پانی میں جھک جھک کر اپنے حسن خداداد کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ رات کا ایک پہر گزر چکا تھا منظر پر کامل سکوت طاری تھا۔

پرویز اور غزالہ حوض کے ایک کونے پر بیٹھے مستقبل کے تخیلات میں کھوئے ہوئے تھے۔ ایک مدت کے بعد آج دونوں کو یکجا ہونے کا موقع ملا تھا۔

پرویز نے خیر خموشی کو توڑا [illegible]

(۱۹۴۸ء)

شاہد ... بمبئی ... ۱۹۴۸ء

حمایت علی شاعر

(۱)

"بدلتے زاویے"

[illegible]

شاہد دکنی بمبئی — ۲ — ۱۱ جولائی ۱۹۴۸ء

حمایت علی شاعر

سویرا (۷-۸) — ۱۱۲۶

حمایت علی شاعر (۱۹۴۷ء)

مسافر

(۱۵ اگست ۴۷ء کے بعد)

خنک چھاؤں پا کر نہ رک اے مسافر

مسافر یہ چھاؤں نہیں تیری منزل — نہ دم لے ابھی اور بھی ہیں مراحل
تمدن، حکومت، معاش، عقائد — پس پردہ ہیں سیکڑوں [illegible]
مسافر ابھی دور ہے تیری منزل

بنا کر چمن سے گل خار پرور — نئی شاہراہوں کو پانا ہے تجھ کو
~~ابھی کیسے پینا ہے تجھ کو~~ گلستان کو جنت بنانا ہے تجھ کو
ابھی تو جہاں میں سویرا لانا ہے تجھ کو

مبادا یہیں رکھ سکے تجھ کو [illegible] — تیری راہ میں کے [illegible] کٹ
مبادا قدم ڈگمگا جائیں تیرے — کہیں تیری ہستی نہ ہو جائے چوپٹ
زمانہ بدل لے کوئی اور کروٹ

زمانے کے رخ کو بدلنا ہے تجھ کو — کہ اب وقت کے ساتھ چلنا ہے تجھ کو
کبھی ماہ بن کر، کبھی مہر بن کر — اندھیروں کا [illegible] نکلنا ہے تجھ کو
بہر حال ہر وقت چلنا ہے تجھ کو

تری راہ میں کرہ بھی نار بھی ہیں — ہیں پھول بھی [illegible] بھی
سنبھل اے [illegible] کہ ہر گل کے دامن میں کچھ خار بھی ہیں
ترے ساتھ دشمن بھی ہیں یار بھی ہیں

جو چاہت ان کا اٹھانا ہے تجھ کو — پہاڑوں کو ٹھوکر میں [illegible] تجھ کو
یہ اپنا عزم محکم یہ اپنا تبسم — ہر اک گام پر مسکرانا ہے تجھ کو
یہ اپنی شان منزل کو پانا ہے تجھ کو

قدم ہر منزل پہ پرچم اڑاتا چلا جا — ترانے بغاوت کے گاتا چلا جا
محل کے کلس اور ایوان ڈھاتا چلا جا — ہر اک نقش [illegible] مٹاتا چلا جا
زمانے کو نیچا دکھاتا چلا جا

"شہکار"

(جناب شاہد دکنی)

ازل کے مصور کے شہکار ہیں یہ

یہ مدقوق و مفلوج و معذور انساں
یہ مظلوم و محکوم و مجبور انساں
یہ پروردۂ ظلم جاگیر داری
گرفتار آفات، بیکس، بیچارے

یہ آلام اور مصائب کے ہیں پالے
گناہوں کی لذت، شب عیش کے پالے
خداؤں کے پرانے تماشوں کے مارے
پرستاروں پاسبانوں کے مارے
یتیمانِ اسلم، بہزاد زادے
[illegible] مگر شاہزادے
نہ ماں ان کی کوئی نہ باپ ان کا کوئی
یہ زر دوش ہیں یہ نہ باپ ان کا کوئی
مقدر کی ہر آن چھتے ہیں مالا
اندھیرے کو سمجھے ہوئے ہیں اجالا

نجس تن ہیں، بہکے ہیں، لاچار ہیں یہ
ازل کے مصور کے شہکار ہیں یہ

شاہد دکنی بمبئی — ۷ — یکم مئی ۱۹۴۹ء

نزدوش (حمایت علی شاعر) (۱۹۴۹ء)

تلنگانہ

(ایک جھلک)

یہ سرخ دھرتی جو آج تپ تپ کے سرخ انگارہ بن گئی ہے — اسی سے پھوٹے ہیں وہ شرارے جو خرمن زر جلا رہے ہیں
ہزار بادل گرج رہے ہیں، ہزار بجلی کڑک رہی ہے — ہزار طوفان اٹھ رہے ہیں، مگر یہ بڑھتے ہی جا رہے ہیں
نہ فکر امروز ہے انہیں اور نہ یاد ماضی ستا رہی ہے
نظر میں مستقبل درخشاں کی منزلیں جلوہ دکھا رہی ہے

ہندوستان میں حمایت علی شاعر کا قلمی نام "نزدوش" (مرتب)

ادبِ لطیف، لاہور ۲۲ اکتوبر سنہ ۵۱ء

زندگی اور پتھر

حمایت علی شاعر

{کچھ مہینے ہوئے ڈائرکٹر کشور ساہو اپنی فلم کالی گھٹا کے کچھ مناظر فلمانے کے لیے اجنتا اور ایلورا جانے والے تھے۔ پتھر کے ان شہروں کو راستہ اورنگ آباد سے جاتا ہے — اور اورنگ آباد زندگی کا شہر ہے۔ یہ نظم کشور ساہو سے اسی وقت کی ملاقات کا ایک تاثر ہے — شاعر}

اجنتا کا نظارہ کرنے والو ــــ اِدھر بھی اک نگاہِ طائرانہ
صنم خانے یہاں بھی کچھ ملیں گے ــــ ذرا ذوقِ تجسس آزمانا

○

یہ شاہوں اور راجاؤں کی بستی ــــ گناہوں کی کمیں گاہِ مقدس
محل زادوں کے حق میں خلد ساماں ــــ رعایا کے لیے تاریک محبس

○

ہزاروں سال سے اس سرزمیں پر ــــ مرے جمہور کے ہیں خواب ویراں
ہزاروں انقلابات آئے لیکن ــــ شہنشاہی کی جنت ہے بہاراں

○

یہی جنت، یہی تاریک محبس ــــ مرے گیتوں کا، نغموں کا وطن ہے
سحر [illegible] جن کو گہنایا گیا ہے ــــ یہ اُن خورشید پاروں کا وطن ہے

○

یہ گرد آلود کچے راستوں پر ــــ شکستہ جھونپڑے گرتے ہوئے گھر
کسی بڈھے کی آنکھوں کی طرح چپ ــــ کسی بیوہ کے دامن کی طرح تر

○

سرِ بازار چلتی پھرتی لاشیں ــــ جہالت، بھوک، بیکاری کے بیٹے
گزرتے ہیں رہِ شام و سحر سے ــــ دریدہ دامنِ ہستی سمیٹے

○

جوانی کی سحر گوں مسکراہٹ ــــ لبوں کی قبر میں سوتی ہوئی ہے
نظر شمس و قمر کی تابناکی ــــ خلاؤں میں کہیں کھوئی ہوئی ہے

○

یہ انساں، ہند کے آزاد انساں ــــ جھکے شانے، فسردہ رخ، نظر چپ
سنائیں کس کو آہوں کا فسانہ ــــ خدا چپ، ناخدا چپ، بحر و بر چپ

○

اجنتا کا نظارہ کرنے والو ــــ اجنتا کے بتوں میں کیا رکھا ہے
اجنتا پتھروں کی زندگانی ــــ یہ بستی زندگی کا [illegible] ہے

نوٹ: "زندگی اور پتھر" ۵۰ء میں اورنگ آباد دکن میں لکھی گئی تھی۔ "۵۱ء کا بہترین ادب" (مرتبہ - مرزا ادیب، ناشر مکتبہ اردو - لاہور) میں شامل ہے۔

روزنامہ پرواز حیدرآباد

حمایت علی شاعر

... جس کا زندگی نواز ترنم آج اکر کی آواز میں تبدیل ہو گیا ہے اُس کی حالیہ مصروفیت

کوئی شاعرانہ جنون نہیں بلکہ اس کا سبب وہ بھوک اور بے روزگاری ہے جو آج ہندوستان کی

گلی گلی اور کوچے کوچے میں براجمان ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے مشہور اخبار ایٹم کراس وائن

نئی زندگی اور متعدد علمی و ادبی انجمنوں کے تاثرات

ترتیب کار

ہمارا شاعر

اکتوبر ۱۹۵۰ء میں جب حمایت علی شاعر کو آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد (دکن) کی ملازمت سے ہٹا دیا گیا تو احتجاجاً انہوں نے "اخبار فروشی" شروع کر دی جس پر ہندوستان کے بے شمار ادبی، صحافتی اور ثقافتی حلقوں نے ہمہ گیر احتجاج کیا۔ روزنامہ "پرواز" کا یہ خصوصی شمارہ (مورخہ ۹ نومبر ۱۹۵۰ء) اسی دور کی یادگار ہے۔ (مرتب)

ابنِ مریم

منٹو

ایک سرکش دماغ تھا — نہ رہا

اے شہرِ بے مہر کراچی

خوش ہو، اے شہرِ زمین مرقت پناہ
تیرا اک بار دوش اتر ہی گیا
تیرے فیضِ کرم سے اک فن کار
آخر کار آج مر ہی گیا!

خوش ہو اب تیرے غازۂ رخ کی
کوئی اک تہ نہیں اتارے گا
تیرے بازار کا گرے گا نہ بھاؤ
ہر کوئی تجھ پہ جان وارے گا

خوش ہو اب تیرے غم گساروں کے
جیب و دامن کوئی کرے گا نہ چاک
تیرے پیاروں کی خلوتوں کے راز
اب نہیں آئیں گے تہِ افلاک

خوش ہو یہ موت تیری محفل میں
زندگی کا پیام لائی ہے
چند لمحوں کے واسطے ہی سہی
قہقہے کا مقام لائی ہے

آج جی بھر کے دورِ جام چلے
کاگ اڑتے رہیں سروں کی طرح
مرتا جائے گا یوں ہی ہر فن کار
تیری پچھلی روایتوں کی طرح

آزادی کا جشن مناؤ

ناچو، گاؤ، دھوم مچاؤ — آزادی کا جشن مناؤ

مت سوچو دس آٹھ برس میں
کیسا کچھ بیتی کنج قفس میں
بیرون کا شہد ہے ہیں ہم تم
اپنے گھر میں یا مجلس میں
دل کی بات زباں پر لاکر آزادی پر حرف نہ لاؤ
ناچو، گاؤ، دھوم مچاؤ — آزادی کا جشن مناؤ

ہم اس قوم کے لختِ جگر ہیں
جس کا ہمسر کوئی نہیں ہے
ساری دنیا اپنا وطن ہے
اپنا گھر در کوئی نہیں ہے
کوئی مانے نہ مانے تم تو اپنی عظمت کے گن گاؤ
ناچو، گاؤ، دھوم مچاؤ — آزادی کا جشن مناؤ

بچوں کی ہر بات نہ مانو
بچے ضدی ہو جاتے ہیں
روتے ہیں تو رو لینے دو
روتے روتے سو جاتے ہیں
ماماؤں کے گن گاکر بھوکے بچوں کو بہلاؤ
ناچو، گاؤ، دھوم مچاؤ — آزادی کا جشن مناؤ

کیوں بجبشیں کی باتیں چھوڑو
ان باتوں سے دل جلتا ہے
نیک اور بد کی دنیا ہے یہ
اس دنیا میں سب چلتا ہے
اوروں سے کیا لینا تم کو، تم کیوں اوروں کا غم کھاؤ
ناچو، گاؤ، دھوم مچاؤ — آزادی کا جشن مناؤ

یہ دنیا — دو روز کی دنیا
اس میں الجھ کر کیا کرو گے
راز کے اندر راز نہاں ہیں
سوچ سمجھ کر کیا کرو گے
اصل دنیا اور کہیں ہے اُس دنیا کی دُھن اپناؤ
ناچو، گاؤ، دھوم مچاؤ — آزادی کا جشن مناؤ

اونچ اور نیچ کی ساری باتیں
عقل کی چالیں، علم کی گھاتیں
سب کچھ ہے تقدیر کے بس میں
کس کے دن اور کس کی راتیں
جس کا بھید وہی جانے ہے تم کیوں اپنا دین گنواؤ
ناچو، گاؤ، دھوم مچاؤ — آزادی کا جشن مناؤ

غم جب حد سے سوا ہوتا ہے
سنتے ہیں کہ دوا ہوتا ہے
صبر کرو، غم کھاتے جاؤ
صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے
غریبی کے خواب سہا کر اپنی قبروں میں سو جاؤ
ناچو، گاؤ، دھوم مچاؤ — آزادی کا جشن مناؤ

ابنِ مریم

پاکستان میں حمایت علی شاعر کا قلمی نام — "ابن مریم" (مرتب)

رو میں ہے رخش عمر .....

خاندانی نام	:	میر حمایت علی
والد کا نام	:	سید تراب علی
ادبی نام	:	حمایت علی شاعر
پیدائش	:	(میٹرک سرٹیفکیٹ کے مطابق) ۱۴ر جولائی ۱۹۲۶ء
مقام	:	اورنگ آباد (دکن)
تعلیم	:	ایم۔اے (سندھ یونیورسٹی)
شریک حیات	:	معراج نسیم
اولاد	:	(چار بیٹے۔ چار بیٹیاں)

۱۔ جاوداں — ام۔اے (اسلامیات) عربی (لینگویج سرٹیفکیٹ کورس)
سندھی (لینگویج سرٹیفکیٹ کورس) کراچی یونیورسٹی
ریسرچ فیلو (پی۔ایچ۔ڈی) سندھ یونیورسٹی
تحقیقی مقالہ "تحریک خلافت۔پاکستانی علاقوں میں" (زیر تحریر)

۲۔ روشن خیال — ام۔اے (ادبیات) ام۔اے (صحافت)
تحقیقی مقالہ "پروفیسر عزیز احمد۔۔ فن و شخصیت" (زیر تحریر)
برائے (پی۔ایچ۔ڈی) کراچی یونیورسٹی

۳۔ فروزاں — ام۔اے (سیاسیات) بی۔ایڈ' ایل۔ایل۔بی
تحقیقی مقالہ "تحریک آزادی میں خواتین کا حصہ" (زیر تحریر)
برائے (پی۔ایچ۔ڈی) کراچی یونیورسٹی

۴۔ غزالاں — ام۔اے (تعلیم) ام۔ایڈ (کراچی یونیورسٹی)

۵۔ اوج کمال — ڈپلوما (میکینکل)

ام۔اے (صحافت) ام۔اے (بین الاقوامی تعلقات) فرسٹ کلاس فرسٹ
(طالب علم) = ام۔فل

(ایریا اسٹڈی سینٹر فار یورپ) کراچی یونیورسٹی
(طالب علم) فرانسیسی (لینگویج سرٹیفکیٹ کورس)

کتابیں ۱- پاکستان میں ٹیلیویژن صحافت (ترجمہ)
۲- فن تحقیق

۶- ذوالجمال ایم ایس سی (ریاضیات) کراچی یونیورسٹی
فلائٹ آپریشن آفیسر (لائسنس یافتہ) سول ایوی ایشن

۷- ڈاکٹر بلند اقبال ایم-بی-بی-ایس (ڈاؤ میڈیکل کالج-کراچی) ایم-ڈی (امریکہ)

۸- زرافشاں ایم-بی-بی-ایس (سال سوم) سندھ میڈیکل کالج-کراچی

اعزازات : ۱- صدارتی ایوارڈ- آگ میں پھول ۱۹۵۹ء
۲- نگار ایوارڈ (بہترین نغمہ نگار) فلم "آنچل" ۱۹۶۲ء
۳- نگار ایوارڈ (بہترین نغمہ نگار) فلم "دامن" ۱۹۶۳ء
۴- آدم جی ادبی ایوارڈ (رائٹرز گلڈ) "مٹی کا قرض" ۱۹۷۴ء
۵- عثمانیہ گولڈ میڈل (بہادر یار جنگ اکیڈمی) ۱۹۸۷ء
۶- نقوش ایوارڈ (لاہور) ۱۹۸۷ء
۷- نگار ایوارڈ (عقیدت کا سفر- ٹی وی پروگرام) ۱۹۸۸ء
۸- مخدوم محی الدین عالمی اردو ایوارڈ (دہلی) ۱۹۸۹ء
۹- علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ایوارڈ (اکادمی ادبیات)
"ہارون کی آواز" ۱۹۸۵ء
(ایوارڈ کا اعلان ۱۹۹۱ء میں کیا گیا)
۱۰- ہندی اردو ساہیہ ایوارڈ (لکھنؤ) ادبی خدمات کا اعتراف ۱۹۹۱ء

صحافت : روزنامہ جناح، منزل اور ہمدرد (حیدر آباد دکن) ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۰ء

ادارت : سازنو (حیدر آباد دکن) ۱۹۴۹ء
شعور (حیدر آباد سندھ) ۱۹۵۶ء تا ۱۹۵۷ء
صریر خامہ (سندھ یونیورسٹی) اقبال نمبر ۱۹۷۷ء- نعت نمبر ۱۹۷۸ء

ثقافت : (ارژنگ کے زیر اہتمام)
۱- نظم- بنگال سے کوریا تک (ٹیبلو کے انداز میں سندھ یونیورسٹی کے اسٹیج پر پیش کی گئی) ۱۹۵۹ء
۲- تمثیل- اندھیرے اجالے (مکالمے- حمایت علی شاعر)
۱۹۵۹ء میں اسٹیج کیا گیا

ریڈیو : دکن ریڈیو- آل انڈیا ریڈیو (حیدر آباد) ۴۷ء تا ۵۰ء
ریڈیو پاکستان (کراچی- حیدر آباد سندھ) ۵۱ء تا ۶۲ء

ٹیلی ویژن : لاہور۔ کراچی۔ اسلام آباد (مختلف سلسلہ وار پروگرام) ۶۷ء تا ۸۹ء

۱۔ غزل اس نے چھیڑی (اردو غزل کے سات سو سال)

۲۔ کسوٹی (ذہنی آزمائش کا پروگرام)

۳۔ خوشبو کا سفر (علاقائی زبانوں کے شعراء کا اردو کلام۔ پانچ سو سال)

۴۔ عقیدت کا سفر (اردو نعتیہ شاعری کے سات سو سال)

۵۔ لب آزاد (احتجاجی شاعری کے چالیس سال)

فلم : (بے شمار فلموں کے نغمات، مکالمے اور منظرنامے لکھے)

۱۔ بحیثیت نغمہ نگار پہلی فلم۔ آنچل ۱۹۶۲ء

۲۔ بحیثیت منظرنامہ و مکالمہ نگار پہلی فلم۔ تصویر ۱۹۶۵ء

۳۔ بحیثیت فلمساز پہلی فلم۔ لوری ۱۹۶۶ء

۴۔ بحیثیت فلمساز و ہدایت کار پہلی فلم۔ گڑیا ۱۹۷۴ء

تدریس : ۱۔ سچل کالج (حیدر آباد سندھ) ۶۴ء

۲۔ سندھ یونیورسٹی اکتوبر ۱۹۷۷ء تا جولائی ۱۹۸۶ء

۳۔ بیجنگ یونیورسٹی (عوامی جمہوریہ چین) میں مرکزی وزارت تعلیم پاکستان کی طرف سے تقرر۔۔ مگر طبیعت کی ناسازی کے سبب معذرت چاہ لی۔

سیاحت : امریکہ۔ کینیڈا (تقریباً تمام ریاستیں)

یورپ (انگلینڈ۔ ناروے۔ سویڈن وغیرہ)۔ افریقہ (جنوبی افریقہ اور بوٹسوانا وغیرہ)، چین، عرب ممالک (سعودی عرب۔ کویت۔ مسقط۔ دوحہ قطر۔ بحرین اور عرب امارات)، ہندوستان بنگلہ دیش اور موریشس وغیرہ

(تصنیفات)

شاعری : ۱۔ آگ میں پھول (نظمیں، غزلیں، رباعیات) ۱۹۵۶ء

۲۔ مٹی کا قرض (ثلاثیاں۔ نظمیں۔ غزلیں) ۱۹۷۴ء

۳۔ تشنگی کا سفر (طویل افسانوی و تمثیلی نظمیں) ۱۹۸۱ء

۴۔ ہارون کی آواز (نظمیں۔ غزلیں۔ ہائیکو) ۱۹۸۵ء

۵۔ حرف حرف روشنی (انتخاب) ۱۹۸۶ء

نثر : ۱۔ شیخ ایاز (جدید سندھی ادب کا عہد آفریں شاعر) ۱۹۷۹ء

۲۔ شخص و عکس (تنقیدی مقالات و مباحث) ۱۹۸۴ء

(ان کتابوں کے ہندوستانی ایڈیشن بھی شائع ہو چکے ہیں)

(تراجم)

بنگال سے کوریا تک

(عالمی امن کے موضوع پر لکھی ہوئی طویل افسانوی نظم کے مختلف لسانی روپ)

۱- FLOWER IN FLAMES (ترجمہ) پروفیسر راجندر سنگھ ورما
پنجابی یونیورسٹی' پٹیالہ- (انڈیا)

۲- FLUTE AND BUGLE (ترجمہ) پرکاش چندر
ایڈیٹر ٹائمز آف انڈیا' لکھنؤ- (انڈیا)

۳- گل باہ مہ (سندھی ترجمہ) ام-ای- عالمانی' حیدر آباد- سندھ

۴- بنگال سے کوریا تک (ہندی) پروفیسر جی- این- نداف
ابوالکلام آزاد کالج- اورنگ آباد- (انڈیا)

۵- (تلگو) ڈاکٹر دسرتی- حیدر آباد دکن (آندھرا پردیش)

(اس نظم کے مراٹھی اور بنگالی تراجم بھی زیر طبع ہیں)

EVERY WORD AGLOW

"حرف حرف روشنی" کا انگریزی ترجمہ پروفیسر راجندر سنگھ ورما
شبد شبد پرکاش (ہندی) قاضی رئیس (حرف حرف روشنی)

مطالعے : حمایت علی شاعر نمبر "اورنگ آباد ٹائمز" ۸۵ء
(اورنگ آباد' مہاراشٹر- انڈیا)

(زیر طبع کتب)

۱- ثلاثی (ایک نئی صنف سخن)
۲- اپنے پرچم تلے (قومی نغمے)
۳- فاصلے (ریڈیائی ڈرامے)
۴- مہران موج (سندھ کی لوک کہانیوں کا تمثیلی روپ)
۵- کچھ پیشرو' کچھ ہم سفر (تنقیدی مضامین)
۶- چاند کی دھوپ (تازہ کلام)
۷- پس دیوار حرف (کلیات)
۸- لب آزاد (پاکستان میں احتجاجی شاعری کا انتخاب)
۹- راغب مراد آبادی (فن و شخصیت پر مختلف اہل قلم کے مضامین کا انتخاب)

کتابیات

نکات سخن۔ حسرت موہانی
پتھر کی دیوار۔ علی سردار جعفری۔ مکتبہ "شاہراہ"۔ دہلی۔ اگست ۵۳ء
پرچھائیاں۔ ساحر لدھیانوی۔ لاہور اکیڈمی۔ لاہور (طبع اول) مئی ۵۸ء
قابل کے سو شعر۔ قابل اجمیری۔ ادارہ ادبیات۔ حیدر آباد۔ ۵۸ء
دیدہ بیدار۔ قابل اجمیری۔ ادارہ یادگار قابل۔ حیدر آباد۔ ۶۳ء
خون رگ جاں۔ قابل اجمیری۔ ادارہ یادگار قابل۔ حیدر آباد۔ ۶۶ء
دیدہ بیدار۔ قابل اجمیری۔ ثانی کمیونی کیشنز حیدر آباد۔ ۸۶ء
کلیات قابل۔ قابل اجمیری۔ یونی کیرنیز۔ عرب امارات۔ دوبئی۔ ۹۲ء
آگ میں پھول۔ حمایت علی شاعر۔ حلقہ ارباب شعور۔ کراچی۔ ۵۶ء
مٹی کا قرض۔ حمایت علی شاعر۔ پاک کتاب گھر۔ کراچی۔ ۷۴ء
شیخ ایاز۔ حمایت علی شاعر۔ (تنقیدی مطالعہ) المصنفین۔ کراچی ۷۹ء
تشنگی کا سفر۔ حمایت علی شاعر۔ (طویل تمثیلی اور افسانوی نظمیں) پاک کتاب گھر۔ کراچی۔ ۸۰ء
آگ میں پھول۔ حمایت علی شاعر۔ (اضافوں کے ساتھ) پاک کتاب گھر۔ کراچی۔ ۸۱ء
شخص و عکس۔ حمایت علی شاعر۔ (مقالات و مباحث) المصنفین کراچی۔ ۸۴ء
ہارون کی آواز۔ حمایت علی شاعر۔ المصنفین کراچی۔ ۸۵ء
حرف حرف روشنی۔ حمایت علی شاعر۔ مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔ ۸۶ء
(امن عالم پر طویل افسانوی نظم "بنگال سے کوریا تک" کے مختلف لسانی روپ)
Flower in Flames۔ ترجمہ۔ پروفیسر راجندر سنگھ ورما پٹیالہ (انڈیا) ۸۵ء
Flute and Bugle۔ ترجمہ۔ پرکاش چندر۔ (ایڈیٹر۔ ٹائمز آف انڈیا۔ لکھنؤ) انڈیا ۹۴ء
"بنگال سے کوریا تک" (ہندی رسم الخط میں) پروفیسر جی این نداف (ابوالکلام آزاد کالج۔ اورنگ آباد) مہاراشٹر۔ انڈیا
"گل باہ مہ" (سندھی ترجمہ) ام۔ ای۔ عالمانی (حیدر آباد سندھ) "بنگال سے کوریا تک"
Every Word Aglow۔ ترجمہ (حرف حرف روشنی) پروفیسر راجندر سنگھ ورما۔ انڈیا ۹۳ء
شبد شبد پرکاش (ہندی رسم الخط میں) قاضی رئیس۔ (انڈیا) ۹۲ء (حرف حرف روشنی)
حیدر آباد کے شاعر (مرتب)۔ سلیمان اریب۔ ساہتیہ اکیڈمی۔ آندھرا پردیش۔ حیدر آباد۔ ۶۲ء

دود چراغ محفل (انتخاب یادگار مشاعرہ) حمایت علی شاعر، مرزا عابد عباس مکتبہ شعور حیدر آباد۵۹ء
بوئے گل نالہ دل۔ (انتخاب یادگار مشاعرہ) مرزا عابد عباس مکتبہ شعور حیدر آباد۔ ۶۰ء
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے۔ (انتخاب یادگار مشاعرہ) مرزا عابد عباس مکتبہ شعور حیدر آباد۔ ۶۱ء
پاکستانی ادب (چھٹی جلد۔ ڈرامہ) حصہ اول (مرتب) رشید امجد۔ سرسید کالج راولپنڈی۔ ۸۸ء
پتھر کی لکیر۔ سرشار صدیقی۔ ہمارا ادارہ۔ کراچی۔ ۶۲ء
چہرہ۔ انجم اعظمی۔ شوکت علی اینڈ سنز۔ کراچی
حلقہ مری زنجیر کا۔ شیخ ایاز۔ (ترجمہ) فہمیدہ ریاض۔ سندھیالوجی۔ سندھ یونیورسٹی۔ ۷۹ء
۲+۲=۵۔ (مقالات) شمیم احمد۔ قلات پبلیشرز۔ کوئٹہ۔ ۷۷ء
برش قلم۔ (مقالات) شمیم احمد۔ قلات پبلیشرز۔ کوئٹہ ۸۳ء
شکست شب۔ محسن بھوپالی۔ فن کدہ۔ حیدر آباد۔ ۶۱ء
جستہ جستہ۔ محسن بھوپالی۔ مطبوعات زاویے۔ حیدر آباد۔ ۶۹ء
شکست شب۔ محسن بھوپالی۔ (اضافوں کے ساتھ) ایوان ادب۔ کراچی۔ ۸۹ء
مجموعہ سخن۔ محسن بھوپالی۔ (کلیات) شائستہ پبلی کیشنز۔ کراچی۔ ۹۲ء
درد کا رشتہ۔ انوار احمد زئی۔ مکتبہ تخلیق۔ لطیف آباد۔ حیدر آباد ۶۸ء
شہر صنم۔ احمد ضیاء۔ اسٹوڈنٹس لیگ۔ حیدر آباد۔ ۶۸ء
قافیہ پیمائی۔ ساجد امجد۔ ثبات اکادمی۔ کراچی۔ ۸۶ء
The Seperation of East Pakistan حسن ظہیر۔ ۹۳ء
Lust for Life (وان گاگ پر سوانحی ناول) اروِن اسٹون۔
پیاس (تلخیص و ترجمہ) ایس اے شہزاد۔ (۲۰ عظیم ناول) مکتبہ ادب جدید۔ لاہور۔ دسمبر ۶۱ء
ایک محقق، تین ادیب (مرتب) صابر بن ذوقی۔ حیدر آباد ۹۲ء
مجاز (سوانحی ناول) ڈاکٹر محمد حسن (زیر تحریر) انڈیا
شیطانی آیات۔ سلمان رشدی

(رسائل کے خاص ایڈیشن)

گہوارہ (قابل نمبر) گہوارہ ادب۔ لطیف آباد۔ حیدر آباد۔ ۶۷ء
طالب علم ڈائجسٹ (قابل نمبر) ایڈیٹر۔ محمد حسین قریشی۔ حیدر آباد فروری ۷۰ء
فکر و عمل (ہفتہ وار) ایڈیٹر۔ انجم اجمیری۔ نائب مدیر۔ سید کاظم رضا۔ حیدر آباد۔ ۳۰ ستمبر ۷۷ء
الشجاع (عبدالحق نمبر) ایڈیٹر۔ سلمان الارشد۔ کراچی۔ اگست ۵۹ء

اوراق۔ ایڈیٹر۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ لاہور۔ اپریل، مئی ۷۵ء
الفاظ۔(۸) ایڈیٹر۔ نسیم درانی۔ کراچی۔ ۸۳ء
کتاب نما۔ ایڈیٹر۔ شاہد علی خاں۔ مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔ (انڈیا) جنوری۔ ۹۱ء
تخلیق۔ ایڈیٹر۔ اظہر جاوید۔ لاہور۔ دسمبر ۹۲ء
سرگزشت ڈائجسٹ۔ ایڈیٹر۔ معراج رسول۔ کراچی۔ اکتوبر ۹۲ء
اقدار۔ (جلد نمبر ۲۔ شمارہ ۲۳۔ ۲۴) ایڈیٹر شبنم رومانی۔ کراچی۔ ۹۲ء
اقدار (جلد نمبر ۳ شمارہ ۳۔ ۴) ایڈیٹر شبنم رومانی۔ کراچی۔ ۹۲ء

(سووینیرز)

سووینیر۔ (ارژنگ) نایاب حسین۔ حیدر آباد۔ ۶۰ء
سووینیر۔ (مٹی کا قرض حمایت علی شاعر) کراچی۔ ۷۴ء
سووینیر۔ (غطمانے۔ محسن بھوپالی) کراچی۔ ۲۴ نومبر ۷۵ء
سووینیر۔ (ماجرا۔ محسن بھوپالی) کراچی۔ ۷۔ ۱۲ اکتوبر ۸۱ء
سووینیر۔ (تین کتابیں۔ حمایت علی شاعر) کراچی۔ ۸۵ء
سووینیر۔ (شکست شب۔ محسن بھوپالی) کراچی۔ ۲۰ مارچ ۹۰ء
سووینیر۔ (مجموعہ سخن۔ محسن بھوپالی) کراچی۔ ۱۰ مئی ۹۲ء

(ہفتہ وار رسائل)

شاہد۔ ایڈیٹر۔ عادل رشید۔ بمبئی۔ (عید نمبر) ۴۸ء
شاہد ایڈیٹر۔ عادل رشید۔ بمبئی۔ ۱۱ جولائی ۴۸ء
شاہد ایڈیٹر۔ عادل رشید۔ بمبئی۔ یکم مئی ۴۹ء
بیباک (بحوالہ محسن بھوپالی) ٹنڈو محمد خاں۔ یکم، جون ۵۲ء
نمکدان (بحوالہ محسن بھوپالی) کراچی۔ ۲۰ اگست ۵۵ء
لیل و نہار۔ ایڈیٹر۔ سبط حسن۔ لاہور۔ ۵ جولائی ۵۹ء
نگار۔ ایڈیٹر۔ الیاس رشیدی۔ کراچی۔ (حسب ذیل شمارے)
۱۱ اگست ۶۳ء ۲۵ اگست۔ ۶۳ء یکم ستمبر ۶۳ء ۸ ستمبر ۶۳ء ۱۵ ستمبر ۶۳ء
۲۲ ستمبر ۶۳ء ۲۹ ستمبر ۶۳ء ۶ اکتوبر ۶۳ء ۱۳ اکتوبر ۶۳ء
کردار۔ ایڈیٹر۔ خواجہ بقا اللہ۔ کراچی۔ (حسب ذیل شمارے)
۲۴ اگست ۶۳ء ۷ ستمبر ۶۳ء ۲۱ ستمبر ۶۳ء

چٹان۔ (بحوالہ محسن بھوپالی) لاہور۔ ۶ دسمبر ۸۲ء
تکبیر۔ ایڈیٹر۔ صلاح الدین۔ کراچی۔ ۲۵ مئی ۸۴ء
تکبیر۔ ایڈیٹر۔ صلاح الدین۔ کراچی۔ ۲۳ نومبر ۸۴ء
قومی اخبار (ہفتہ وار میگزین) ایڈیٹر۔ الیاس شاکر۔ کراچی۔ (حسب ذیل شمارے)
۵ مارچ ۹۳ء ۱۲ مارچ ۹۳ء ۱۹ مارچ ۹۳ء ۱۶ مارچ ۹۳ء
۲ اپریل ۹۳ء ۹ اپریل ۹۳ء ۳۰ اپریل ۹۳ء ۴ جون ۹۳ء
۱۱ جون ۹۳ء ۱۸ جون ۹۳ء ۲۵ جون ۹۳ء ۲ جولائی ۹۳ء ۹ جولائی ۹۳ء
۱۶ جولائی ۹۳ء ۲۳ جولائی ۹۳ء ۲۰ اگست ۹۳ء

(پندرہ روزہ رسالے)

رہنما۔ (تنقیدی نشست کی رپورٹ) حیدر آباد۔ ۱۰ اگست ۶۲ء
رہنما۔ (ضمیمہ) بحوالہ محسن بھوپالی۔ حیدر آباد۔ ۱۷ اگست ۶۲ء

(روزنامے)

جنگ۔ راولپنڈی۔ ۱۵ دسمبر ۷۲ء مساوات۔ لاہور۔ ۱۲ جولائی ۷۵ء
مشرق۔ کراچی۔ ۱۸ دسمبر ۷۵ء مشرق۔ کراچی۔ ۳۰ جولائی ۷۸ء

(روزنامہ) کلیم (سکھر) (حسب ذیل شمارے)

۹ مارچ ۷۵ء ۲۰ مئی ۸۳ء ۲۶ اگست ۸۳ء ۲ ستمبر ۸۳ء ۱۶ ستمبر ۸۳ء
۲۳ ستمبر ۸۳ء ۱۴ اکتوبر ۸۳ء ۱۱ نومبر ۸۳ء ۳۰ مارچ ۸۴ء ۱۳ اپریل ۸۴ء

(روزنامہ) نوائے وقت (کراچی) (حسب ذیل شمارے)

۲۷ مارچ ۸۳ء۔ (بحوالہ محسن بھوپالی) ۲۲ اپریل ۸۳ء ۲۴ جون ۸۳ء
۲۷ دسمبر ۸۵ء ۱۹ نومبر ۹۲ء

(روزنامہ) حریت (کراچی) (حسب ذیل شمارے)

۱۹ دسمبر ۶۲ء (بحوالہ محسن بھوپالی) ۱۳ مئی ۸۳ء ۳ جون ۸۳ء
۱۹ اگست ۸۳ء ۲۳ ستمبر ۸۳ء۔

(روزنامہ) پاسبان (حیدر آباد)

پاسبان۔ ایڈیٹر۔ سید اختر علی شاہ۔ ۵ نومبر ۸۵ء
پاسبان۔ ایڈیٹر۔ سید اختر علی شاہ ۱۲ نومبر ۸۵ء

عاصم انصاری، دلگیر اجمیری، گوہر امروہی، آغا سلیم، علی بابا، سلیم ستو، صغیر اصغر جارچوی، سعید الدین سعید، م نسیم کہرل، ظفر حسین ظفر ریحانہ طلعت خاں، کامل عارفی، عشرت یوسفی رسول بخش پلیجو، شجاع نارنولی، شاد دہلوی، عبدالشکور اکبر آبادی، سالک صدیقی اجمیری، خستہ وارثی اکبر آبادی، استاد بخاری، رشید جمال، مرزا عاصی اختر، مبارک الدین صہبا سنگھانوی، سعید احمد سعیدی، کیف مندر گڑھی، خان محمد پنہور، جمال گوالیاری، اعجاز احسانی، سلیم بالائی، داؤد چغتائی، معینہ نصرت، طاہر اکبر آبادی، تنویر مشتاق، مسرت مرزا، مرحب قاسمی، طلعت صابر علی، راز عارفی، ڈاکٹر زیدی، خلیل الرحمٰن خاں مہر، سرور صدیقی، حبیب حیات، علی نواز جتوئی، وفا نارنولی، واجد سعیدی، سردار علی شاہ ذاکر، دانش نیازی، شعیب شیخ، معراج صدیقی، روبیہ قریشی، تبسم دہلوی، عادل رضوی، ناظم رامپوری، ریحان بنارسی، اسلم اشعر، جمال ابرو، ثریا سوز ڈیپلائی، تقی رہبر، منظر بھوپالی، حمید انجم، شگفتہ اجمیری، خیر النساء جعفری، شفیق صدیقی کانپوری، صابر نارنولی، شبنم بدایونی، صبیح اشرف سیمابی، پروانہ بھٹی، منصور ویراگی، کامل صدیقی بریلوی، عباسی اجمیری، محبوب اجمیری، یوسف شاہین، نور الہدیٰ شاہ، احسن اجمیری، ظفر علی پیکر، سید حشمت حسین حشمت، مقبول الوری، طالب اجمیری، شباب لکھنوی، تاج بلوچ، مہتاب راشدی، یکتا جودھپوری، واحدی اجمیری، نیاز نصیر آبادی، سید معین الحق معین، خاک کلیمی اجمیری، نور ساگری، ممتاز مہر، رشیدہ حجاب، ع-ق-شیخ، وفا قریشی، عظمت نارنولی، عنبر جعفری، عرش عثمانی، نجم لکھنوی، عاقل منظری، نظام فتح پوری، نثار بیانوی، قمر واحد، ثمیرہ زریں، ظہیر اجمیری، نگار عرفانی، پروفیسر ضیاء الدین احمد، سرور نظامی، تابش نارنولی، ظفر حسین ظفر، حسرت بیانوی، اسماعیل انجم، بقا رامپوری، علی محمد خاں علی، عزیز جے پوری، مقبول پاکستانی، سرویچ سجاولی، قمر شہباز، صادق حسین صادق، مراد الہ آبادی، اجمل اعجاز، خواب حیدر آبادی، باصر القادری، اقبر سندھی، شوق بیاروی، خالد یوسف، خاور صدیقی، فزوں اکبر آبادی، احقر سلیمانی اجمیری، اختر الحامدی اجمیری، فقیر محمد لاشاری، نبی بخش کھوسو، حبیب حشری جے پوری، حکیم شاہ اکرام حسین، اخضر نعیمی مراد آبادی، شوقی نارنولی، ظہیر قریشی، حامد نارنولی، حکیم مرزا عزیز الرحمٰن، اصغر حامدی، خالد اطہر، سحر امداد، مرزا حنیف بیگ خادم، ڈاکٹر شرف الدین، عبدالجمیل، محمد حنیف، آذر نایاب، فہمیدہ ریاض، آفاق صدیقی، نظر اکبر آبادی، عابد علی عابد، نیر جے پوری، عزیز احمد عزیز، نازی اجمیری، عبدالحلیم جوش، عنایت بلوچ، جاوداں میر، مرزا سلیم بیگ

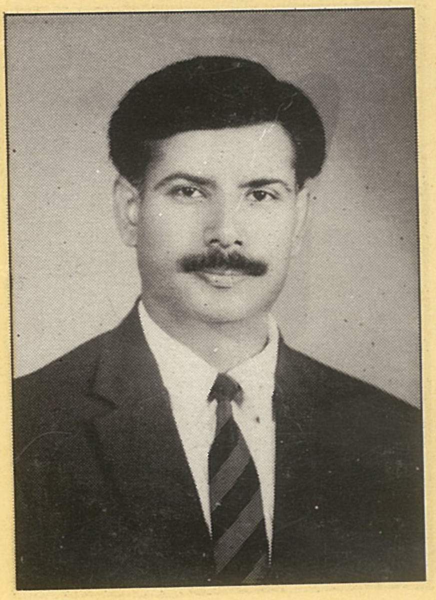

نام	مرزا سلیم بیگ
والد کا نام	مرزا صغیر بیگ
تاریخ پیدائش	۱۶ر جنوری ۱۹۵۹ء
مقام	حیدر آباد (سندھ)
تعلیم	ام-اے (معاشیات)
	ام-اے (اردو ادب)
تحقیق	"اردو زبان و ادب کی تاریخیں"
	(مقالہ برائے پی-ایچ-ڈی) زیر تحریر
ملازمت	لیکچرار-شعبہ اردو
	سندھ یونیورسٹی
کتابیں	(۱) سلیم احمد-ایک مطالعہ
	(مقالہ برائے ام-اے)
	(۲) چراغ بکف (مباحث)
	(۳) ہم خیال
ادبی مشاغل	(مدیر اعزازی) نئی قدریں